ماہنامہ
حنا
فروری 2014
سالگرہ نمبر-2
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
www.paksociety.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

☆☆☆

مستقل سلسلے

سردار طاہر محمود نے نواز پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر دفتر ماہنامہ حنا 205 سرکلر روڈ لاہور سے شائع کیا۔
خط وکتابت و ترسیل زر کا پتہ، **ماھنامه حنا** پہلی منزل محمد علی امین میڈیسن مارکیٹ 207 سرکلر روڈ اردو بازار لاہور فون: 042-37321690, 042-37310797 ای میل ایڈریس،
monthlyhina@hotmail.com, monthlyhina@yahoo.com

کچھ باتیں ہماری

قارئین کرام! فروری 2014ء کا شمارہ ''بطور سالگرہ نمبر 2'' پیش خدمت ہے۔

جنوری کا شمارہ ''سالگرہ نمبر'' تھا جس کو قارئین نے بہت پسند کیا اور اپنے خطوط اور میلو کے ذریعے ہماری حوصلہ افزائی کی، جس کے لئے ہم آپ سب کے شکر گزار ہیں، سالگرہ نمبر میں کچھ مصنفین کی تصنیفات جگہ کی کمی کی وجہ سے شائع ہونے سے رہ گئی تھیں، جن کو اس شمارے میں شائع کیا جا رہا ہے، اس لئے اس شمارے کو ''بطور سالگرہ نمبر 2'' پیش کیا جا رہا ہے، امید ہے آپ ہماری اس کاوش کو بھی شرف قبولیت بخشیں گے۔

سال نو کے تحفے کے طور پر گزشتہ دنوں وزیر اعلیٰ پنجاب نے روزگار بینک کے قیام کا اعلان کیا ہے، جس کا مقصد بے روزگار نوجوانوں کو کاروبار کے لئے قرضے مہیا کرنا ہے، جبکہ وفاق کی سطح پر وزیر اعظم کی روزگار سکیم کا اجرا بھی اسی مقصد کے لئے ہوا ہے، اگر ان قرضوں کا اجرا دیانت داروں اور شفاف طریقے سے ہوا تو یہ دونوں پروگرام بے روزگاری اور ملک سے غربت کے خاتمے کے لئے بہت مفید ثابت ہونگے، ملک میں لاکھوں تعلیم یافتہ نوجوان ہیں جو نوکری کی تلاش میں دربدر پھر رہے ہیں، اگر انہیں بہتر روزگار کے لئے قرضے فراہم کیے جائیں تو وہ نہ صرف اپنے خاندان کی کفالت کریں بلکہ ملک کی ترقی میں بھی اپنا کردار احسن طریقے سے ادا کرنے کے قابل ہونگے، اس سے جہاں ملک کی معیشت ترقی کرے گی وہاں بدامنی اور دہشت گردی کا بھی خاتمہ ہوگا۔

نیا سلسلہ:۔ اس ماہ سے ہم منی کہانیوں کا ایک نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں جسے ہر ماہ سیدہ شگفتہ شاہ تحریر کیا کریں گی، شگفتہ شاہ نے بڑی خوبصورتی سے بڑے بڑے مسائل کو چھوٹے چھوٹے پیرائے میں لکھا ہے، یقیناً یہ سلسلہ آپ سب کو پسند آئے گا۔

اس شمارے میں:۔ اک دن حنا کے نام میں حمیرا خان اپنے شب و روز کے ساتھ، صدف اعجاز اور مصباح نوشین کے مکمل ناول، سندس جبیں اور خالدہ نثار کے ناولٹ، سائرہ غفار، کنول ریاض، ثمینہ بٹ، فرح طاہر قریشی، یسّی کرن اور سباس گل کے افسانے، سدرۃ المنتہیٰ، ام مریم اور فوزیہ غزل کے سلسلے وار ناولوں کے علاوہ حنا کے سبھی مستقل سلسلے شامل ہیں۔

آپ کی آرا کا منتظر
سردار محمود

حمد باری تعالیٰ

نام بھی تیرا عقیدت سے لیا جاتا ہوں
ہر قدم پر تجھے سجدے بھی کیے جاتا ہوں

کوئی دنیا میں مرا مونس و غمخوار نہیں
تیری رحمت کے سہارے پہ جیے جاتا ہوں

تیرے اوصاف میں اک وصف خطا پوشی ہے
اس بھروسے پہ خطائیں بھی کیے جاتا ہوں

آزمائش کا محل ہو کہ مسرت کا مقام
سجدہ شکر بہر حال کیے جاتا ہوں

زندگی نام ہے اللہ پہ مر مٹنے کا
یہ سبق سارے زمانے کو دیے جاتا ہوں

صبر کرنا ہے تری شان کریمی کو عزیز
میں یہی سوچ کر آنسو بھی پیے جاتا ہوں

ہر گھڑی اس کی رضا پیش نظر ہے اقبال
شکر ہے ایک سلیقے سے جیے جاتا ہوں

اقبال عظیم

نعت رسول مقبول ﷺ

کس کا جمال ناز ہے جلوہ نما یہ سو بہ سو
گوشہ بگوشہ در بدر قریہ بہ قریہ کو بہ کو

اشک فشاں ہے کس لئے دیدہ منتظر مرا
دجلہ بہ دجلہ یم بہ یم چشمہ بہ چشمہ جو بہ جو

مری نگاہ شوق میں حسن ازل ہے بے حجاب
غنچہ بہ غنچہ گل بہ گل لالہ بہ لالہ بو بہ بو

جلوہ عارض نبیؐ رشک جمال یوسفی
سینہ بہ سینہ سر بہ سر چہرا بہ چہرا ہو بہ ہو

زلف دراز مصطفیٰ گیسوئے لیل حق نما
طرہ بہ طرہ خم بہ خم حلقہ بہ حلقہ مو بہ مو

یہ میرا اضطراب شوق رشک جنون قیس ہے
جذبہ بہ جذبہ دل بہ دل شیوہ بہ شیوہ خو بہ خو

تیرا تصور جمال میرا شریک حال ہے
نالہ بہ نالہ غم بہ غم نعرہ بہ نعرہ ہو بہ ہو

رئیس امروہوی

سید اختر ناز

دائرہ حقوق اللہ اور حقوق العباد

حقوق اللہ اور حقوق العباد کوئی ایک دوسرے سے کٹے ہوئے یا علیحدہ نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے کے ساتھ مربوط اور پیوست ہیں، ایک کی ادائیگی سے دوسرے کی بھی ادائیگی ہو جاتی ہے، حقوق العباد کی ادائیگی کا حکم چونکہ اللہ کی طرف سے ہے، لہٰذا اس کی ادائیگی سے اللہ کے حکم کی ادائیگی ہوگی اور اس طرح حقوق اللہ کے زمرے میں آئے گی اور یہ عبادت شمار ہوتی ہے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

''راستے سے تکلیف دہ چیز ہٹانا بھی نیکی ہے۔''

راستہ میں پڑا پتھر چونکہ مخلوق خدا کو تکلیف دیتا ہے، اس لئے اس کے ہٹانے کو بھی حقوق اللہ کی ادائیگی سے متصور کر کے نیکی مانا جائے گا۔

حقوق اللہ میں مندرجہ ذیل اہم پہلوؤں پر ایمان لانا ضروری ہے۔

۱۔توحید باری تعالیٰ
۲۔قیام صلوۃ یا عبادت
۳۔ادائیگی زکوۃ
۴۔اہتمام صیام
۵۔ادائیگی مناسک حج
۶۔امر بالعروف ونہی عن المنکر یا جہاد

اللہ تعالیٰ نے اپنی ترتیب میں حقوق العباد کو اپنے حقوق کی نسبت زیادہ اہمیت دی ہے، عام لوگوں میں غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ حقوق اللہ کو حقوق العباد پر برتری حاصل ہے اس لئے وہ نماز، روزہ کا کچھ اہتمام کر لیتے ہیں، لیکن حقوق العباد کی نگہداشت نہیں کرتے جس کے نتیجہ میں عدل و احسان کا فقدان ہو جاتا ہے اور معاشرہ نفاق، انتشار، عدم اطمینان اور تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے، حقوق اللہ میں کوتاہی تو شاید اللہ تعالیٰ کی رحیمی و کریمی کے طفیل عفو و درگزر کی جہ سے معاف ہو جائے لیکن حقوق العباد یعنی حقوق انسانی کے سلسلے میں کیے جانے والے گناہوں کی اللہ تعالیٰ سے معافی کی کوئی امید نہیں ہے کیونکہ بندے کا گناہ تو بندہ ہی معاف کر سکتا ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی حوالے سے فرمایا۔

''کیا جانتے ہو مفلس کون ہوتا ہے؟''

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا۔

''جس کے پاس درہم و دینار نہ ہوں۔''

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''نہیں! مفلس وہ ہے جو آخرت میں اس حال میں ہو جائے گا کہ اس کے پاس نماز بھی ہو گی، روزہ بھی ہوگا، زکوۃ بھی ادا کی ہوگی اور حج بھی کر لیا ہوگا مگر وہ گناہ جو لوگوں کو گالیاں دے کر، غیبت کر کے یا کسی فرد کا حق مار کر مفاد اٹھایا ہوگا، وہ اسے کیسے جنت میں جانے دے گا، جن کا حق مارا ہوگا وہ اس کی نیکیاں لے کر جائیں گے اور اگر نیکیاں نہیں کی ہوں گی تو اس پر لوگوں کے گناہ ڈال دیئے جائیں گے اور وہ جہنم کا ایندھن بنے گا۔'' اسی وجہ سے محسن انسانیت خیر

الانام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے تھے کہ بڑھ چڑھ کر نیکیاں کیا کرو اور کبھی بھی نیکی کو حقیر نہ سمجھو، چاہے ایک کھجور کا صدقہ ہی کیوں نہ ہو۔

حقوق العباد پر اللہ تعالیٰ کا زور اس لئے بھی ہے کہ حقوق العباد کی روگردانی سے خود بنی نوع انسان کو نقصان ہوتا ہے، عدل و توازن برقرار نہیں رہتا، ظلم پھیلتا ہے اور عفو و احسان سکڑتا ہے، اخوت و مساوات ختم ہوتی ہے اور ظاہر ہے ایسا ماحول جہنم سے کم نہیں ہے، اس لئے انسان کی جلت کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام مبعوث فرمائے جن کا کام تزکیہ نفس اور حکمت کی تعلیم تھا تا کہ خلافت ارضی پر مامور حضرت انسان کو فرائض خلافت کی ذمہ داریوں کے حوالے سے تیار کر سکیں، آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان حقوق اللہ اور حقوق العباد کے باہمی تعلق اور نجات اخروی میں ان کی اہمیت کو بخوبی واضح کر دیتا ہے۔

جنت میں لے جانے والے اعمال

حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''جنت میں لے جانے والے اعمال یہ ہیں۔''

اللہ کی عبادت ایسے خلوص سے کرو کہ اللہ کے سوا نہ صرف یہ کہ کسی غیر کی عبادت نہ کرو بلکہ اللہ کی جو عبادت کرو، اس میں شرکت غیر کا شائبہ تک نہ ہو، خالصتاً اللہ کی عبادت ہو اور اللہ کی خوشنودی کے لئے ہو، نماز قائم کرو، زکوۃ ادا کرو اور رشتہ داروں سے میل جول اور حسن سلوک کرو۔''

رزق حلال

ایک اور ارشاد میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''ایک شخص لمبا سفر کر کے غبار میں اٹا ہوا آتا ہے اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر ربی ربی کہتا ہے، دعا کرتا ہے مگر اس کا کھانا، پینا، لباس اور نشوونما سب حرام کی کمائی سے ہے تو اس کی دعا کہاں قبول ہوگی۔''

نیکی کیا ہے

حضرت وابصہ ابن معبد رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے فرمایا۔

''تم پوچھنے آئے ہو کہ نیکی کیا ہے؟ اور گناہ کیا؟''

میں نے عرض کیا۔

''ہاں۔''

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انگلیوں کو اٹھا کر اور میرے سینہ پر مار کر فرمایا۔

''اپنے آپ سے دریافت کر، اپنے دل سے دریافت کرو۔''

پھر فرمایا۔

''نیکی وہ ہے جس سے انسان خود مطمئن ہو جائے اور اس کے دل کو اطمینان ہو جائے اور گناہ وہ ہے جس سے انسان کا ضمیر خلش محسوس کرے اور جس سے اس کے سینہ میں شک پیدا ہو جائے۔''

جب ایک شخص کسی دوسرے شخص کے حقوق پر دست درازی کرتا ہے تو وہ در حقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی گئی حفاظت کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے اس لئے اگر وہ کسی کی جان لیتا

ہے تو اس کی جان لے لی جاتی ہے، اگر وہ کسی کی تہمت لگا کر بے عزتی کرتا ہے تو وہ ہمیشہ کے لئے غیر معتبر ٹھہر جاتا ہے، اسی طرح کوئی محفوظ مال چراتا ہے تو گویا وہ اپنے بھائی کا حق مار کر جرم کا مرتکب ہو جاتا ہے، غرضیکہ یہ سارے جرائم ہیں جو اللہ تعالیٰ کے بندوں کے خلاف ہوتے ہیں تو اس سے بندوں کا خالق متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، چنانچہ اسی وجہ سے اس نے معاشرے میں ایسے لوگوں کی سرکوبی کے لئے حدود کا تعین کر دیا ہے جو قرآن و حدیث میں بیان کر دی گئی ہیں۔

حقوق نفس

نفس سے مراد انسانی جان ہے جو کہ شخصیت انسانی کی تمام ظاہری و باطنی کیفیات پر محیط ہے، لہٰذا نفس کے حقوق وہی ہوں گے جو انسان کے جسم اور اس کی روح کے حقوق ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے لئے فرمایا۔

"بے شک تیری جان کا تجھ پر حق ہے، تیرے بدن کا بھی تجھ پر حق ہے اور تیری آنکھوں کا بھی تجھ پر حق ہے۔"

قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

"اللہ تعالیٰ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا بلکہ اس طاقت کے مطابق اس کے لئے وہی کچھ ہے جو اس نے کمایا اور اس پر وہی ہے جو اس نے کیا۔" (البقرہ۔۲)

اور قرآن مجید میں ایک جگہ اور ارشاد ہے۔

"اپنی جانوں اور اپنے اہل خانہ کی جانوں کو آگ سے بچاؤ۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے سورۃ شعراء کی آیت ۲۱۴ نازل فرمائی کہ "اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ" تو آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھڑے ہو کر فرمایا۔

"اے گروہ قریش! اپنی جانوں کو (جہنم سے) بچالو، میں تم کو عذاب الٰہی سے ذرا بھی بچا نہ سکوں گا۔" پھر آپ نے نام لے لے کر بنی عبد مناف، حضرت عباس بن عبد المطلب اور اپنی پھوپھی حضرت صفیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے کہا۔

"میں آپ کو اللہ کی گرفت سے ذرا بھی نہ بچا سکوں گا۔" پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی بیٹی سے کہا۔

"اے فاطمہ میری بیٹی! تم مجھ سے میرے مال میں سے جو چاہو لے لو مگر میں اللہ تعالیٰ کی گرفت سے تمہیں ذرا بھی نہ بچا سکوں گا۔"

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دیہاتی نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مکہ سے ہجرت کی اجازت طلب کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"نادان ہجرت بہت مشکل کام ہے تم اگر سمندروں کے اس پار رہتے ہوئے بھی نیک عمل کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے کسی عمل کو ضائع نہیں کرے گا اور اس کا اجر تم کو مل کر رہے گا۔" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے دریافت فرمایا۔

"کیا تمہارے پاس اونٹ ہیں اور کیا تم ان کی زکوۃ ادا کرتے ہو؟" اس نے عرض کیا۔

"ہاں!" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"تو پھر زکوۃ ادا کرتے رہو۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"جب تم میں سے کوئی بستر پر جانے لگے تو اسے چاہیے کہ پہلے بستر کو جھاڑ لے، اسے نہیں معلوم کہ اس کے پیچھے اس پر کیا چیز آئی پھر کہے

اے میرے مالک! میں تیرے ہی نام سے اپنا پہلو بستر پر رکھ رہا ہوں اور تیرا ہی نام لے کر اسے بستر سے اٹھاؤں گا، اگر اس دوران تو میری روح قبض کرے تو اس پر رحم فرمائیو اور اگر تو اسے آزاد رکھے تو اس کی اس طرح حفاظت فرمائیے جیسے تو اپنے نیک بندوں کی حفاظت فرماتا ہے۔"

مسافر کے لئے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"سفر ایک طرح کا عذاب ہے، جس کی وجہ سے انسان کھانے، پینے اور سونے سے محروم رہتا ہے اس لئے مسافر کو چاہیے کہ وہ اپنے کام سے فارغ ہوتے ہی اپنے اہل و عیال کے پاس پہنچنے میں جلدی کرے۔" (بخاری ۱۹:۲۶)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"سوتے وقت اپنے گھروں میں آگ جلتی نہ چھوڑو۔" (بخاری ۴۹:۷۹)

سوال نہ کرنا

حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ انصار میں سے چند لوگوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کچھ طلب کیا آپ نے انہیں دے دیا، انہوں نے پھر مانگا آپ نے پھر عطا فرمایا حتیٰ کہ جو کچھ آپ کے پاس موجود تھا سب ختم ہو گیا پھر آپ نے ارشاد فرمایا۔

"میرے ہاں جو مال ہوتا ہے، میں اس کے دینے میں دریغ نہیں کرتا اور تم سے بچا کر نہیں رکھتا لیکن جو شخص سوال کرنے سے باز رہتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے صبر آسان کر دیتا ہے اور کسی کو کوئی عطائے الٰہی صبر سے زیادہ بہتر اور وسعت والی نہیں ملی۔" (بخاری ۸:۲۵)

حیاء

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"حیاء صرف بھلائی لاتی ہے۔" (بخاری ۸:۷۷)

دیور سے پردہ

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"عورتوں کے پاس جانے سے خود کو بچاؤ۔"

ایک انصاری نے دریافت کیا۔

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم! دیور کے بارے میں کیا حکم ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"دیور تو موت ہے۔" (بخاری ۱۱:۶۷)

صدقہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"جب کوئی شخص اپنی پاک کمائی میں سے ایک کھجور کے برابر بھی صدقہ دیتا ہے تو اللہ اسے بڑھاتا ہے حتیٰ کہ وہ پہاڑ کی مثل ہو جاتا ہے۔" (بخاری ۲۳:۹۷)

گھر والوں پر خرچ

حضرت ابو مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"مسلمان جب اپنے گھر والوں پر خرچ کرتا ہے اور خرچ کرتے وقت ثواب کی امید رکھتا ہے تو وہ خرچ اس کا صدقہ بن جاتا ہے۔" (بخاری ۱:۲۹۱)

صدقہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ "انسانوں کے جسم میں جتنے جوڑ ہیں ان میں سے ہر ایک پر صدقہ واجب ہے ہر روز جب آفتاب طلوع ہوتا ہے تو دو آدمیوں کے درمیان انصاف سے فیصلہ کر دینا بھی صدقہ ہے اور کسی کی مدد کرنا اس طرح کہ اسے اپنی سواری پر بٹھا کر اس کا سامان لاد کر منزل تک پہنچا دے یہ بھی صدقہ ہے اور کلمہ خیر یا اچھی بات کہنا بھی صدقہ ہے اور ہر وہ قدم جو نماز کے لئے مسجد کو جاتے ہوئے اٹھتا ہے وہ بھی صدقہ ہے اور راستے میں ایذارساں چیز ہٹانا صدقہ ہے۔" (بخاری ۵۶:۱۲۸)

سوال کرنا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"انسان کا جنگل سے لکڑیوں کا گٹھا کمر پر اٹھا کر لانا اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ کسی کے آگے دست سوال دراز کرے جو اسے کچھ دے یا انکار کر دے۔" (بخاری ۳۴:۲۳)

دھوکا دینا

حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"جب تم کچھ خریدو یا بیچو تو کہہ دیا کرو لاخلابہ" (یعنی بلا کسی دھوکے کے عیب ذکر کر دیا کرو۔) (بخاری ۳۴:۴۸)

سود

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، کسی سے حسد نہ کرو اور نہ آپس میں بول چال بند کرو اور سب اللہ کے بندو ایک دوسرے کے بھائی بن کر زندگی گزارو اور کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ تین دن سے زیادہ اپنے بھائی سے تعلقات یا بول چال ترک کرے۔" (بخاری ۷۸:۵۷)

مسلمانوں کے حقوق

حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

"مسلمان مسلمان کا بھائی ہے اور بھائی نہ تو اپنے بھائی پر ظلم کرتا ہے اور نہ اس کو ظلم یا تکلیف میں مبتلا دیکھ سکتا ہے اور جو شخص اپنے بھائی کی حاجت روائی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات کا کفیل ہو جاتا ہے اور جو شخص کسی ایک مسلمان کی تکلیف دور کرتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی تکالیف میں سے ایک تکلیف دور فرمائے گا اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پردہ پوشی کرے گا۔" (بخاری ۴۶:۳)

☆☆☆

بادشاہ کی تلاش میں

ابن انشاء

فی زمانہ حکومتوں کے بدلنے کے دو طریقے رائج اور مقبول ہیں، ایک بیلٹ یعنی الیکشن، دوسرا بلٹ یعنی گولی کا، ویسے اب دونوں میں چنداں فرق نہیں رہا کیونکہ الیکشن میں بھی بیلٹ کے ساتھ ساتھ بلکہ بیلٹ سے زیادہ بلٹ کا استعمال ہونے لگا ہے اور زیادہ موثر اور کامیاب پایا گیا ہے، ہم ذاتی طور پر الیکشن کے حق میں نہیں، یہ خون خرابے کی چیز ہے جسے ہم نے مغرب کی اندھی تقلید میں اختیار کیا ہے، ہمارے بہترین بادشاہوں میں سے جن کا نام زریں حروف سے لکھتے لکھتے ہماری دواتیں خشک ہو گئی ہیں اور ملک کے سونے کے ذخائر میں کافی کمی واقع ہو گئی ہے، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں وغیرہ، ان میں سے کون الیکشنوں کے ذریعہ برسراقتدار آیا؟ عوام کی اکثریت کی رائے کی کوئی سند بھی نہیں۔

لوگوں کا بس چلتا تو بادشاہ غازی حضرت اورنگ زیب عالمگیر رحمتہ اللہ علیہ کے مقابلے میں وہ ووٹ دارا شکوہ کو دیتے، حالانکہ ہم آپ جانتے ہیں کہ وہ بڑا بدعقیدہ آدمی تھا، ہمارے ممدوح کے مقابلے میں جو متدین ایثار پیشہ، درویش اور اپنے بھائیوں پر جان چھڑکنے والے تھے، اس میں کوئی خاص خوبی نہ تھی بلکہ ایک بڑا عیب یہ تھا کہ کتابیں لکھتا تھا، اکبر اعظم تو الیکشن کا فارم بھی خود نہ پر کر سکتے تھے، ان کے نامزدگی کے کاغذات ابوالفضل کو پر کرنے پڑتے، بادشاہ بس نشان انگشت ثبت کرتا، محمود غزنوی اور احمد شاہ ابدالی سے بھی یہ توقع نہیں کرتے کہ وہ اس کھٹ راگ سے گزرتے۔

امیر تیمور کو ہم قائل کر لیتے، ہمارا خیال ہے کہ وہ ہماری بات نہ ٹالتے، لیکن یہ بھی گمان ہے کہ کچھ اس قسم کا عذر کر کے کہ "آج میری ٹانگ میں درد ہے، کل الیکشن کی تاریخ کا اعلان کروں گا۔" راتوں رات گھوڑوں کی ننگی پیٹھ پر بیٹھ کر لشکر لے کر "علی علی" کرتے خوارزم کی طرف نکل جاتے، بلکہ ان کا ایک اور گھوڑا جاتے جاتے ہماری گھاس پھوس کی کٹی کو لات مار جاتا کہ اور دو مشورے صاحب قراں کو، اصولاً تو انگریزوں کو بھی حکومت سنبھالنے سے پہلے ہندوستان میں الیکشن یا استصواب رائے وغیرہ کرانا چاہیے تھا لیکن خیر! دوسرا طریقہ بھی حکومت بدلنے کا اتنا ہی مقبول اور مشہور ہے بلکہ ہمارے ہاں جمہوریت تو مدت سے کافور ہے، اسی کا زیادہ دستور ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان دو گھسے پٹے طریقوں کے علاوہ بھی کوئی طریقہ ہے جو پرامن بھی ہو، افسوس کہ ٹیلیویژن اور ریڈیو کی بدعت رائج ہونے کے باعث لوگوں میں پرانے کلاسیکی ادب کا ذوق اٹھ گیا ہے، ہائے کیا زمانہ تھا کہ لوگ شب و روز داستانیں کہتے سنتے رہتے تھے، خوش جمال بادشاہوں اور ماہ پارہ شہزادیوں کی اور تین آنکھوں والے نابکار دیووں کی اور اڑتے قالینوں کی، داستان میں اس انہماک کا ایک ضمنی فائدہ یہ تھا کہ ملک میں افلیشن (افراط زر) بھی پیدا نہ ہونے پاتی تھی۔

ان قصوں کہانیوں کے بموجب ایک بادشاہ

کے لاولد مرنے پر لوگ صبح دم شہر کے دروازے میں سب سے پہلے داخل ہونے والے مسافر کے سر پر تاج رکھ کر شادیانے بجا دیتے تھے، کچھ لوگوں کا کہنا ہے شاہ مرحوم کا کانا وزیر اس پہلے آدمی کو پہلے ہی بغلی دروازے سے یا فصیل کے برج سے رسی لٹکا کر شہر کے دروازے کے پاس اتار دیتا تھا اور وہ تڑکے تک سردی سے ٹھٹھرتا اپنے کو بادشاہی کے خوابوں سے گرماتا وہاں دبکا پڑا رہتا تھا، لیکن ہم اسے محض بدگمانی سمجھتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ اس زمانے میں ولی عہد پیدا کرنے کے معقول انتظام ہوتے تھے، خاصے گنجان حرم بیگموں کے بھی، کنیزوں کے بھی، امراء، وزرا کی بہو بیٹیاں اس پر مستزاد اور اولاد نرینہ کی بشارتیں اور دعائیں دینے والے اہل اللہ بھی شہر کے باہر ڈیرے جمائے بیٹھے رہتے تھے، شہر سے باہر لیکن اتنی دور بھی نہیں کہ لوگوں کو نذر و نیاز کے ٹوکرے وہاں تک لے جانے میں وقت ہو۔

علاوہ ازیں ان دعاؤں کو مستجاب بنانے اور اس معاملہ میں قدرت کاملہ کو ظہور میں لانے کے لئے محل کے اندر حبشی غلام بھی رہتے تھے جن کے سرکاری فرائض تو دن میں ختم ہو جاتے تھے لیکن اپنے آقا کی بیگمات کی فرمائش پر اوور ٹائم بھی خوشی خوشی کر لیتے تھے، خواجہ سراؤں کی موجودگی اس میں مانع نہ ہوتی تھی، تاہم داستانوں سے پتا چلتا ہے کہ بادشاہوں کی لاولدی اور صبح دم مسافروں کو بیٹھے بٹھائے پکی پکائی بادشاہی ملنے کی وارداتیں خاصی ہوتی تھیں۔

☆☆☆

ہم بادشاہت کے تہہ دل سے قائل ہیں، اس وقت بالخصوص مسلمان ملکوں میں جو بادشاہ ہیں، وہ ہماری آنکھ کا تارا ہیں، ہم نے کئی بار لکھا کہ اب جو ہمیں خدا نے یہ ملک دیا ہے تو اس میں ہمیشہ بادشاہت لا کر کسی کو بادشاہ یا خلیفہ بنانا چاہیے تاکہ یہ آئین دستور، پیپلز پارٹی، پی این اے وغیرہ کے جھگڑے نہ اٹھیں، یہ کوئی ضروری نہ تھا کہ ہمیں بادشاہ بنایا جاتا، کسی اور کو بھی بنایا جا سکتا تھا، کیونکہ فی زمانہ اہلیت اور لیاقت کو کون دیکھتا ہے، تاہم ہماری شنوائی نہ ہوئی۔

انگلستان ہم اس لئے بھی آئے تھے کہ یہاں بادشاہت ہے، یہاں کبھی نہ کبھی کوئی تو لاولد مرے گا کیا عجب یہاں صبح دم دروازہ شہر میں داخل ہونے والوں کے حقوق تسلیم کیے جائیں، لیکن یہاں آ کر پہلی مایوسی تو یہ ہوئی کہ اس شہر میں نہ فصیل ہے، نہ کوئی دروازہ ہے، یہاں ہم کمبل لے کر پڑ جاتے اور ہر روز اخبار ٹائمز خرید کر سیاہ حاشیے کی خبروں کا مطالعہ کرتے ایک صورت یہ بھی تو تھی کہ لوگ در بدر تلاش کرتے تھے کہ شہر میں کوئی ایسا بصرے یا کاشغر کا نوجوان تاجر ملے جس کا تعلق کسی پرانے شاہی خاندان سے ہو اور جو حسن صورت، لیاقت اور ذہانت میں یکتائے زمانہ ہو، ہم نے اسی خیال سے اپنی ڈگریاں اس ڈگری کے علاوہ جو کہ آپریٹو قرضہ کی نادہندگی کے سلسلے میں ہم پر ایک دیوانی عدالت نے دی تھی (کوئی باہوش عدالت ایسا نہیں کر سکتی تھی) فریم کرا کے اپنے ڈرائنگ روم میں لٹکا دیں، جہاں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں، ایسے بھی جن کی پارلیمنٹ اور بکنگھم پیلس تک پہنچ ہے اور خود عمل تسخیر شروع کر دیا، قباحت یہ ہوئی کہ کسی نے ملکہ عالیہ کو بروقت فیملی پلاننگ کا لٹریچر نہ بھیجا تھا جس سے چند قباحتیں پہلے ہی پیدا ہو چکی تھیں بلکہ قباحت در قباحت بھی، اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ شہزادی این کے ہاں اس عزیزہ کے پیدا ہونے کی ہمیں خوشی نہیں، جب اور سب

ہی کو ہے تو ہمیں بھی ہے، تاہم یہ ہوا کہ بادشاہت کی کیو میں ان کا نمبر لگ گیا، پانچواں۔

ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جاویں

پھر بھی اگر پہلے چار امیدواروں کو کچھ ہو جائے اور ان میں جو اولاد نرینہ ہے، وہ فاتر العقل نکل جائے یعنی سب کے سب امریکی منکوحہ عورتوں سے شادی کر کے وزیراعظم وقت کو ناراض کر لیں، یا رومن کیتھولک، مسلمان یا کبیر پنتھی ہو جائیں اور یہ نومولود بچی تاج پہننے سے انکار کر دے کہ چبھتا ہے یا میرا ہیئر اسٹائل سے خراب ہوتا ہے تو سلطنت دست بدست ہم تک آ سکتی ہے، لیکن آج یہ خبر آئی کہ اس گھرانے میں ایک اور شہزادی نے جنم لیا ہے، یہ ڈچس آف گلوسسٹر کی صاحبزادی ہیں، ان کا بادشاہت کی قطار میں بارھواں نمبر ہے۔

ہم نے ایک ہمدرد سے ذکر کیا اور کہا کہ ”گلوسسٹر پیلس میں رہنے کی وجہ سے ہم بھی ایک طرح کے ڈیوک آف گلوسسٹر ہیں کہ نہیں۔“ تو کہنے لگے۔

”صاحب من، اگر ملکہ الزبتھ ثانی کو ملکہ وکٹوریہ کی عمر ارزانی ہوئی تو کچھ عجب نہیں کہ ایک سو بارھواں امیدوار بھی پیدا ہو جائے، بس سیدھے اپنے وطن واپس جاؤ، اپنا وقت مت ضائع کرو، امیگریشن کے رجسٹر کے مطابق تمہارا نمبر وارثت کے معاملے میں چھ کروڑ اٹھتر لاکھ چوراسی ہزار آٹھ سو پینتیسواں ہے، پھر تم کالے بھی ہو اور پرانی داستانوں میں بھی شاہی خون کی شرط ہوا کرتی تھی۔“

ہم نے بتایا کہ ”کالے تو ہم بیماری کی وجہ سے ہو گئے ہیں، جب وقت آئے تو اپنے ملک سے گورا کرنے والی کریم منگا لیں گے، جس کے استعمال سے حبشی تک گورے ہو سکتے ہیں اور

رہوڈیشیا اور جنوبی افریقہ تک کے مسئلے حل ہو سکتے ہیں، اب رہی شاہی خاندان کی بات ہم نے ایک پرانی کتاب میں دیکھا ہے کہ پراچین زمانے میں ہمارے جد امجد کالنجر کے قریب ایک ریاست کے ایک طرح سے راجہ تھے، وہ یوں کہ بظاہر راجہ ان کے چھوٹے بھائی تھے لیکن وہ بڑے بھائی یعنی ہمارے جد امجد کا اتنا ادب کرتے تھے کہ ان کی کھڑاؤں تخت پر تو نہیں، تخت پر جگہ ہی کہاں ہوتی ہے، تخت کے نیچے رکھتے تھے۔"

ہمارے ان مہربان نے فرمایا۔

"یہ انگلستان ہے، یہاں انگریزی خون یعنی سفید خون کی شرط ہے، کالنجر کا حوالہ نہیں چلے گا۔"

ہم نے دل برداشتہ ہو کر کہا۔

"اچھا تو اور ملکوں کے نام بتاؤ جہاں بادشاہت ہو اور جہاں جوہر قابل کی قدر ہوتی ہو، اسلامی ملک ہو تو اور اچھا ہے، کیونکہ ہمیں اسلام کا بول بالا کرنے کا بھی شوق ہے۔"

ہمارے ان دوست نے چند ملکوں کے نام بتائے لیکن یہ بھی کہا کہ "آج کل وہاں ویزا کی پابندی ہے اور پاکستانیوں کو تو بالکل نہیں ملتا۔"

اس کے بعد جیب سے پی آئی اے کا ٹائم ٹیبل نکال کر کہنے لگے۔

بتاؤں، لندن سے کون کون سی فلائٹیں سیدھی کراچی جاتی ہیں۔"

ہم نے منغض ہو کر کہا۔

"رہنے دو، ہم خود دیکھ لیں گے، آدمی گڑ نہ دے، گڑ کی بات تو کرے۔"

ہم بادشاہ ہوتے تو کیا کرتے، اس باب میں ہم نے ایک منشور چھاپ رکھا ہے جسے خرچا ڈاک کے لئے دس روپے بھیج کر ہم سے طلب کیا جا سکتا ہے، مختصر یہ کہ ملک سے ساری بری بری باتوں کا قلع قمع کرتے پہلے قلع پھر قمع، جمعے کی چھٹی کرتے تھے، لیکن افسوس وہ پہلے ہی ہونے لگی ہے، خیر جمعے کی دو چھٹیاں کر دیں گے، ہمارے عہد معدلت عہد میں ہفتے میں دو جمعے ہوا کریں گے تاکہ لوگ دل جمعی سے عبادت کرتے رہیں، جمہوریت اور سوشلزم وغیرہ کے شیطانی وسوسے ان کے دل میں پیدا نہ ہوں، شراب کی ممانعت کرنے کا نکتہ بھی ہمارے منشور میں تھا، وہ بھی ہو چکی، لیکن ہرج نہیں، ہم مزید ممانعت کر دیں گے تاکہ جو لوگ نہیں پیتے وہ مزید نہ پئیں، یہاں تفصیل کیا دیں، آزمائش شرط ہے، "مشک آنست کہ خود ببوید۔"

☆☆☆

تاریخ انگلستان ہم نے اس خیال سے لکھنی شروع کی تھی کہ آخر میں اپنے عہد کا حال اپنے قلم سے لکھ جائیں تاکہ آنے والے مورخ غلطیاں نہ کریں، لیکن قارئین کرام شاعر کہہ گیا ہے۔

"حب وطن از ملک سلیماں خوشتر۔"

اب ہم فرنگستان کے راج پاٹ پر لات مار کر وطن واپس آنے اور ایک رحم دل اور بیدار مغز تاجدار کے طور پر اپنے ملک اور رعایا کی خدمت کرنے کے لئے بے تاب ہیں، جونہی امراء اور عمائد کا کوئی وفد ہمیں لینے کے لئے آئے گا، ہم لندن کے در و دیوار پر حسرت سے نظر کرتے ہوئے روانہ ہو جائیں گے، اس کالم کی کٹنگ سنبھال کر رکھیں، اپنے سب قارئین کو ہم خلعت و انعام دیں گے اور لوگوں کا منہ موتیوں سے بھر دیں گے، خصوصاً ان کا جو نکتہ چینی کے لئے منہ کھولنے کی کوشش کریں گے۔

☆☆☆

مہمان —— حمیرا خالد

قاری کا مصنف سے دلی و جذباتی تعلق ہوتا ہے، ایسا تعلق جو ان کے دلوں کو جکڑے رکھتا ہے، ہماری قارئین بھی مصنفین سے ایسی ہی دلی وابستگی رکھتی ہیں اور وہ مصنفین کے بارے میں جاننا چاہتی ہیں کہ ان کی ذاتی زندگی، خیالات، احساسات وہ جاننا چاہتی ہیں کہ کیا مصنفین بھی عام لوگوں کی طرح ہوتے ہیں یا ان کے شب و روز میں کچھ انوکھا ہے ہم نے قارئین کی دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک سلسلہ شروع کیا ہے "ایک دن حنا کے نام" جس میں ہر ماہ ایک مصنفہ اپنے ایک دن کا احوال لکھیں گی کہ صبح آنکھ کھلنے سے لے کر رات نیند کو خوش آمدید کہنے تک وہ کون کون سی مصروفیات ہے لکھنے کے علاوہ جو وہ انجام دیتی ہے، امید ہے آپ کو یہ سلسلہ پسند آئے گا۔

فوزیہ شفیق

السلام علیکم دوستو! کیسے ہیں آپ سب؟ چھٹیاں اور گرمیاں انجوائے کی جا رہی ہیں؟ ارے ہاں یاد آیا آج تو جواب دینے کی باری ہماری ہے، تو جناب فوزیہ آپی نے محبت سے ہمیں یاد کیا اور ہم حاضر ہو گئے، ہم سے پوچھا گیا ہے کہ ہم صبح سے شام تک کیا کرتے ہیں؟ ہم نے یہ سوال اپنی ماما جانی سے کیا تو بولیں۔

"لکھ دو سوتی ہوں، کہانیاں لکھتی ہوں اور پڑھتی ہوں اور کمپیوٹر میں دماغ کھپاتی رہتی ہوں۔"

یہ جواب سننے کے بعد ہم نے کسی اور سے کچھ پوچھنے کا ارادہ ترک کر دیا، ورنہ اگر یہ سوال ہماری بڑی باجی زاہدہ حبیب سے کیا جاتا تو وہ یقیناً قہقہہ لگا کر ہنس پڑتیں اور اگر چھوٹی باجی ثمینہ جابر سے پوچھتی تو وہ اتنا کچھ اور ایسا کچھ کہتیں کہ ہم سے خط لکھنا مشکل ہو جاتا، بائی دا وے وہ اس ٹاپک پر کافی بول سکتی ہیں، ہاں البتہ چھوٹے بھائی عمران خان یاور سے کچھ اچھی امیدیں تھیں کہ وہ بچپن کی دوستی کا کچھ لحاظ کرتے مگر جناب احتیاط بہتر ہے (کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی) چلیں جی دنیا کب چپ رہتی ہے کہنے دو جو کہتی ہے، کوئی ایسی ویسی رائے قائم کرنے کے بجائے آپ وہ سنیں جو مابدولت آپ کو بتا رہی ہیں۔

ہم اپنی ماما جانی اور چھوٹے بھائی عمران کے ساتھ شاہکوٹ میں رہائش پذیر ہیں، صبح الارم کی آواز سننے کے ساتھ ہم نیند بھری آنکھوں کو بمشکل کھولتے ہوئے آواز لگاتے ہیں۔

"عمران اٹھ جاؤ کالج سے لیٹ ہو جاؤ گے۔" مگر جواب ندارد ہم پھر پکارتے ہیں۔

"یار لائٹ چلی جائے گی تمہیں بنا نہائے کالج جانا پڑے گا۔" جواب آتا ہے۔

"ہوں......ں۔"

"عمران میں نے جگا دیا اب سوتے رہو میری ذمہ داری نہیں۔"

"یار صبح صبح غصہ کرکے صبح خراب کرنا ضروری ہوتا ہے کیا؟ پیار سے نہیں جگا سکتیں؟"

ایک ڈیڑھ گھنٹے جگانے کی مشقت کرنے کے بعد یہ سن ہم غصہ دباتے کچن کا رخ کرتے ہیں، ہماری ہر صبح کا آغاز تقریباً اسی طرح ہوتا ہے اللہ اللہ کرکے بھائی صاحب کالج روانہ ہوتے ہیں یہ معمول اس وقت سے جاری ہے جب وہ محترم خود سکول سٹوڈنٹ تھے اور آج ماشاء اللہ کالج میں لیکچرر ہیں (بظاہر صبح کا یہ غصے والا آغاز ہے مگر سچ یہ بھی ہے کہ اگر عمران گھر نہ ہو تو صبح کا مزا ہی نہیں آتا) اس کے جانے کے بعد امی کو ناشتہ کرواتی ہوں اور خود بھی کرتی ہوں اگر موڈ ہو تو (جی ہاں مابدولت کھانے کے معاملے میں بھی موڈ پر ڈیپنڈ کرتے ہیں) آج کل ہم ماسی سے محروم زندگی سے واسطہ آن پڑا ہے اس لئے سارے گھر کا بوجھ ان نازک ناتواں کندھوں پر آن پڑا ہے ورنہ بس کھانا ہی بنانا ہوتا تھا (ارے یار سنتے جا رہے ہو کچھ جھوٹی سچی ہمدردی ہی جتا دو) ناشتے کے بعد ضروری سامان سمیٹ کر میں اکثر سونے لیٹ جاتی ہوں کیونکہ سونے کے لئے مجھے یہ وقت بیسٹ لگتا ہے، جاگنے کے بعد کوئی کتاب پڑھتی ہوں یا کمپیوٹر پر کچھ ٹائم گزارتی ہوں، بھائی کی واپسی پر روٹی بناتی ہوں (سالن شام میں بنا کر رکھتی ہوں) لنچ کے بعد عمران کے ساتھ خوب گپ شپ ہوتی ہے تاش یا لڈو کی کچھ بازیاں بھی لگ جاتی ہیں اس کے بعد امی جان یاد کرانا شروع کر دیتی ہیں کہ شام ہو چلی ہے کھانے کی تیاری کر لینی چاہیے اور ہم اتنی جلدی شام ہو جانے پر حیران پریشان ہوتے کچن کا رخ کرتے ہیں پھر کام اور گپ شپ ساتھ چلتی ہے کیونکہ کچن کا دروازہ لاؤنج میں کھلتا ہے جہاں امی اور عمران موجود ہوتے ہیں اگر نہ بھی ہو تو عمران کو تو میں ضرور وہاں بٹھائے رکھتی ہوں تاکہ باتوں باتوں میں کام سے فارغ ہو جاؤں (مجھے ہمیشہ سے ایسے ہی کام کرنے کی عادت ہے مگر آپ یہ مت سمجھنا کہ میں بہت باتونی ہوں کیونکہ اتنی باتیں صرف عمران کے ساتھ ہی ہوتی ہیں) کھانے کے بعد کبھی مووی دیکھ لیتی ہوں (مجھے ہارر اور سسپنس فلمز بہت پسند ہیں) کبھی کہانی پڑھنے یا لکھنے بیٹھ جاتی ہوں ساتھ ساتھ فیس بک اور ای میل باکس بھی دیکھتی رہتی ہوں، گھر کی صفائی، برتن اور کپڑوں کی دھلائی میں یا تو صبح سویرے ناشتے سے پہلے کرتی ہوں یا پھر مغرب کے بعد رات سونے سے پہلے اپنے لیپ ٹاپ پر قرآن کا ترجمہ لگا لیتی ہوں اور پھر وہ سنتے سنتے اور ڈسکس کرتے نیند کی وادیوں میں اتر جاتے ہیں، اس وقت تک رات کے بارہ، ایک ہو چکے ہوتے ہیں، مجھے یکسانیت سے چڑ ہے، اس لئے کام سب یہی ہوتے ہیں لیکن ٹائمنگ تبدیل کرتی رہتی ہوں چاہے وہ تبدیلی یہی ہو کہ صبح چھ کی بجائے سوا چھ یا پونے چھ کا الارم لگا دوں (ہاہاہا) زندگی کے ہر دن کو مختلف طریقے سے گزارنے کی، کچھ نہ کچھ چینج لانے کی کوشش کرتی رہتی ہوں، چھٹیوں میں بھی تقریباً یہی معمول رہتا ہے، تو جناب یہ ہے ہمارے دن رات کا احوال۔

بہت ساری نیک خواہشات کے ساتھ، حمیرا خان۔

☆☆☆

آخری جزیرہ

ام مریم

اٹھائیسویں قسط کا خلاصہ

مسز آفریدی جہان پرژالے کے حوالے سے رکیک قسم کے الزام لگا کر ایک بار پھر اسے گھیرنا چاہتی ہیں تا کہ وہ رخصتی پہ آمادہ ہو جائے، ان کے یہ انداز و اطوار جہان کی صرف نفرت کو بڑھاوا دیتے ہیں مسز آفریدی ہار نہیں مانتیں اور پپا کے ذریعے ایک بار پھر اپنا مطلب نکالتی ہیں، جہان ہمیشہ کی طرح ان کے آگے بے بس ہو جاتا ہے۔

انگلینڈ میں معاذ پرنیاں کو شاہ سے ملواتا ہے، پرنیاں پہلی بار خوشی کے احساس سے ہمکنار ہوتی ہے مگر شاہ یہ انکشاف کر کے کہ وہ پریگنٹ ہے پرنیاں کو گم صم کر دیتی ہے۔

زینب، تیمور کی حویلی میں شدید ترین آزمائش سہہ رہی تھی، جسمانی، روحانی اور ذہنی آزمائش مگر اس نے ہر اذیت کو خود پہ سہنے کا عہد، جسے خود سے باندھا تھا جبھی شاہ ہاؤس کے مکینوں تک اس کی اذیت کی خبر نہیں پہنچی، مگر جہان لاشعوری طور پہ بے قرار ہے۔

پرنیاں کی پریگننسی کی خبر شاہ ہاؤس کے ہر مکین معاذ سمیت کو خوشگواری عطا کرتی ہے مگر پرنیاں معاذ کے رویے کی بدولت اپنا مستقبل غیر محفوظ خیال کرتے اسی خوشی پہ خوش نہیں۔

اب آپ آگے پڑھیے

انتیسویں قسط

جہان وہیں سے الٹے قدموں پلٹ گیا تھا، اس کے اعصاب شکستہ اور دل بے انتہا بوجھل ہو گیا تھا، آنکھوں میں جو سرخی اتری تھی اس کے ساتھ وہ خود کو اس قابل نہیں پاتا تھا کہ سب کے درمیان بیٹھ سکے، ان سوالوں کے جواب وہ نہیں دے سکتا تھا۔

''مجھے سمجھ نہیں آ رہی ہے زینی میں آپ کو کیسے حوصلہ دوں، ہم قسمت کے ہاتھوں گویا کٹھ پتلیاں ہیں، تقدیر کے فیصلوں کے آگے سرنگوں۔'' پرنیاں کے لہجے میں کرب اور اذیت کی آمیزش تھی، زینب نے آہستگی سے اپنے بھیگے گال رگڑ کر خشک کر ڈالے۔

''آئی ایم ساری پرنیاں میں نے تمہیں بھی اداس کر دیا۔'' زینب کو جیسے ہی احساس ہوا تھا اس نے بہت سرعت سے خود کو سنبھالنے کی سعی کی تھی۔

''ڈونٹ وری، اس اداسی کی فکر نہ کریں، کچھ لوگوں کے نصیب میں ازل سے اداسیاں اور تشنگیاں درج ہو چکی ہیں۔'' پرنیاں کے یاسیت آمیز لہجے میں مایوسی گھلی ہوئی تھی، زینب نے حیران کن نظروں سے اسے دیکھا۔

''لالے سے تمہیں اب بھی شکایتیں ہیں پری؟'' پرنیاں کے ہونٹوں پہ زخمی مسکراہٹ کی جھلک نظر آئی۔

''اس ذکر کو چھوڑو زینب، آؤ اندر چلتے ہیں، مما آپ کی غیر موجودگی سے زیادہ دیر غافل نہیں رہیں گی، انہیں ویسے بھی بہت پریشانی رہتی ہے آپ کی طرف سے۔'' زینب نے ٹھنڈا سانس بھرا اور اس کے ساتھ ہو لی تھی۔

☆☆☆

''چاچو میرا خیال ہے کہ لاہور والے گھر میں ایک رات قیام کر لیا جائے، واپس اسی روز یہاں آنا مناسب نہیں ہے۔''

معاذ کسی کام سے پپا کے پاس آیا تو جہان پوری سنجیدگی کے ساتھ پپا کو قائل کرنے میں مصروف تھا، معاذ نے اڈتی مسکان کے ساتھ اسے دیکھا تھا۔

''ڈونٹ یو وری جے، ہم جلدی رخصتی کرا لیں گے، رات کے پہلے حصے میں یہاں پہنچ جائیں گے، تم فکر کاہے کو کرتے ہو؟ تمہاری گولڈن نائٹ ہرگز بھی مس نہیں ہو گی شہزادے۔'' اس کے برابر دھپ سے بیٹھ کر وہ اس کے کان میں گھس کر بھرپور خباثت سے بولا، جہان کی رنگت اس کی اس درجہ بیہودہ گوئی پہ خفت کے احساس سے سرخ پڑ گئی، اس نے بے حد ناراضی سے اسے دیکھا تھا۔

''اعتراض تو ہمیں کوئی نہیں ہے بیٹے مگر اتنے باراتیوں کو کہاں ٹھہرائیں گے؟ پھر زیادہ تر لوگ یہاں کراچی کے ہیں، انہیں واپس اپنے گھروں کو جانا ہو گا۔''

''ہاں تو یہ ان لوگوں کا سر درد ہے نا پپا ہمیں کیا لینا دینا، جے کی بات بالکل ٹھیک ہے، ساری رات تو سفر میں ہی گزر جائے گی، آپ لوگوں کو خود بھی خیال کرنا چاہیے۔'' اب کے معاذ نے پھر ٹانگ اڑائی تھی، جہان اتنا جھلایا کہ اب کی مرتبہ اسے گھورے بنا ہی ہونٹ سختی سے بھینچ لئے۔

''تم کس طرح خوش بھی ہو گے؟ ویسے میں نے جانا تم ایکٹنگ اچھی کر لیتے ہو، سب کے سامنے سنجیدہ اور بے زار بنتے ہو، حقیقت یہ ہے تمہاری، اف یہ بے تابی، چپکے چپکے پپا کو قائل کیا جا رہا ہے کہ لاہور ہی رک جائیں۔'' پپا کے منظر سے ہٹتے ہی معاذ نے اسے آڑے ہاتھوں لیا، جہان جواب میں وضاحت کا ایک لفظ تک بولے کچھ دیر تک اسے خاموش اور سنجیدہ نظروں سے دیکھتا رہا تھا، پھر جیسے ہی اٹھ کر وہاں سے جانے لگا، معاذ نے بوکھلا کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

''کیا ہے جے؟ اب اتنی سی بات پہ خفا ہو گے؟''

''تم بتاؤ اگر تم ساری بات جانتے بوجھتے بھی مجھے اس طرح عاجز کرو گے تو کیا مجھے خفا ہونے کا بھی حق نہیں ہے؟'' وہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہو رہا تھا، معاذ نے گہرا اور طویل سانس کھینچا اور خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

''میرا چاچو سے یہ بات کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ میں نہیں چاہتا، محترمہ کو دلہن بنائے پلین میں اور ائیر پورٹ پہ لے کر خوار ہوتے پھریں، انسان ایک تماشا بن کر رہ جاتا ہے گویا، میں نے بات کی تھی مما جان اور چچی جان سے مسز آفریدی کو صاف منع کر دیں، ژالے کو دلہن بنانے سے، بس سادگی سے رخصتی ہونی چاہیے، مگر وہ ماننے کو تیار نہیں ہیں۔'' وہ سخت جھلاہٹ زدہ سا کہہ رہا تھا، معاذ نے ساری بات سنی اور گہرا سانس بھر لیا۔

''کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو، مجھے خود یہ سب کچھ اکورڈ لگتا ہے۔''

''تو پھر قائل کرو نا مما جان کو۔'' جہان نے تیزی سے کہا تو معاذ کی مسکراہٹ پھر سے امڈ آئی۔

''پپا ہیں نا آپ کی مٹھی میں، بس ایک بار کہہ دیا سمجھو تمہارا کام ہو گیا۔'' اس کے پریقین انداز پہ جہان کچھ جھینپ گیا تھا۔

''یہ محبتیں ہیں معاذ جو جینے کا آسرا بنایا ہے اللہ نے، ورنہ جو حالات تھے شاید......''

''اچھا اچھا، زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں، اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا، ژالے بھابھی مجھے تو بہت اچھی لگی ہیں، معصوم اور بے حد کیئرنگ...... تم ابھی نہ سہی مگر کبھی تو میری بات سے اتفاق کرو گے، انشاء اللہ۔''

اس کے سخت کبیدہ تاثرات اور کچھ کہنے کو جو یقیناً اس کی تردید میں ہوتا جہان کو ہاتھ اٹھا کر ٹوکتے اسی نے بے حد یقین سے کہا تھا، جہان خاموش رہا تھا مگر انداز صاف جتلاتا تھا اسے بہرحال معاذ کی بات سے سراسر اختلاف ہے۔

☆☆☆

میرے ہاتھ میں تیرا ہاتھ ہو
ساری محبتیں میرے ساتھ ہوں
تو جو پاس ہو پھر کیا یہ جہاں
تیرے پیار میں ہو جاؤں فنا

وہ بستر پہ لیٹی ہوئی تھی جب کھلی کھڑکی سے آتی مغنیہ کی خوبصورت آواز نے اسے اپنے حصار میں جکڑ لیا، اس کا دل ایکدم گم صم ہو گیا تھا، وہ لپک کر بے قراری سے کھڑکی کے پاس آئی تو آواز کچھ اور بھی واضح اور صاف سنائی دینے لگی اور اس کا ذہن ان لمحات میں بھٹکنے لگا جب اس نے پہلی بار گانا یہ سنا تھا، کتنی بری طرح سے وہ تب یونیورسٹی سے واپسی پہ جہان کے پیچھے پڑی تھی کہ وہ اسے اپنی پسند کا گانا

سنائے اور وہ اس کے سامنے ہمیشہ کی طرح ہتھیار ڈال گیا تھا، ڈھیر ساری کیسٹوں میں سے اس نے ایک کیسٹ منتخب کر کے کیسٹ پلیئر میں لگا کے پلے کا بٹن دبا دیا تھا، گاڑی کی فضا میں میوزک کے ساتھ خوبصورت آواز کا سرگم بکھیرنے لگا۔

میرے ہاتھ میں تیرا ہاتھ ہو
ساری جنتیں میرے ساتھ ہوں
تو جو پاس ہو پھر کہا یہ جہاں
تیرے پیار میں ہو جاؤں فنا
میرے ہاتھ میں تیرا ہاتھ ہو
ساری جنتیں میرے ساتھ ہوں

تب جہان کے چہرے پہ جو رنگ تھے جو کیفیت تھی، اس کے دیکھنے کے انداز میں جو بے خودی کا احساس چھلکتا تھا تب محض چند لمحوں کو ہی مگر زینب کو لگا تھا، جہان کی یہ ساری بے حد دلکش خواہشیں اسی سے وابستہ ہیں، مگر یہ محض چند لمحوں کی بات تھی، جہان پھر سے ویسا ہی تھا، بے نیاز، اجنبی اور غافل اور یہ اب وہ کبھی بھی یہ احساس یہ کیفیت اس کے لئے نہیں کسی اور کے لئے تھی اور وہ کوئی اور نہیں رہی تھی اب اس کی زندگی کا حصہ بننے جا رہی تھی، اس کے ہونٹوں پہ پہلے زہر خند بکھرا پھر سسکیاں اتر آئی تھیں، وہ ایک بار پھر رو رہی تھی، اب بدنصیبی پہ اپنی بے مائیگی پہ اپنے غلط فیصلے پہ۔

☆☆☆

جو گناہ میں نے کیا نہیں
مجھے اس سزا کا ملال تھا
میرا جرم مجھ کو بتا بھی دو
میرا منصفوں سے سوال تھا
میں محبتوں کا امین تھا
میں اداس گھر کا مکین تھا
اسے نفرتوں پہ عبور تھا
مجھے چاہتوں پہ کمال تھا
میری کون سنتا تھا داستاں
میری ذات سے کسے انس تھا
میرے ہر طرف تھیں رقابتیں
میرے چاروں سمت ہی جال تھا
وہ بھی اپنی سوچ میں ٹھیک تھا
کہ یہ تھا میرا ظرف اے دوستو!
مجھے لوٹ کر تھا وہ خوش بہت
میں بھی اس سے لٹ کے نہال تھا

ایک بار پھر شاہ ہاؤس میں روشنیوں، رنگوں اور خوشیوں کی برسات اتر آئی تھی، محض دو ماہ بعد ہونے والی اس شادی میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی تھی، آرائش، زیبائش میں پیسہ گویا پانی کی طرح بہایا گیا تھا پورا شاہ ہاؤس دلہن کی طرح سے جگمگا رہا تھا، حالانکہ جہان کی یہ شدید خواہش تھی کہ سب کچھ سادگی سے ہو مگر اس معاملے میں تو اس کی پہانے بھی نہیں سنی تھی وہ محض گہرا سانس بھر کے رہ گیا تھا۔

آج مہندی کی تقریب تھی، مایوں وغیرہ سے جہان نے سرے سے منع کر دیا تھا، خواتین نے اپنے طور پر یہ رسم بھی منائی تھی مگر جہان شریک نہیں ہوا تھا مگر آج وہ کسی طرح بھی جان بخشی نہیں کرا سکا، سب سے بڑھ کر تو معاذ سے جان چھڑانا مشکل تھا جس نے خود اپنے ہاتھوں سے اس کی ایک ایک تیاری کی تھی، مہندی کی تقریب کے لئے معاذ نے اس کے لئے آف وائیٹ شیروانی بنوائی تھی جس کے گلے پہ دبکے اور سچے موتیوں کا اتنا شاندار اور نفیس کام بنا ہوا تھا کہ نگاہ خیرہ ہوتی تھی مگر جب جہان نے اس لباس کو پہنا تھا تب صحیح معنوں میں گویا اسی کا حق ادا ہوا تھا، وہ باوقار تھا، شاندار تھا مگر اس پل تو اس کی آن بان شان دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کسی ریاست کا شہزادہ ہو، فریش شیو کی نیلاہٹوں نے اس کے خوبرو چہرے کی تازگی اور نکھار میں کچھ اور بھی اضافہ کر دیا تھا، سنجیدگی سے لبریز آنکھوں میں کچھ ایسا سحر ایسی مقناطیسیت تھی کہ جکڑ لینے سحر کر دینے کی صلاحیت رکھتی تھیں، معاذ نے بے حد شوخ انداز میں اس پہ پرفیوم کی پھوار چھڑکی تھی پھر مسکراتے ہوئے اسے گلے لگا لیا تھا۔

''آئی وش کہ زندگی کا یہ نیا سفر تمہیں راس آ جائے جے! خدا تمہیں اتنی خوشیاں دے کہ تمہارا دامن تنگ پڑنے لگے۔'' معاذ نے اس کے گلے لگے لگے ہی کہا تھا، اس کے لہجے کا خلوص اور اپنائیت بے مثال تھی مگر جہان کے دل کی جگہ پہ جیسے کوئی پتھر رکھ دیا گیا تھا، وہ ساکن منجمد سا کھڑا رہا، نہ کوئی احساس نہ جذبہ نہ خیال۔

''ماضی میں کس نے تمہارے ساتھ کیا کیا یہ سب کچھ بھول کر پھر سے جینے کا آغاز کرو جے یا یہ سوچ کر کہ خدا کے ہر کام میں ہر فیصلے میں مصلحت اور ہمارے لئے خیر خواہی پوشیدہ ہوتی ہے، جسے ہم اپنی کم فہمی کی بناء پہ سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں مگر ایک وقت آتا ہے جب ہمیں سمجھ آتی ہے جو کچھ ہوا تھا اس میں ہمارے اللہ نے ہمارے لئے کتنی امان کتنی بھلائی رکھی تھی۔'' معاذ اس سے الگ ہوا تھا اور اس کا چہرا ہاتھوں کے پیالے میں لے کر سمجھانے والے انداز میں بولا تھا، جہان پھر بھی کچھ نہیں بولا، ویسے ہی سپاٹ چہرا اور بے تاثر آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھتا رہا تو معاذ نے اسے خفیف سا جھنجھوڑ دیا۔

''جے...... مسکراؤ نا؟'' عجیب فرمائش ہوئی تھی، جہان نے کچھ خفگی سے اسے دیکھا۔

''چلو میری خاطر پلیز۔'' اس نے مسکراہٹ دبائی انداز دلربائی میں محبوبہ یا پھر بیویوں والا تھا، تمام تر اضطراب کے باوجود جہان کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی، معاذ اتنا نہال ہوا تھا کہ بے ساختہ پھر اسے گلے لگا لیا، یہی وہ لمحہ تھا جب زیاد نے اندر قدم رکھا تھا، انہیں ایک دوسرے سے بغل گیر دیکھ کر ٹھنڈا سانس بھر کے رہ گیا۔

''ایک تو آپ لوگوں کی محبت بھی عجیب مشکوک قسم کی ہے، ساری دنیا باہر رسم کے لئے انتظار کر رہی ہے اور ادھر چھپ کے رومانس ہو رہا ہے، قسم سے میری بجائے یہاں پرنیاں یا پھر ڈالے بھابھی آ جائیں تو ایک نیا مسئلہ شروع ہو جانا تا، کچھ تو خیال کیا کریں آپ لوگ۔'' وہ معنی خیز شرارت بھرے انداز میں

مسکراہٹ دبائے کہہ رہا تھا، معاذ نے بے دریغ صرف اسے گھورا نہیں اسے الٹے ہاتھ کی جڑ بھی دی تھی۔

''چلو تم آرہے ہیں ہم۔''

''یعنی ابھی رومانس کا کوٹہ پورا نہیں ہوا؟'' زیاد نے آنکھیں مصنوعی حیرت سے پھاڑیں۔

''بکو مت کھانا آتے ہیں، چلو جے۔'' معاذ نے پہلے اسے جھڑکا تھا پھر جہان کو مخاطب کیا، وہ گہرا سانس کھینچتا اس کے ہمراہ ہولیا، ابھی وہ تینوں دروازے تک ہی پہنچے تھے کہ مما کے ساتھ مما جان اور پھپھو کے علاوہ خاندان کی کچھ دور پرے کی دیگر بزرگ خواتین سے ٹکراؤ ہوگیا۔

''ماشاءاللہ، چشم بدور، خدا بری نظر سے محفوظ رکھے بالکل شہزادہ لگ رہا ہے میرا بیٹا، ہے نا بھابی بیگم۔'' مما نے بے اختیار اسے گلے لگا کر انتہائی محبت سے اس کی پیشانی چومتے ہوئے مما جان کی رائے لی تو مما جان نے مسکرا کر پوری صداقت سے تائید کی تھی۔

''چھوٹا سا ہوتا تھا بالکل جب ہم اس کی سالگرہ پر اسے ایسے ہی شیروانی پہنا کر تیار کیا کرتے تھے، بالکل شہزادہ لگا کرتا تھا، راہ چلتے لوگ بھی رک کر پیار کرتے تھے، خدا نے ایسی موہنی صورت سے نوازا ہے میرے بچے کو۔'' مما جان نے گلوگیر آواز میں کہا پھر مما کے انداز میں ہی اسے گلے لگا کر پیشانی چومی اور دعاؤں سے نوازا تھا، پھپھو سے دعائیں سمیٹ کر جہان پپا جان پھر پپا سے ملا تھا۔

''جیتے رہو بیٹے، خوش آباد رہو۔'' پپا نے مسکرا کر اس کے مضبوط چوڑے شانے کو تھپکا تھا اور سائیڈ پہ ہوئے، تب سے منتظر نوجوان پارٹی آگے بڑھی اور اسے زرتار دوپٹے کے سائے میں گیت گاتے ہوئے اسٹیج کی سمت لے جایا گیا۔

''آپ کی مہندی کی تقریب اتنی روکھی پھیکی پتہ ہے کیوں ہے کیوں ہے شہزادہ سلیم صاحب کہ آپ کی انارکلی آپ کے ساتھ نہیں ہے، کتنا کہا تھا کہ کمبائن کر لیتے ہیں ساری رسمیں مگر تم بھی نا جے......!'' معاذ کسی قدر جھنجھلا کر کہہ رہا تھا، جہان کے چہرے پہ ایک تاریک سا سایہ لہرا کر معدوم ہوگیا۔

(تم نے بالکل ٹھیک کہا معاذ میری انارکلی میرے ساتھ نہیں ہے، انارکلی شہزادہ سلیم کو نہیں مل سکی تھی یاد کرو، اسے تو وقت کے آمر نے دیوار میں چنوا دیا تھا، محبت کے نصیب پہ ازل سے شب خون مارا جاتا رہا ہے طریقہ واردات کچھ بھی ہو۔)

اس کی آنکھیں بے تحاشا جلن سمیٹ لائیں، اس نے نظریں جھکا لی تھیں، بھابی کے بعد پرنیاں رسم کرنے کو اوپر آئی تھی تو معاذ نے اسے تب ہی دیکھا تھا گویا، ڈل گولڈن کلر کے پیروں تک آتے فراک میں ہاتھوں میں گجرے باندھے اپنی سحر انگیز دلکشی اور جاذبیت کے ساتھ اس کی معصومیت بھری خوبصورتی گویا پورے ماحول پہ سحر طاری کر رہی تھی، معاذ نے دانستہ اس سے نگاہ نہیں ہٹائی، پرنیاں کے رسم کرتے ہاتھوں اور لمبی پلکوں پہ بیک وقت اگر لرزش اتری تھی تو یہ اس کی پرتپش اور کسی حد تک طنزیہ نگاہوں کی بدولت ہی تھا، کانوں میں آگے پیچھے جھولتے بڑے بڑے جھمکے گلے میں گلوبند اور روشن پیشانی پہ ٹیکہ اس کی سج دھج ہی کمال نہیں تھی وہ خود بھی کوئی ساحرہ تھی جو کم از کم معاذ پہ ہمیشہ ہی ہر حال میں سحر پھونک سکتی تھی، ذرا سا جھکنے پہ اس کی کمر پہ سیدھے گرتے بال ڈھلک کر کاندھے پہ گرے کچھ معاذ کے چہرے کے آگے جھولنے لگے، معاذ ایک خوشبودار حصار میں قید ہونے لگا۔

''اس مٹھائی پہ صرف جے کا حق ہی تو نہیں ہے، کوئی اور بھی کھا سکتا ہے۔'' وہ جیسے ہی رسم کی ادائیگی

کے بعد واپس جانے کو مڑی، معاذ نے اس کا مہندی چوڑیوں اور گجرے سے سجا ہاتھ پکڑ لیا، یہ سب کچھ اتنا غیر متوقع تھا، پرنیاں کے لئے کہ وہ لڑکھڑا کر اس کی گود میں گرنے سے بچی تھی تو بھی اس کے ہی کاندھے کو سختی سے دبوچ کر، وہ اتنی گھبرا گئی تھی کہ فوری طور پہ قطعی سمجھ نہیں سکی اسے کیا کرنا چاہیے۔

''شاباش ہے لالے آپ سے، رومانس کا ہر نیا طریقہ آپ سے ایجاد ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ یقیناً آپ کو اس کے علاوہ کچھ سوجھتا نہیں ہے، زبردست شاندار......''

زیاد بھی وہیں اسٹیج پہ تھا سب کچھ دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور باقاعدہ تالیاں بجا کر داد دی تھی، باقی سب جو متوجہ تھے ان کی ہنسی بھی جاری ہوگئی، پرنیاں کو یہ سب بے حد آکورڈ لگا تھا، خفت اور خجالت کے احساس کے ساتھ ہتک کا شدید احساس اس کی آنکھوں میں نمی بھر گیا تھا تو وجہ یہی تھی وہ جانتی تھی معاذ یہ سب کچھ اپنا بھرم رکھنے کو کر رہا تھا، محض دنیا دکھاوا، اس کا دل شدتوں سے سسک اٹھا تھا۔

''پرنیاں کھلا دیں اسے مٹھائی، ایسے کہاں جان چھوڑے گا یہ آپ کی۔'' جہان کی نگاہ سے پرنیاں کے آنسو بے بسی اور معاذ کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی سعی لاحاصل مخفی نہیں رہی تھی معاذ کو تنبیہی نظروں سے گھورتے وہ پرنیاں سے مخاطب ہوا تھا، پرنیاں نے دھند آلود نظروں سے ٹیبل پہ رکھی ہوئی مٹھائی کی پلیٹ سے ایک گلاب جامن اٹھائی تھی اور معاذ کو دیکھے بغیر اس کے منہ میں ڈال دی۔

''تھینکس فار دس آفر مائی لیڈی!'' وہ کورنش بجا لایا تھا، پرنیاں تیزی سے اٹھ کر نیچے اتر گئی، جہان نے سخت قسم کی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

''جو کام آپ سے خود سے نہیں ہوتا اس کی دوسروں کو نصیحت کرنا بالکل زیب نہیں دیا کرتا۔'' اس کا انداز تنبیہی تھا، معاذ نے سوالیہ مگر استعجابی نظروں سے اسے دیکھا۔

''مطلب؟'' وہ بے نیازی سے ٹشو سے اپنے ہونٹوں کو دبا رہا تھا، جنہیں مٹھائی کا شیرہ لگ گیا تھا۔

''پرنیاں کو اس طرح سے تنگ کرنے کا مقصد؟'' جہان کا لہجہ کڑا تھا مگر معاذ کی آنکھیں پھٹنے والی ہوگئیں۔

''ہائیں......تم کہنا کیا چاہتے ہو جے؟ بیوی ہے میری صرف اسے ہی تو......''

''بکو مت معاذ؟'' وہ سخت جھلایا۔

''یہ سب دکھاوا کرنے کی کیا ضرورت تھی، سخت بری لگتی ہیں، مجھے یہ بھرم رکھنے کو کی گئی اداکاری۔''

معاذ اس درجہ درست قیافہ شناسی پہ سر پکڑ کر رہ گیا۔

''تمہیں اتنے الہام کیسے ہو جاتے ہیں جے؟'' وہ سخت عاجز ہو کر کہہ رہا تھا، جہان نے ملامتی نظروں سے گویا اس کے اس اعتراف جرم والے انداز کو دیکھا تھا۔

''میں آنکھیں کھلی رکھتا ہوں اور عقل استعمال کرتا ہوں اور یہ تمہاری اداکاری ہر ذی شعور محسوس کر سکتا ہوں سمجھے، اپنے ساتھ تم نے پرنیاں کو بھی آزمائش میں ڈالا ہوا ہے۔'' وہ اسے سخت سست سنائے گیا تھا۔

''تم اسے بھابی کیوں نہیں کہتے آخر؟'' معاذ نے جیسے جان چھڑانے کو موضوع بدلنا چاہا۔

''یاد کرو تمہیں ان کے لئے یہ رشتہ میری طرف سے قابل قبول نہیں تھا، میں نے خود اپنا رشتہ استوار کیا ان سے، بہنوں کو کوئی احمق ہی بھابی کہتا ہوگا۔'' اب کے جہان نے صاف اسے چڑایا تھا۔

"زینب...... زینی...... ادھر آؤ، رسم کیوں نہیں کر رہی ہو تم؟"

معاذ کچھ اتنا لاجواب ہوا تھا کہ اسی جھنجھلاہٹ میں زور زور سے زینب کو پکارنے لگا، جو شاید ابھی تیار ہو کر پنڈال میں آئی تھی، پنک خوب گھیر دار سی فراک اور لمبا چوڑا دوپٹہ، وہ اس وقت بھی تھکی تھکی اور پژمردہ نظر آتی تھی، تیمور نے شادی میں شریک ہونے سے انکار کر کے بھی اس کی پریشانی میں اضافہ کر دیا تھا۔

"رہنے دو معاذ...... اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" جہان نے زینب کے گریز کو صاف پایا تھا جبھی بے ساختگی میں معاذ کو ٹوکا، صرف زینب ہی تو گریزاں نہیں تھی وہ خود بھی اس آزمائش سے کترا رہا تھا۔

"کیوں رہنے دوں؟ تمہیں بڑا خیال ہے اس کی طبیعت کا۔" معاذ اتنا جھلایا ہوا تھا کہ اس صورتحال کی نزاکت اور باریکی پہ دھیان دیئے بغیر جھنجھلا کر کہہ گیا۔

(کسی کو تو خیال کرنا چاہیے معاذ، تیمور نہ سہی میں سہی، میں اسے مزید کیا پریشان کروں، میرے تو بس میں اتنا بھی اختیار نہیں رہا کہ اس کے دکھوں کو سمیٹ سکوں، قسمت کے فیصلوں نے ہمیں کیسے امتحان سے دوچار کر دیا ہے۔) وہ اضطراب کا شکار ہوتا سوچتا رہا تھا۔

☆☆☆

"رہنے دیجئے نا مما! میرے پاس اور اتنے ڈریس ہیں کوئی بھی پہن لوں گی۔" معاذ نہا کر واش روم سے نکلا تو مما کو پوری وارڈروب کھنگالتے پایا تھا، ان کے چہرے پر پریشانی ہی نہیں جھنجھلاہٹ بھی تھی، جبکہ پرنیاں انہیں اپنے انداز میں تسلی دینے میں مصروف تھی۔

"کیسے رہنے دوں بیٹا! اتنی پیاری ساڑھی تھی، لبرٹی ساری چھان کر پھر آپ کے لئے لائی تھی اتنے شوق سے آج کے دن کے لئے، عین ٹائم پہ آ کے گم ہو گئی۔" مما اسی طرح مصروف رہ کر بولی تھیں۔

"اِدھر اُدھر اوپر نیچے ہو گئی ہو گی، اگر مل گئی تو ولیمہ پہ پہن لوں گی ڈونٹ وری مما!" معاذ اس گفتگو سے بے نیاز آگے بڑھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے آگے جا کر کھڑا ہو گیا اور تولیہ گلے سے نکالا۔

"اچھا بیٹا! اب آپ ایسے کرو معاذ کے ساتھ مارکیٹ چلی جاؤ، کوشش کرنا اس سے ملتی جلتی ساڑھی مل جائے مجھے بہت پسند تھی، آپ پہ بہت جچے گا آج کے دن یہ لباس۔" مما کی بات پہ معاذ کے بال سنوارتے ہاتھ اسی زاویے پہ ساکن ہوئے اور تصبیح پیشانی پہ ناگوار سی شکنیں نمودار ہوئی تھیں البتہ مما کی موجودگی کے باعث کچھ کہنے سے گریز برتا۔

"نہیں مما اس کی کیا ضرورت ہے، اب ٹائم ہے بھی کہاں، میرے پاس بے شمار جوڑے پڑے ہیں جنہیں ایک بار بھی نہیں پہنا، میں انہی میں سے کوئی پہن لوں گی۔" پرنیاں معاذ کے چہرے کے سرد تاثرات دیکھ چکی تھی جبھی گڑبڑا کر کہہ رہی تھی مگر مما کو ہرگز بھی اس سے اتفاق نہیں ہوا تھا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے گھر سے اٹھا کر پہننے کی، ابھی ہماری فلائیٹ میں بہت وقت ہے، آپ آرام سے مارکیٹ سے ہو کر آ سکتے ہو، کیوں معاذ بیٹے؟" مما نے بات کے آخر میں اسے بھی شامل گفتگو کیا تو پرنیاں سخت خائف سے انداز میں سر جھکائے انگلیاں چٹخانے لگی۔

"جی کیوں نہیں، میں آپ سے اختلاف رائے کی جرأت کہاں رکھتا ہوں، آپ کا حکم سر آنکھوں پہ، یہ میری شرٹ پکڑا دیجئے براہ کرم۔" اس کا لہجہ بے پناہ سرد تھا جسے مما نے اپنے دھیان میں محسوس نہیں کیا،

وہ تو شاید اس کے اتنی آسانی سے مان جانے پہ ہی، مطمئن ہو گئی تھیں اور معاذ کی آخری بات شاید انہوں نے سنی ہی نہ تھی، تب پرنیاں کو آگے بڑھ کر اس کی شرٹ اٹھا کر اسے دینا پڑی، جسے معاذ نے نہایت تنفر بھرے جھٹکے سے اس سے جھپٹا تھا۔

"میرا ناشتہ یہاں بھجوا دیجئے گا مما! گیارہ بج رہے ہیں مگر ابھی کسی کو خیال تک نہیں آ سکا کہ میں بھوکا ہوں۔" اس نے باہر نکلتیں مما کو کم پرنیاں کو زیادہ سنایا تھا، وہ اتنا گڑبڑائی کہ تقریباً پلٹ کر بھاگنے کے انداز میں باہر بھاگی تھی، اگلے پندرہ منٹ میں وہ ناشتے کی ٹرے سمیت حاضر تھی، تب بھی معاذ کا موڈ سوا نیزے پر ہی تھا۔

"یہ اچھل کود، آپ پہ زیب نہیں دیتی، اب محترمہ کم از کم اگلے سات آٹھ مہینے آپ کو بے حد احتیاط کی ضرورت ہے، اس کے بعد......"

"اس کے بعد میں جہنم میں جاؤں مروں یا جیوں آپ کو کوئی غرض نہیں، کہنے کی ضرورت نہیں مجھے خود سے معلوم ہے۔" پرنیاں نے اس کی بات قطع کر دی تھی، معاذ نے اس کے شدت جذب سے سرخ پڑتے چہرے کو طنزیہ نظروں سے دیکھا پھر زہر خند سے مسکرا دیا۔

"ماشاء اللہ آپ کی ذہانت کا تو میں قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔" پرنیاں نے جلتے ہوئے چہرے کو پھیر لیا اور آگے بڑھ کر وارڈروب کے کپڑے دوبارہ تہہ لگا کر اس میں رکھنے لگی، معاذ نے اطمینان سے ناشتہ کیا تھا، پھر اٹھتے ہوئے اسے ایک نظر دیکھا۔

"تم نے کچھ کھایا؟" پرنیاں بری طرح سے چونکی پھر جواب میں کچھ کہے بغیر اپنے کام میں مشغول ہو گئی تھی۔

"مما پرنیاں نے صبح دودھ لیا تھا؟" وہ انٹرکام پہ مما سے رابطہ قائم کر چکا تھا، پرنیاں بری طرح سے جز بز ہو گئی، پتہ نہیں مما کیا جواب دیتیں، حقیقت یہ تھی کہ اس نے دودھ پیا تھا نہ جوس۔

"اور جوس؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"اوکے میں بھیجتا ہوں اسے، ناشتہ بھی کرائیں، اس کی ڈائٹ کا آپ خود خیال رکھا کریں پلیز۔" مما نے یقیناً اس کا بھرم رکھنے کو یا جان چھڑانے کو جھوٹ بولا تھا جبھی وہ مطمئن نظر آ رہا تھا، پرنیاں نے بے اختیار سکھ بھرا سانس کھینچا۔

"جاؤ، مما بلا رہی ہیں تمہیں۔" وہ بیڈ پہ پڑا اپنا کوٹ اٹھا کر پہن رہا تھا، پرنیاں نے بحث مناسب نہیں سمجھی اور خاموشی سے نکل گئی تھی، معاذ گاڑی کی چابی اٹھائے مارکیٹ کے لئے نکل گیا، پھر ایک گھنٹے کی خواری کے بعد وہ ساڑھی اس کی میچنگ جیولری اور سینڈل لے کر گھر پہنچا تو پرنیاں سے اس کا ٹکراؤ سیڑھیوں پہ ہی ہو گیا تھا، اس کے بازوؤں کے گھیرے میں بڑا سا ڈبہ تھا اور چہرے پہ دبا دبا جوش۔

"کہاں جا رہی ہو؟" وہ اسے دیکھ کر خائف ہوئی تھی معاذ نے مزید خائف کر دیا۔

"مما کے پاس، ایکچوئیلی ان کی پسند کی ساڑھی مل گئی ہے نا، بیڈ کے نیچے دھکیل دیا تھا کسی نے اس کو، میں نے ڈھونڈ لی۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے اس کارنامے کو مما کے سامنے بیان کرنے کی، وہیں رکھو اسے لے جا کر اور اسے پہنوں پاگل نہیں تھا میں جو جوتے گھسا کر خوار ہو کے ایجنسی میں لے کر آیا ہوں۔" اس نے

ڈبا چھین کر اپنے ہاتھ میں موجود شاپنگ بیگ اسے تھماتے، وہ اس کے بجھتے چہرے پہ نگاہ ڈالے بغیر سیڑھیاں چڑھ گیا، پرنیاں سرد آہ بھر کے رہ گئی تھی۔

☆☆☆

کبھی غم کی آگ میں جل اٹھے
کبھی داغ دل نے جلا دیا
اے جنون عشق بتا ذرا
مجھے کیوں تماشا بنا دیا
کبھی اشک پلکوں پہ رک گئے
کبھی پورا دریا بہا دیا
ابھی کر رہا ہے وہ ابتداء
میرا کچھ رہا ہے تجربہ
اسے زندگی کی ہے آرزو
مجھے زندگی نے مٹا دیا

اس کی بند پلکیں آنسو پروتی تھیں، ساری رات بھی کچھ ایسے ہی اضطراب اور وحشت کی نظر ہو گئی تھی، اس کی شادی کی ہر تقریب ایسی شاندار تھی کہ ان کی سوسائٹی میں شاید ہی کسی اور کی ایسی شادی منعقد کی گئی ہو اس سے پہلے، مہندی کا جوڑا اسی نے جوڑا زیب تن کیا تھا اس کی قیمت ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں تھی، مسز آفریدی کا بس نہیں چلتا تھا اس کے قدموں میں ساری دنیا کی دولت نچھاور کر دیں، مگر کتنی لاچار تھیں وہ کہ اس دولت سے اس کے لئے آسودگی اور خوشی نہیں خرید سکی تھیں، وہ ساری رات جاگی تھی، وہ ساری رات روتی تھی، سیل فون اس کے سرہانے پڑا رہا تھا بالکل خاموش، حالانکہ اسے آج کی رات کتنا انتظار رہا تھا کوئی اسے یاد کرے، چاہے وہ نیلما ہو چاہے جہان، کتنی عجیب اور تشنہ تھیں اس کی سب خواہشیں اور اسی قدر بے چاری سی، اسے خود اپنی خواہشوں پہ ترس سا آنے لگا، جہان کے بارے میں تو وہ خوش فہمی میں کم ہی مبتلا تھی مگر نیلما...... اس سے تو اس کا ٹھہرا خونی اور قلبی تعلق تھا، وہ بھی پتہ نہیں کیوں اسے فراموش کر گئی تھی، آج کے اس اہم دن جبکہ وہ زندگی میں پہلی بار خود اس کی پیش رفعت کی خواہش مند تھی، اس کی آنکھیں پھر سے گرم سیال بہانے لگیں، دروازے پہ آہٹ ہوئی پھر کوئی اندر آ گیا، بنا دیکھے بھی وہ جان سکتی تھی آنے والی مسز آفریدی ہیں، اس کا اندازہ ہرگز غلط نہیں تھا۔

"ہنی اٹھو بیٹے! اور کتنا سوؤ گی؟ بیوٹیشن آ چکی ہے، ہاتھ لے کر ناشتہ کر لو، بارہ بج چکے ہیں، پھر آپ کو تیار بھی ہونا ہے۔" انہوں نے اس کے پہلو میں بیٹھ کر کمبل ذرا سا سرکایا اور اس کے ریشمی بالوں میں پیار بھرے انداز میں انگلیاں چلائیں، اس کے ہونٹوں پہ عجیب سی مسکراہٹ بکھر گئی، یہ لاہور کی سب سے مہنگی اور بد دماغ بیوٹیشن تھی جس سے کئی مہینے قبل باقاعدہ اپائنٹمنٹ لی جاتی تھی، مگر وہ یہاں اس کے گھر آ کے اس کی منتظر بیٹھی تھی، سب پیسے کا کمال تھا۔

"مجھے ناشتہ نہیں کرنا ممی! آپ میرے کپڑے نکلوا دیں بس۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی، بارہ بج گئے تھے، اس کے دل کے مکیں کے آنے کا ٹائم ہو رہا تھا، وہ اس کی آمد سے بہت پہلے اپنی تیاری مکمل کر کے اس کی

راہوں میں پلکیں بچھا دینا چاہتی تھی، وہ فرمانبردار تھا اور اس کی حیثیت ایک داسی کی، جس پہ وہ چاہتا تو نگاہ ڈالتا چاہتا تو بے نیازی سے آگے بڑھ جاتا، داسی کا کام خدمت گزاری ہوتا ہے، شکایت نہیں، مسز آفریدی نے اس کے اس یکسر بدلے ہوئے انداز کو کچھ حیرت کچھ خوشگواری کے عالم میں چونک کر دیکھا، ان کا خدشہ بے بنیاد تھا کہ وہ روئیگی چیخے گی اور ان پہ ہمیشہ کی طرح الزامات کی بھرمار کرے گی۔

"بہت خوش ہونا میری جان؟" انہوں نے اس کی پیشانی کو بے حد محبت سے چوما، ژالے کی آنکھوں میں نمی اُمڈ آئی۔

(خوشی شاید میری قسمت میں نہیں لکھی گئی۔)

اس نے سر جھکا لیا تھا، مسز آفریدی نے زبردستی اسے ناشتہ کرایا تھا، جو چند گھونٹ فریش جوس اور آدھے ابلے ہوئے انڈے پہ مشتمل تھا۔

"میرا کچھ کھانے کو دل نہیں کر رہا مما پلیز۔" ان کے اصرار پہ اس نے بے حد عاجزی سے کہا تھا، ہاتھ لینے کے بعد وہ بیوٹیشن کے آگے آ کر بیٹھ گئی تھی، اس کا عروسی جوڑا دھنک کے سب رنگوں سے سجا تھا، جس کی چمک دمک سے نگاہیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں، میچنگ جیولری اور پھولوں کے گہنوں نے اس کی تیاری کو فائنل ٹچ دیا تو اس کی شعاعیں بکھیرتا ہوا حسن ایکدم سے جگمگا اٹھا تھا، مسز آفریدی نے اس کی بار بار نظر اتاری تھی پھر اس کے بعد وہ اپنے مہمانوں کے جلو میں بہت شان سے اسے لے کر میرج ہال کی سمت روانہ ہوئیں تھیں تو بارات ابھی پہنچی نہیں تھی، مزید دو گھنٹے انتظار کے بعد بارات کی آمد ہوئی تھی، تب ژالے کا اب تک مختلف خدشات کے ہمراہ ڈوبتا دل قرار پکڑ سکا تھا، سب سے پہلے اس کے پاس پرنیاں اور بھابھی کے ساتھ نوریہ آئی تھیں تینوں نے باری باری اسے گلے لگا کر پیار کیا اور بے ساختہ تعریف کی تھی، میرون بنارسی ساڑھی جس کی کناری گولڈن کلر کی تھی پہنے پرنیاں سب سے پیاری لگ رہی تھی۔

"آپ کو مبارک ہو پری بھابھی۔" جس وقت پرنیاں اس کے گلے مل رہی تھی، ژالے نے آہستگی سے مسکرا کر کہا تھا۔

"کس بات کی مبارک؟ یہ تو ہمیں تمہیں دینی چاہیے اتنا شاندار اور باکمال دولہا مل رہا ہے تمہیں۔" پرنیاں مسکرائی تھی، جبکہ بھابھی نے قہقہہ لگایا تھا۔

"جیسی مبارک تمہیں ژالے دے رہی ہے پری، یہ مبارک ہم اسے انشاء اللہ ایک ڈیڑھ مہینے بعد دیں گے، یعنی پریگنینسی کی مبارک۔" بھابھی کی وضاحت پہ صرف پرنیاں نہیں جھینپی، ژالے بھی کانوں کی لوؤں تک سرخ پڑ گئی تھی، اس کے دلربا چہرے پہ حیا کی سرخی کا یہ تاثر اتنا بھرپور اور دلکش لگا تھا کہ وہ تینوں کچھ دیر کو نگاہ نہیں ہٹا سکی تھیں۔

"ہمیں پھر سے اعتراف کرنا پڑے گا کہ جہان کی پسند لاجواب ہی نہیں بے مثال بھی ہے ناٹ ڈاؤٹ۔" بھابھی نے بے ساختہ قسم کی تعریف کی تھی، جس نے ژالے کے چہرے کی چمک دمک چھین کر تاریکی بھر دی، اس نے شکستہ سے انداز میں سر جھکا لیا تھا، گویا تاثرات محفوظ رکھنے چاہے، پرنیاں بھابھی کی تائید کر رہی تھی پھر مسکرا کر گویا ہوئی۔

"جہان بھائی بھی آج بالکل پرنس لگ رہے ہیں، ماشاء اللہ بہت پیاری جوڑی ہے۔"

''ہاں بالکل جیسے تمہاری اور معاذ کی، شاہ ہاؤس میں یہ دو جوڑیاں ہی تو چندے آفتاب چندے ماہتاب ہیں، پرفیکٹ ہر لحاظ سے ایک دوسرے کے لئے بنے ہو جیسے۔'' بھابھی کے لہجے میں خلوص بھی تھا اور محبت بھی، اب خاموش ہونے اور سر جھکانے کی باری پرنیاں کی تھی، پھر جس پل ژالے کو لا کر جہان کے مقابل اسٹیج پہ بٹھایا گیا تو وہاں بے حد گہما گہمی تھی، مسز آفریدی نے اپنی فتح کو آج مکمل ہوتے دیکھا تھا، وائیٹ پینٹ کوٹ میں ملبوس وہ اونچا پورا بے حد وجیہہ بے حد شاندار لڑکا آج ان کی بیٹی کو لینے آ پہنچا تھا، اس سے بڑھ کر بھی کوئی فتح کوئی خوشی ہو سکتی تھی؟ گو کہ وہ انہیں ہرگز خوش نہیں لگتا تھا، گو کہ اس نے نگاہ بھر کے بھی ان کی پریوں جیسی نازک اور حسین بیٹی کو نہیں دیکھا تھا مگر کیا فرق پڑتا تھا، پھر وہ حسین بھی تو بہت تھا، پڑھا لکھا ویل ڈریسڈ اور سب سے بڑھ کے ان کی بیٹی کا من پسند، اتنے نخرے تو برداشت کرنے ہی پڑتے ہیں، خاندان بھر کیا ان کو یقین تھا پورے لاہور شہر میں کسی کو ایسا داماد نہیں ملا تھا، ان کی بیٹی تو خوشی ہو گئی تھی نا اور کیا چاہیے، جہان بھی کب تک اسے نظر انداز کرتا؟ انہیں اپنی بیٹی کے بے مثال حسن پہ بہت بھروسہ اور غرور تھا، وہ بہت تمکنت اور غرور سے اٹھی تھیں اور جہان کو سلامی دینے اسٹیج پہ آ گئیں، پرنیاں نے احتراماً ان کے لئے اپنی جگہ خالی کر دی، لیکن جب انہوں نے سلامی میں ایک کروڑ کا چیک اور پراڈو کی چابی جہان کو پیش کی تو جہان نے نہایت رکھائی سے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

''یہ بھلا کیا بات ہوئی، جہانگیر بیٹے؟ یہ میں اپنی خوشی سے دے رہی ہوں۔'' وہ سخت جز بز ہوئی تھیں۔

''مجھے آپ کی خوشی چاہیے نہ کچھ اور، شکر ادا کریں کہ آپ کی بیٹی کو رخصت کرانے آ گیا ہوں۔'' وہ جواباً پھنکارا تھا، مسز آفریدی کا رنگ بالکل سفید پڑ گیا، جہان کے چہرے پہ اتنی رعونت اس درجہ حقارت تھی کہ معاذ بھی ششدر رہ گیا تھا، گو کہ اسٹیج پہ اس وقت معاذ کے علاوہ ژالے اور مسز آفریدی ہی تھیں اس کے باوجود معاذ کچھ خائف سا ہو کر رہ گیا تھا، اس نے بے اختیار جہان کے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کر کچھ کہنا چاہا تھا کہ جہان نے اسی شدید موڈ میں ہاتھ اٹھا کر نہ صرف اسے کچھ کہنے سے باز رکھا بلکہ قطعیت بھرے انداز میں بولا تھا۔

''انہیں کہہ دو معاذ کہ میرا ضبط مزید نہ آزمائیں، ورنہ شاید میں ہر لحاظ بھول جاؤں، بعد کے حالات کی ساری ذمہ داری انہی کی ہو گی۔'' اس کا لہجہ شدت ضبط کے باوجود بھنچا ہوا تھا، چہرے کے تاثرات میں اتنی برودت اتنی تلخی تھی کہ معاذ کو لگا اس کا ضبط واقعی عنقریب جواب دے جائے گا، مسز آفریدی کا سارا طنطنہ بھی جیسے جھاگ بن کر بیٹھ چکا تھا، وہ فق چہرے کے ساتھ ٹکر ٹکر جہان کی شکل دیکھ رہی تھیں، معاذ نے ان سے دھیان ہٹا کر مضطرب نگاہوں سے ژالے کو دیکھا، اس کی رنگت متغیر تھی اور آنکھیں کسی بھی پل برس پڑنے کو تیار بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ وہ اس درجہ تکی پہ پتھرائی ہوئی سی نظر آئی تھی۔

''کام ڈاؤن بے ریلیکس، کیا ہو گیا ہے یار؟'' معاذ نے ایک بار پھر جہان کا کاندھا تھپکا تھا، وہ لال بھبھوکا چہرے کے ساتھ ہونٹ بھینچے دوسری سمت دیکھتا رہا، مسز آفریدی کب کی اسٹیج سے اتر کر جا چکی تھیں، معاذ ٹھنڈا سانس بھر کے رہ گیا تھا۔

☆☆☆

زمیں پہ چل نہ سکا آسماں سے بھی گیا
کٹا کے پر وہ پرندہ اڑان سے بھی گیا
بھلا دیا تو بھلانے کی انتہا کر دی
اب میں اس شخص کو وہم و گمان سے بھی گیا
کسی کے ہاتھ سے نکلا ہوا تیر ہوں میں
جو ہدف کو چھو نہ سکا کمان سے بھی گیا
تباہ کر گئی مجھے پکے مکان کی خواہش
میں اپنے گاؤں کے کچے مکان سے بھی گیا
پرائی آگ میں کودا تو کیا ملا تجھ کو
اسے بچا نہ سکا اور اپنی جان سے بھی گیا

جہان کے رویے کے برعکس اسے ہر جگہ ہر مقام پہ اس عزت وقار اور پذیرائی سے نوازا گیا تھا، جو اس کے رشتے کا تقاضا تھا، اسے رخصت کرا کے لاہور والے بنگلے میں ہی لایا گیا تھا، یہاں بھی مکان کی آرائش ہوئی تھی، اس کا بیڈ روم تو خاص طور پہ بہت آرٹسٹک انداز میں ڈیکوریٹڈ کیا گیا تھا، مختلف رسموں کی ادائیگی کے بعد ژالے کو بیڈ روم میں پہنچا دیا گیا تھا، جہان کے رویئے نے اسے بہت خائف کر دیا تھا اس سے رسموں کے دوران جب ساری اس کی کزنز اس سے چھیڑ چھاڑ کرتی رہی تھیں، تو ژالے اس خیال سے ہولتی رہی تھی کہ وہ بھڑک کر کسی کو کچھ کہہ نہ دے مگر خیریت گزری تھی، کمرے میں آ کر اسے سمجھ نہیں آ سکی تھی وہ پھولوں بھری اس سیج پہ بیٹھ کر اس کا انتظار کرے یا پھر لباس تبدیل کر لے، کس بات سے مزاج برہم ہو گا وہ وہی نہیں کرنا چاہتی تھی، بہت سوچنے کے بعد وہ اسی فیصلے پہ پہنچی تھی کہ اسے لباس تبدیل کر لینا چاہیے، اب تک جو جہان کا رویہ تھا بہرحال وہ اس بات کا متقاضی نہیں تھا کہ وہ اس سے کسی تعریف وغیرہ کی خوش فہمی کو پالتی، اس نے گہرا سانس بھرا اور ایک ایک کر کے وہیں بیٹھے تمام زیور اتارنے لگی، اس کے بعد دوپٹے سے پنیں نکالنے کا مشکل مرحلہ درپیش ہوا تھا، جس میں اسے پندرہ سے بیس منٹ لگے تھے، دوپٹے کو سر سے الگ کر کے اس نے بے دلی سے صوفے پہ اچھالا اور زیورات کے ڈھیر پہ دھیان دیئے بنا اٹھ کر بیڈ سے نیچے اتر گئی، ابھی پہلے سے دوسرا قدم اٹھایا تھا کہ دروازہ کھول کر جہان نے اندر قدم رکھا، وہ جہاں تھی اسی زاویے پہ ساکن ہو گئی، جہان اس کے سامنے آیا تو اسے اپنی پوزیشن کا خیال آیا تھا، پہلے گھبر کر دونوں بازو سینے پہ لپیٹے پھر آگے بڑھ کر دوپٹہ اٹھایا تھا۔

''کیا ثابت کرنا چاہتی ہو مجھ پہ کہ تم بہت پارسا ہو، بہت شرم و حیا ہے تمہارے اندر؟'' جہان کی نظروں میں تپش تھی اور لہجے میں گویا کسی برچھی کی کاٹ، ژالے کا چہرہ سرخ پڑ گیا، اس کا دوپٹہ بار بار سرکتا تھا جسے وہ سنبھالنے کی کوشش میں ہلکان تھی، جہان نے ایک جھٹکے سے دوپٹہ کھینچ لیا۔

''اتنی جلدی اپنی آرائش کے آثار مٹا دیئے، داد وصول کیے بغیر ہی؟'' وہ پھر پھنکارا، ژالے پھر چپ رہی، جہان کو اس کی اسی ڈپلومیٹک خاموشی نے آگ لگائی تھی۔

''معصومیت کے اس ڈھونگ کو ختم کرو سنا تم نے، کیا کہتی تھیں اپنی ماں کو جا کر کہ میری خدمتیں کر کے آئی ہو، کوئی عورت کسی مرد کی کیسی خدمت کرتی ہے جانتی ہو تم؟'' وہ اس کی موتیے کی کلیوں سے

گندھی ہوئی چوٹی پکڑ کر ایک جھٹکے سے اپنے مقابل کھینچتے ہوئے حلق کے بل غرایا تھا، ژالے کی آنکھیں تکلیف اور سبکی کے احساس سے برس پڑیں، مگر اس نے ہونٹوں کو سختی سے بھینچے رکھا تھا، جہان کو ان آنسوؤں نے جیسے آگ لگادی تھی، اس نے ایک کے بعد دوسرا بھرپور اور شدید طمانچہ انتہائی جارحانہ موڈ میں اس کے چہرے پہ برسایا تھا، پھر حقارت بھرے انداز میں اسے زور سے جھٹک دیا۔

''اپنی ماں کو بتا دینا جا کر کہ میں تمہیں اس خدمت کے قابل نہیں سمجھتا، صرف ابھی نہیں ساری عمر، تم اور تمہاری چالباز ماں ساری عمر مجھ سے اس خیرات کی بھیک بھی مانگو گی تو ایک سکہ ہیں ملے گا، یہی سزا ہے تمہاری گھٹیا پلاننگ کی، اب بیٹھ کر اپنی کامیابی کا جشن مناؤ یا پھر ماتم کرو، آئی ڈونٹ کیئر۔'' وہ اپنی بات مکمل کر کے اسی فیصلے اور قہر بھرے انداز میں پلٹ کر کمرے سے نکل گیا، ژالے وہیں گری آنسو بہاتی اور سسکتی رہی تھی۔

☆☆☆

جہان صبح اس وقت بیڈروم میں واپس آیا تھا جب فجر کی اذان کی پہلی پکار فضا میں گونجی تھی، اس کی آنکھوں میں بے تحاشا جلن تھی، جو ژالے کو جائے نماز پہ موجود پا کر کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی، سی گرین دوپٹے کے ہالے میں اس کا صبح کی تازگی لئے اجلا چہرا جس پہ بے تحاشا حسن آنکھوں کا سحر بے حد اہم تھا مگر یہ جہان پہ اثر انداز ہونے والا نہیں تھا، پتہ نہیں ژالے نے اس کی آمد کو محسوس کیا یا نہیں وہ قطعی نہیں سمجھ پایا تھا، لباس تبدیل کر کے ہاتھ لیتے اور کھدر کے سفید کرتا شلوار میں نماز کے لئے جانے تک اس کی جتنی بار بھی اس کی سمت نگاہ اٹھی وہ اسے اسی پوزیشن میں نظر آئی تھی، مسجد میں نماز کی ادائیگی کے بعد اس نے دعا کو ہاتھ بلند کیے تو سسکتی ہوئی زینب نگاہوں میں آن سمائی تھی۔

''تیمور نہیں آئے ہیں مما! وہ آئیں گے بھی نہیں، انہوں نے مجھے پہلے یہ صاف منع کر دیا تھا۔'' وہ مما کی گود میں سر رکھے کتنی نڈھال سی کہہ رہی تھی، مما کے پاس جیسے اس کی بات کے جواب میں کہنے کو کچھ نہیں تھا، وہ تو اسے یہ بھی نہیں بتا سکی تھیں کہ پپانے خود کال کی تھی تیمور کو اور آنے کی گزارش کی تھی مگر وہ معذرت کر چکا تھا، پھر اس کے بعد کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہ گئی تھی۔

ایک بار پھر غیر ارادی طور پہ سہی مگر وہ اس کے دکھوں سے آشنا ہو گیا تھا، ژالے کے ساتھ جو بھی سلوک تھا اس کا اس میں لاشعوری طور پہ اس اضطراب کا بھی حصہ تھا، وہ مضمحل سا واپس لوٹا تو ژالے کمرے میں خواتین میں گھری ہوئی تھی، جہان اپنے خیال میں تھا اسی وقت واپسی کو پلٹا تو پرنیاں نے تیزی سے اسے پکار لیا تھا۔

''کہاں جا رہے ہیں جہان بھائی! آیئے نا یہاں آپ کا ہی انتظار ہو رہا ہے ناشتے کے لئے۔'' جہان تھم گیا تھا، البتہ پلٹ کر نہیں دیکھا، اس کی اسی حرکت پہ بھابھی نے گرفت کر لی تھی۔

''اتنا شرما کیوں رہے ہو جہان، بھئی یہ دلہن ہے تمہاری۔''

''شرم تو لوگ بڑے بڑے گناہ کرنے کے بعد بھی نہیں کرتے، الحمدللہ میں نے کسی کے ساتھ دغا بازی کی نہ ہی بددیانتی۔'' جہان نے اپنے ازلی اعتماد کے ساتھ جواب دیا تھا، نگاہ محض ایک لمحے کو ژالے کی سمت اٹھی تھی جس میں بلا کی کاٹ تھی۔

''تمہاری دلہن بہت کم گو اور شائی لگتی ہے، تمہاری طرح گہری بھی بہت ہے، ہمیں رونمائی گفٹ

تک کا نہیں بتایا۔'' بھابھی نے پتہ نہیں تعریف کی تھی یا تنقید وہ سمجھ نہیں سکا، ان لوگوں کے جانے کے بعد وہ پہننے کے لئے اپنے کپڑے نکالنے لگا، اس کا کچھ دیر قبل اتار کر رکھا ہوا کوٹ اب ہینگر میں لٹک رہا تھا، جہان نے اسے ہینگر سے نکال کر جھٹکا اور تہہ لگا کر بیگ میں رکھنے کا ارادہ کیا تھا کہ اس کی پاکٹ سے کوئی چیز نکل کر لڑھکتی ہوئی پرے جا گری، جہان نے کچھ حیرانی کے عالم میں اپنی نگاہ کو اٹھایا تھا اور گہرا سانس بھر کے رہ گیا، وہ وہی پلاٹینم کی رنگ تھی جو جہان نے مما کے بے حد اصرار پہ رونمائی کے لئے خریدی تھی، وہ رنگ مما نے بارات کے دن اس کے کوٹ کی جیب میں اس کے سامنے ڈالی تھی ساتھ میں تاکید بھی کی تھی کہ وہ لازمی ژالے کو پہنا دے، جہان کے کوٹ جھٹکنے پہ یہ ہی رنگ تھی جو اس طرح نکل کر گری تھی، گرنے کے باعث اس کا دل شیپ نازک سا کیس کھل گیا تھا اور انگوٹھی لڑھکتی ہوئی جا کر رک گئی تھی، جہان نے ہونٹ بھینچ کر جبکہ ژالے نے کچھ تحیر کے عالم میں نگاہ اٹھائی تھی، دونوں کی نظریں غیر ارادی طور پہ ملی تھیں، جہان نے بدمزگی کے احساس سمیت نگاہ کا زاویہ بدلنے میں پہل کی اور رخ پھیر کر بے نیازی سے اپنا کام کرنے لگا، ژالے آہستگی سے جھکی تھی اور اس رنگ کو اٹھا کر اس کے کیس میں رکھا تھا پھر لا کر جہان کے سامنے کر دی۔

''یہ لیجئے۔'' جہان نے چونک کر کسی قدر حیرانی سے اس کے ہاتھ میں موجود رنگ کو پھر اسے دیکھا تھا، نہ کوئی طنطنہ نہ غرور کا کوئی احساس اس کا انداز عاجزی و فرمانبرداری لئے ہوئے، سادگی کا مظہر تھا، رات کی کسی زیادتی یا تلخی کا رنگ اس کے چہرے پہ نہیں ملتا تھا، وہ کچھ لمحوں کو ساکن رہ گیا تھا۔

''رکھ لو، تمہارے لئے ہی ہے، کوئی پوچھے رونمائی کے متعلق تو دکھا دینا۔'' اسے کہنا پڑا تھا، تمام تر نفرت یقین اور اشتعال کو ایک طرف رکھ کر، ژالے کے چہرے پہ ایک رنگ آ کر گزرا سمجھوتہ کرنے پہ مجبور ہی اس وقت ہوئی تھی جب محبت اس کی رگوں میں زہر بن کر اتر گئی تھی، پھر کہاں کی انا اور کہاں کی عزت نفس، ورنہ وہ وہی تھی جس نے نیلما سے خون کا رشتہ ہونے کے باوجود اس کی اصلیت جان کر اسے عضو بے کار کی مانند کاٹ کر پھینک دیا تھا مگر یہ ژالے وہ ژالے نہیں تھی، اس نے وہ رنگ اپنے ہاتھ کی انگلی میں پہنی تو جہان کے نام کے بعد اس کی دی انگوٹھی کو پہن کر کچھ اور بھی خوش بخت گردانا تھا خود کو۔

''تیار ہو گئے ہو نا بیٹے، آپ کی چچی جان ناشتہ لا رہی ہیں۔'' مما جان نے اندر آ کر دونوں کو باری باری پیار کیا اور دعاؤں سے نوازا تھا، ژالے بلیو کلر کے لانگ فراک میں ہلکا میک اپ کیے جیولری پہنے خاص طور پہ بے حد پیاری لگ رہی تھی، ہلکی نمی لئے بے حد سلکی بال پشت پہ گر رہے تھے۔

''نہیں مما جان! ناشتہ ہم وہیں سب کے ساتھ کریں گے، میں چچی جان کو منع کر دیتا ہوں۔'' جہان نرمی سے کہتا باہر نکل گیا۔

''بیٹے دلہن ان کنفرٹیبل فیل کرتی اس لئے......'' جہان کے منع کرنے پہ مما نے کہنا چاہا تو جہان کے ماتھے پہ ناگواری کی شکن ابھری تھی۔

''کیوں ان کنفرٹیبل فیل کریں گی وہ؟ اسے کیا اب انہی لوگوں کے ساتھ نہیں رہنا؟''

''اوہ جہان مما کا یہ مطلب نہیں تھا، ایک دن کی دلہن ہے تو......'' بھابھی نے وضاحت دینی چاہی۔

''اٹس اوکے، آپ اس بات کو لے کر پریشان نہ ہوں۔'' جہان نے اب کے نرمی سے کہا تھا پھر

پلٹ کر کچن سے نکل گیا، ناشتہ ڈائننگ ہال کی وسیع ٹیبل پہ سارے خاندان نے بیک وقت کیا تھا، ہلکے پھلکے ہنسی مذاق کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ زیاد چہک رہا تھا۔

"یار رہے پپا! اب میری باری ہے اور پلیز اب دیر ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔" زیاد کی بات پہ نوریہ کے پہلو میں بھابھی نے زور سے کہنی ماری تھی، اسے اچھو لگتے لگتے رہ گیا۔

"یہ پانی لو نوری، خیریت ہے نا؟" زیاد نے جلدی سے پانی کا گلاس بڑھایا تھا، ہال میں دبی دبی مسکراہٹیں بکھر گئیں۔

"کچھ بولیئے نا پپا؟" نوریہ کرسی گھسیٹ کر وہاں سے اٹھ گئی تو مما نے زیاد کو گھورا تھا۔

"بچی کو ڈھنگ سے ناشتہ بھی نہیں کرنے دیا آپ نے زیاد۔"

"کرے گی ناشتہ بھی، شادی تو ہو جائے، اب دیکھیں جہان بھائی اور لالے کی ہی مثال لے لیں، شادی سے پہلے دونوں بھابیاں ان سے شرماتی تھیں اور ان کے سامنے پہ گھبرا کر راہ فرار ڈھونڈا کرتی تھیں، اب کیسے اپنے اپنے میاؤں کے پہلو میں بیٹھیں ناشتے میں مصروف ہیں، اک میں بیچارا......" اس نے خود ہی اپنے اوپر جی بھر کے رحم دکھایا تھا، ژالے اور پریناں دونوں ہی کسی قدر خفیف ہو کر رہ گئیں۔

"ہمیں تو آپ کی خواہش کی تکمیل کے لئے ہرگز بھی کوئی اعتراض نہیں ہے بیٹا جانی آپ یہ سفارش اپنی پھپھو سے کیجئے بلکہ نوریہ سے، بی کوز یہ رعایت یا پھر وقت نوریہ کو ہی درکار ہے۔" پپا نے جواباً مسکرا کر کہتے اسے تسلی دی تو زیاد کھل اٹھا تھا۔

"پھپھو اور نوریہ کی تو آپ فکر نہ کریں ایسے منالوں گا انہیں آپ بس شادی کی تیاری کریں، کیوں پھپھو؟" زیاد نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا تو پھپھو آہستگی سے مسکرا دی تھیں۔

"زینب کہاں ہیں معاذ؟" جہان کی بے چین متلاشی نگاہیں کب سے اسے نہ پا کر مضطرب تھیں، بالآخر رہا نہ گیا تو اپنے ساتھ بیٹھے معاذ سے پوچھا تھا، معاذ خود بھی چونک سا گیا۔

"ہاں وہ کمرے میں ہے، بی پی نارمل نہیں تھا میں نے میڈیسن دی تھی صبح، آئی تھنک سو رہی ہو گی۔" معاذ کی نگاہ لمحہ بھر کو ژالے کے چہرے پہ ٹھہری جہاں اس تذکرے کے ساتھ ہی پھیکا پن نمایاں ہو گیا تھا، جسے معاذ نے بہت شدت سے نوٹ کیا تھا، جبھی اس نے تنہائی ملتے ہی جہان پہ گرفت کر لی تھی۔

"کیا ضرورت تھی جے تمہیں اس وقت زینب کے بارے میں سوال کرنے کی؟"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" جہان کو سخت حیرانی ہوئی تھی۔

"تمہیں بھابھی کے سامنے نہیں پوچھنا چاہیے تھا، مجھے اچھا نہیں لگا۔"

"زینب کے متعلق میرا پوچھنا یا پھر صرف ژالے کے سامنے؟" جہان کا لہجہ عجیب سی سلگن لئے ہوئے تھا، معاذ نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"پاگل مت بنو جے! جب زینب کی شادی ہوئی تھی اس وقت تمہیں کتنا خیال تھا کہ تیمور کو تمہارے حوالے سے کوئی بات بری نہ لگ جائے، اس قسم کی صورتحال اب بھی ہے، اگر تم سمجھو تو......"

"وہ لڑکی تھی معاذ اور لڑکیوں کو اپنی شادی شدہ زندگی میں بے حد محتاط رہنا چاہیے، میں کیوں یہ فکریں پالتا پھروں، زینب میری کزن ہے میں خیریت پوچھ سکتا ہوں اس کی...... دوسری اہم بات یہ کہ اس ژالے کو میری زندگی میں ہرگز اتنی اہمیت نہیں ہے کہ میں کوئی کام کرنے سے پہلے اس کے جذبات و

احساسات کی فکر پالتا پھروں۔" وہ گویا آگ برسانے لگا تھا، معاذ کو چپ ہونا پڑا تھا، جہان اسی طیش کی کیفیت میں سگریٹ سلگانے لگا۔

"گاڑی تیار ہے نا جہان بھائی! مما کہہ رہی ہیں فلائیٹ کا ٹائم ہو رہا ہے۔" تب ہی پریناں وہاں آئی تھی، ڈیپ پرپل لانگ شرٹ چوڑی پاجامہ اور بڑے سے دوپٹے میں ملبوس ساتھ میں ژالے تھی اسی سج دھج کے ساتھ۔

"جی تیار ہے، لیکن پہلے ان کے زیورات اتروائیں، میک اپ صاف کریں پھر چادر اوڑھ کر جانا ہے۔" جہان نے بات تو پریناں سے کی تھی مگر کڑی نگاہوں سے ژالے کو دیکھ کر جیسے ہمیشہ کے لئے جتلایا تھا، ژالے کی جھکی آنکھوں کی پلکیں لرز اٹھی تھیں، پریناں نے فرمانبرداری سے سر اثبات میں ہلایا۔

"جی بھائی بہت بہتر، آیئے ژالے۔" پریناں ژالے کا ہاتھ پکڑے آگے بڑھ گئی تو معاذ نے باقاعدہ سرد آہ بھری تھی اور آہستگی سے گنگنایا۔

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

جہان نے چونکتے ہوئے گردن موڑ کر حیرانی سے اسے دیکھا۔

"آئی کانٹ بلیوات کہ یہ وہی جے ہے جو صرف پولائٹ تھا کیئرنگ تھا، میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ رات بھابھی پہ آپ کے کیا کیا قہر ٹوٹے ہوں گے، بے چاری ژالے بھابھی۔"

وہ ہرگز بھی مذاق نہیں کر رہا تھا، اس کے باوجود جہان باقاعدہ کھنکارا اور اسے گھورتے ہوئے آگے بڑھ گیا کہ پپا بالائی منزل کی سیڑھیوں پہ کھڑے اسے پکار رہے تھے۔

☆☆☆

ولیمہ کی تقریب حسب روایت شاندار رہی تھی، ژالے نے ٹی پنک لہنگا زیب تن کیا تھا جبکہ اس روز جہان ہلکے بلیک پینٹ کوٹ میں ملبوس ہمیشہ کی طرح اپنی ٹھٹکا دینے والی وجاہت کے باعث ہر نگاہ کا مرکز بنا ہوا تھا، مسز آفریدی کی آمد بہت تاخیر سے ہوئی تھی اور انہوں نے آتے ہی واپسی کی جلدی مچا دی، انہیں شاید خواہ مخواہ اپنی اہمیت جتلانے کی عادت تھی مگر اس مرتبہ ان کا پالا جہان سے پڑا تھا، جوان کی بچھائی ہوئی بساط پہ محض ایک بار ان کی شاطری کے آگے پٹا تھا پھر تب سے اب تک وہ انہیں ناکوں چنے چبوا رہا تھا۔

"میری بہت ضروری میٹنگ ہے مسز شاہ پلیز ژالے کو ذرا جلدی تیار کر دیں ایک گھنٹے بعد کی میری فلائیٹ ہے۔" جہان اندر آیا تو مسز آفریدی کاندھے پہ ساڑھی کی فال کو نزاکت سے درست کرتیں، نخوت بھرے انداز میں کہہ رہی تھیں، جہان کی تیوری پہ بل پڑ گئے تھے۔

"ژالے آپ کے ساتھ نہیں جائیں گی مسز آفریدی، آپ کی میٹنگ تھی تو آپ نے یہاں آنے کی زحمت کیوں کی؟ یہ تقریب آپ کے بغیر بھی اسی خوش اسلوبی سے انجام بخیر ہو جاتی۔"

"جہان بیٹے......!" مما بری طرح سے گڑبڑائی تھیں اور اسے ٹوکنا چاہا مگر جہان نے انتہائی نرمی سے انہیں شانوں سے تھام کر اپنے ساتھ لگایا اور ہاتھ سے عاجزانہ سا اشارہ خاموش رہنے کا کیا تھا پھر مسز آفریدی کے متغیر چہرے کو دیکھ کر اسی رعونت زدہ لہجے میں گویا ہوا۔

"آپ سمجھ لیں آپ کی بیٹی پہ آپ کا اختیار ختم ہوا، آج کے بعد وہ میرے حکم کی پابند ہے، میں

چاہوں تو آپ سے ملنے بھی دوں اور چاہوں تو......"

"دس از ناٹ فیئر...... مسز شاہ دیکھ رہی ہیں آپ؟" مسز آفریدی نے حواس میں لوٹتے ہی واو... کے انداز میں کہنا چاہا تھا کہ جہان نے ایک بار پھر انہیں ٹوک دیا تھا۔

"چچی جان سے سفارش کرانے کی ضرورت نہیں ہے، یہ میرا آپ کا اور آپ کی بیٹی کا معاملہ... میرے کسی گھر والے کو آپ نے تب شامل نہیں کیا تھا یاد کریں، اب اگر آپ نے کوئی احتجاج بلند کیا... میں آپ کی بیٹی کو ہمیشہ کے لئے آپ کے ساتھ بھیجنے پہ آمادہ ہوں، کہیے منظور ہے آپ کو؟" وہ پھنکارا... مسز آفریدی کا ہی کیا مما کا بھی رنگ فق ہو گیا، انہوں نے بے اختیار سہم کر جہان کے منہ پہ اپنا لرزتا... ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"پلیز جہان بیٹے! کنٹرول یور سیلف، ریلیکس میں مسز آفریدی کو قائل کر لوں گی، آپ باہر جاؤ..." وہ ایک طرح سے گویا اس کے آگے گڑگڑائیں تھیں، جہان نے سر کو فی الفور نفی میں جنبش دی تھی۔

"ہرگز نہیں چچی جان! آپ کو کوئی ضرورت نہیں ہے ان کی منت کرنے کی۔" مما سے بات کر... گو کہ اس کا لہجہ مدھم اور مودب تھا اس کے باوجود اس کے خطرناک عزائم کا کٹیلا پن اس کے چہرے سے چھلکتا تھا۔

"میں منت نہیں کروں گی بیٹے آپ جاؤ یہاں سے یہ بزرگ ہیں اور بزرگوں سے اس طرح بات نہیں کی جاتی۔" مما بے حد عاجز ہو کر بولیں، جہان تنے ہوئے چہرے کے ساتھ ہونٹ بھینچے وہاں سے نکلا تھا تو زینب سے ٹکراؤ ہوتے ہوتے رہ گیا، سلور گرے نیٹ کے لباس میں شال اوڑھے حیران سی نظر آتی تھی، جہان نے بامشکل اپنے کشیدہ اعصاب کو کنٹرول کیا تھا۔

"معاذ بتا رہا تھا تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں؟" زینب نے کچھ چونک کر اسے دیکھا پھر دل شکستگی سے سر جھٹک دیا۔

"ان باتوں کو چھوڑیں جے یہ بتائیں آپ کا ژالے کی مما سے کوئی جھگڑا ہے؟" جہان نے بے اختیار نظر چرا لی۔

"نہیں، بس نظریاتی اختلاف ہے تھوڑا سا۔" اپنی بات کہہ کر وہ آگے بڑھا تو زینب نے ہونٹ بھینچ لئے تھے۔

(نظریاتی اختلاف سے ہی تو سارا بگاڑ شروع ہوتا ہے جے، مجھ سے پوچھو اس بگاڑ اور نقصان کی تفصیلات) وہ بے حد ملول سی سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

سر جھکائے بیٹھی وہ ہاتھ میں پہنی انگوٹھی کو بے خیالی میں بار بار چھو رہی تھی، ابھی کچھ دیر قبل اس نے ولیمہ کا لباس بدلا تھا اور ہلکے کام کا شیفون کا ہلکا اورنج سوٹ پہنا تھا، مسز آفریدی اس سے ملنے آئیں تو ان کا موڈ بے حد آف تھا۔

"وہ خود کو کچھ سمجھنے لگا ہے، مگر مجھے جانتا نہیں ہے میں......"

"پلیز ممی! بس کر دیں اب اور مجھے ہرگز پسند نہیں ہے یہ بات کہ آپ میرے ہزبینڈ کا ذکر اتنے برے انداز میں کریں۔" اس نے کس قدر ناگواری سے کہا تھا اور مسز آفریدی کی آنکھیں پھٹ سی گئی

تھیں۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے؟ اتنا سر پہ بٹھاؤ گی تو وہ تمہیں جوتے کی نوک پہ ہی رکھے گا، صرف تمہیں نہیں ساتھ مجھے بھی۔"

"مجھے اعتراض نہیں ہے، یہ آپ کی ہی لگائی ہوئی آگ ہے جس میں مجھے جلنا پڑ رہا ہے مگر میں چپ چاپ برداشت کر رہی ہوں اس لئے کہ مجھے گوارا نہیں ہے کہ اپنی ماں کے عیبوں سے پردہ اٹھا دوں۔" جواباً وہ بھی پھٹ پڑی تھی، اس کی آنکھوں میں لرزتے آنسوؤں نے مسز آفریدی کو بھونچکا کر کے رکھ دیا تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ جہانگیر نے رات مس بی ہیو کیا ہے تمہارے ساتھ؟ بتاؤ مجھے، میں ابھی سب کو......"

"ممی پلیز انف...... یہ آپ کی بیٹی کا سسرال ہے، آپ کی راجدھانی نہیں ہے، کچھ تو خیال کریں۔" اس نے ان کی بات قطع کر کے بے حد شاکی ہو کر کہا تھا، جس کے جواب میں مسز آفریدی اسے گھورنے لگیں۔

"سسرال ہے تو کیا ڈر جاؤں؟ بچا نہیں ہے تمہیں سمجھیں۔"

"اس سے کچھ کم بھی نہیں کیا، بس رہنے ہی دیں اب۔" وہ جیسے رو سی پڑی تھی، مسز آفریدی جیسے نہیں اس مقام پہ آ کے ہار گئیں، اسے گلے لگایا تھا پھر گلوگیر آواز میں بولی تھیں۔

"وہ تمہیں مجھے اپنے ساتھ نہیں لے جانے دے رہا۔"

"کون...... شاہ؟" ژالے حیران ہوئی، مسز آفریدی نے محض سر کو اثبات میں جنبش دی تھی۔

"ابھی وہ غصے میں ہیں ممی! میں کچھ دن بعد آپ سے ملنے آؤں گی، ڈونٹ وری۔" اس نے آہستگی و نرمی کے ساتھ انہیں تسلی دی۔

"ٹھیک ہے بیٹے! مگر اسے زیادہ سر پہ چڑھانے کی ضرورت نہیں ہے، تم ہر لحاظ سے اس سے برتر ہو، حسن جائیداد وغیرہ۔" ژالے نے کسی کرب سے گزر کر ہونٹ کو کاٹا تھا، مسز آفریدی کے جانے کے بعد سے وہ ایسے ہی بیٹھی تھی، کچھ اداس کچھ ملول سی۔

"ژالے کپڑے بدل بھی لئے گڑیا؟" اسے پتہ ہی نہ چلا کب بھابھی اندر آ گئیں، وہ زور سے چونکی تھی پھر بے دلی سے مسکرائی۔

"جی ایکچوئلی بہت بھاری تھے کپڑے پھر تقریب بھی تو ختم ہو گئی تھی۔" اس کے لہجے میں مخصوص قسم کا بھولپن اور سادگی تھی، بھابھی بے ساختہ مسکرا دیں۔

"لیکن ابھی جہان نے تمہیں اس لباس میں سراہا تھوڑی تھا، پگلی شوہر کی ستائش پائے بغیر ہی اتنا اچھا جوڑا اتار پھینکا۔" ان کی بات پہ ژالے کے چہرے کی رنگت بدل سی گئی تھی، اس نے فی الفور سر کو جھکا دیا، اسے قطعی سمجھ نہیں آ سکی اس مقام پہ اسے کیا کہنا چاہیے تھا۔

"چلو خیر اب اداس ہونے کی ضرورت نہیں، تم اتنی انوسینٹ ہو کہ سراہنے پیار کرنے کے لئے کس آرائش کی ضرورت تو ہے ہی نہیں، میں تمہیں بلانے آئی تھی، وہاں ہال میں بہت اچھی محفل جمی ہوئی ہے، بس تمہاری کمی ہے۔" بھابھی اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آئی تھیں، ہال کمرے میں واقعی بے حد رونق تھی،

نوجوان پارٹی وہیں جمع تھی اور بات بات پہ قہقہے پھوٹتے تھے، جہان سامنے ہی صوفے پہ ترچھے زاوے سے بیٹھا ہوا تھا، ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بے حد مغرور مگر بے نیاز قسم کا انداز تھا، اس کے ساتھ معاذ تھا یا زیاد۔

''آیئے بھابھی! یہاں اپنے صاحب بہادر کے ساتھ تشریف رکھیے۔'' زیاد اسے دیکھتے ہی اٹھا تو ژالے نے بے اختیار ٹوک دیا۔

''نہیں بھائی آپ بیٹھے رہیں، میں یہاں پرنیاں جی کے ساتھ بیٹھ رہی ہوں۔'' وہ اپنے مخصوص نرم اور مودب انداز میں کہہ کر نیچے کارپٹ پہ نوریہ اور پرنیاں کے درمیان خالی جگہ پہ آن بیٹھی پرنیاں نے اسے کشن دیا تھا جسے اس نے گود میں رکھ لیا تھا، زیاد ٹھنڈا سانس بھر کے رہ گیا۔

''یعنی طے ہوا کہ آپ میں کمال کی انڈراسٹینڈنگ پیدا ہوگئی ایک ہی رات میں، ایک ہی رات میں آپ دونوں نے یہ بھی پلاننگ کرلی کہ میرے اور میری فیانسی کے درمیان ظالم سماج کا کردار ادا کریں گی۔'' زیاد کی زبان کے آگے تو گویا خندق تھی، وہ بولنے پہ آیا تو یہ بھی نہیں دیکھا کہ ژالے اس کی ان فضول باتوں سے کس حد تک گھبرائی یا حواس باختہ ہوئی۔

''ج...... جی!'' ژالے نے ٹپٹا کر پہلے زیاد پھر جہان کو دیکھا تھا جو اسی مخصوص قسم کی سنجیدگی کے حصار میں تھا۔

''افوہ بہت بدتمیز ہو زیاد، پریشان کردیا نا بیچاری کو، ژالے گڑیا مذاق کررہا ہے، ابھی پہلے نوری کے ساتھ بیٹھنے لگا تو جہان نے اپنے ساتھ صوفہ پہ بٹھا لیا اب تم نے اس کا چانس گنوا دیا یہ جانے بغیر کہ ہمارا یہ لڑکا صرف اتاؤلا ہی نہیں چھچھورا بھی ہے۔'' بھابھی مسکرا مسکرا کر وضاحت دے رہی تھیں جبکہ زیاد نے آخری دونوں القاب پہ سخت قسم کا احتجاج بلند کیا تھا۔

''اونہہ آپ خود تو جیسے بہت سوبر ہیں نا ماشاء اللہ اور جنید بھائی...... اف ان کی بے حجابی کے مظاہرے ہم نے اپنی گنہ گار آنکھوں سے کئی بار دیکھے۔'' زیاد اتنا بلبلایا تھا کہ بھابھی کے ساتھ جنید بھائی کو بھی رگید ڈالا، بھابھی برا مانے بغیر ہنسے گئی تھیں۔

''مجھے پتہ ہے اب تم اپنی خفت مٹا رہے ہو۔'' انہوں نے پھر اسے جلایا تھا، اس سے پہلے کہ زیاد پھر سے شروع ہوتا، معاذ نے مداخلت کی تھی۔

''ژالے بھابھی ہم ایک کھیل کھیل رہے ہیں، اس باؤل میں کچھ کارڈز آپ دیکھ رہی ہیں نا، یہ باری باری سب کے پاس آئے گا، آپ کے ہاتھ جو کارڈ آتا ہے اس پہ جو بھی فرمائش لکھی گئی ہے اسے پورا کرنا حاضرین پہ لازم ہے، بے فکر رہیے کوئی بھی نازیبا فرمائش نہیں ہے۔'' وہ آخر میں مسکرا کر تسلی کرا رہا تھا کہ اسے کنفیوژڈ ہوتے دیکھ چکا تھا وہ، ژالے نے بے اختیار سکھ کا سانس بھرا۔

''یہ کھیل آپ سے ہی شروع ہوگا، بی کوز یہ محفل آپ دونوں کے ہی اعزاز میں سجائی گئی ہے۔'' معاذ نے کلیئر کیا تو حسان نے شیشے کا رنگین کارڈز والا باؤل نہایت مودب انداز میں دونوں ہاتھوں میں لے کر اسے پیش کیا، ژالے پھر سے پزل ہوگئی تھی، جانے کون سی فرمائش ہو جاتی، اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ ایک نیلا کارڈ منتخب کیا تھا، اس سے پہلے کہ اس پہ درج باریک سی عبارت کو پڑھ پاتی زیاد نے کارڈ اس سے اچک لیا تھا، ساتھ ہی اس کا منہ لٹک گیا۔

''اپنی پسند کی کوئی نظم سنائیں۔'' اس نے باآواز بلند پڑھ کر سب کو سنایا، یہ کارڈ اسی نے لکھے تھے اور زیادہ تر پہ گانے اور لور کا نام اور پہلی ملاقات کا احوال سچ کی شرط رکھ کر بتانے کو کہا گیا تھا، ژالے کے لئے وہ اسی کارڈ کا متمنی تھا۔

''ہوہو پوئٹری...... دلچسپی بھی ہے آپ کو؟'' ماریہ ہنسی تھی، ژالے جھوٹ نہیں بول سکی مگر سب کے بیچ وہ بھی ایسے جبکہ وہ فرینک بھی نہیں ہو پائی تھی سنانے کے خیال سے اسے عجیب لگ رہا تھا، مگر ان سب نے اسے کچھ اس انداز میں پیش کیا کہ اسی کا حوصلہ بندھا تھا، اس نے ایک نظر جہان کو دیکھا، دائیں ہتھیلی پہ چہرا ٹکائے وہ مصلحتاً ہی سہی مگر اسے ہی دیکھ رہا تھا، چاہے نظروں کا انداز کتنا ہی پرتپش اور طنزیہ سہی، اس نے گھبرا کر پلکیں جھکا دیں۔

مجھ کو معلوم نہیں چاہت کے تقاضے لیکن
ہم نے تیری ذات کے سوا ہر بات بھلا رکھی ہے
سفر مشکل ہے بہت معلوم ہے ہم کو لیکن
تو ہمارا ہے تو ہر فکر مٹا رکھی ہے
تو بھلا دے تو بھلا دے لیکن ہم نے
تیری خوشبو بھی تقدیر بنا رکھی ہے
تو جو بچھڑے تو ہر بار یوں لگتا ہے
زندگی موت کے پہلو میں بٹھا رکھی ہے
تیری باتیں تیرا چہرا تیرا لہجہ ہمدم
تجھ میں خالق نے ہر چیز جدا رکھی ہے

جب اس نے غزل شروع کی اس کی آواز میں لرزش بھی تھی اور عدم اعتماد بھی مگر پھر جیسے جیسے و[...] پڑھتی گئی لرزش بھی غائب ہوگئی اعتماد بھی آیا اور اس کے الفاظ اور لہجے کی گہرائی شدت سچائی خلوص او[ر] سب سے بڑھ کر جذب نے وہاں سب کے دلوں پہ جیسے گہرا اثر چھوڑا تھا، وہ خاموش ہوئی تو سب نے بے حد فراخ دلی سے اسے داد دی تھی۔

''دیکھ لیں جہان بھائی آپ کی نئی نویلی دلہن بھی آپ کے سحر آپ کی دلکشی سے محفوظ نہیں رہ سک[ی] ہیں۔'' زیاد نے جو بات لاابالی اور مذاق میں کہی تھی وہ ڈنگ بن کر جہان کو لگی تھی، ژالے کو دیکھتے ہو[ئے] اس کی آنکھوں میں حقارت اور طنز بیک وقت اترا تھا، جسے اور کسی نے محسوس کیا ہو یا نہیں ژالے نے ضرور کیا تھا، جہان نے جتنی بھی ناگواری محسوس کی البتہ ہونٹوں کو باہم بھینچ کر خود کو کچھ کہنے سے باز [ر]کھا تھا۔

''جے تمہاری باری ہے اب۔''

''مجھے کچھ نہیں آتا، پہلے بتا رہا ہوں۔'' وہ نروٹھے پن سے بولا، تو سب نے بری طرح اپنا احتجا[ج] پیش کیا تھا۔

''یہ فاؤل ہے بھائی! آپ کو سنانا پڑے گا۔'' یہ ان سب کا اصرار ہی تھا کہ جہان کو کارڈ اٹھانا پڑ[ا] جس پہ گانے کی فرمائش ہوئی تھی، وہ سخت جزبز ہوگیا تھا۔

"مجھے گانا نہیں آتا۔" وہ گڑبڑا کر صاف انکار کرنے لگا۔

"آپ کو گانا آتا ہے جہان بھائی ہم جانتے ہیں، سنائیں ورنہ ہم ابھی خفا ہو کر یہاں سے واک آؤٹ کر جائیں گے، کیوں مائی پارٹی؟" زیاد نے صرف دھمکی نہیں دی، ان سب کو بھی اپنا ہمنوا بنا لیا تھا، جہان کو ہتھیار پھینکنا پڑے تھے، اس نے گلا کھنکارا اسی پل زینب اپنے کمرے سے نکل کر ملازمہ کو پکارتی ہوئی لاؤنج کے صوفے پہ آ کر بیٹھ گئی، جہان کی نظروں نے ساکن ہو کر اسے دیکھا تھا، وہ اس کی سمت متوجہ نہیں تھی۔

کیونکہ اتنا پیار تم کو کرتے ہیں ہم
کیا جان لو گے ہماری صنم
ہمارے دل کی تم تھوڑی سی قدر کر لو
ہم تم پہ مرتے ہیں تھوڑی سی فکر کر لو
کیونکہ اتنا پیار تم کو کرتے ہیں ہم

ایک بے خودی تھی ایک بے اختیاری تھی، جو اس کی زبان سے ادا ہو رہی تھی، اس نے دوبارہ زینب کو نہیں دیکھا سر جھکایا اور آنکھیں بند کر لی تھیں، اسی کے بھاری لہجے میں ایک سوز تھا ایک جذب تھا۔

کیونکہ اتنا پیار تم کو کرتے ہیں
ہم کیا جان لو گے ہماری صنم

زینب نے چونک کر گردن موڑی تھی اور جہان کو نغمہ سرا دیکھ کر اسے بے تحاشا حیرت نے آن لیا تھا، زمہ کو چائے کا کہا اور اٹھ کر ہال کے دروازے میں آن رکی، اس کی نظریں جہان سے ہٹ کر ژالے پہ ن ٹھہریں، جو جہان کے ہی انداز میں سر جھکائے ہوئے تھی، گردوپیش سے بیگانہ اور غافل کسی اور ہی ال میں گم۔

تم سے ہے سانسیں تمہی سے ہے دھڑکن
تمہی سے ہے دیوانگی
رب نے ہمیں دی ہے
جاں تمنا تمہارے لئے زندگی
وعدہ سنگ جینے کا اے جان جگر کر لو
ہم تم پہ مرتے ہیں تھوڑی سی فکر کر لو
کیونکہ اتنا پیار تم کو کرتے ہیں
ہم کیا جان لو گے ہماری صنم

جہان نے گانے کے اختتام پہ بھی کتنی دیر تک نہ آنکھیں کھولیں نہ سر اونچا کیا، جبکہ اسے زبردست ی داد سے نوازا گیا تھا۔

"مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آئی آپ دونوں نے دوران گانا ایک دوسرے کو دیکھا کیوں نہیں۔" نے اہم سوال اٹھایا تھا، ایک زبردست قہقہہ پڑا تھا۔

"اس لئے کہ یہ فلم نہیں تھی۔" معاذ نے اس کی تسلی کرانا چاہی تھی۔

"مگر جب آپ پرنیاں بھابھی کے لئے گاتے تھے تب تو مسلسل انہیں دیکھا کرتے تھے۔" زیاد کی تسلی نہیں ہوئی تھی، معاذ نے سرد آہ بھری۔

"میں کسی شدید غلط فہمی کا یا پھر خوش فہمی کا شکار تھا، شاید جے یہ غلطی نہیں دوہرانا چاہتا۔" معاذ نے لمحہ بھر کو بالخصوص پرنیاں پہ جتلاتی نگاہ ڈال کر سلگتے ہوئے انداز میں جواب دیا تھا۔

"آپ لوگ خواہ مخواہ جھگڑ رہے ہیں، جے اس سوال کا مناسب جواب دے سکتے ہیں بہرحال۔"

زینب نے اسی طرح دروازے کی چوکھٹ سے کاندھا ٹکائے بیچ بچاؤ کرایا تھا مگر اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا جو چونکاتا تھا، جہان نے تب سے دانستہ نگاہوں کو نہیں اٹھایا تھا مگر اب اس نے زینب کی سمت نظر کی تھی۔

"اب تمہاری طبیعت کیسی ہے زینب؟" اس نے آہستگی سے سوال کیا گویا بات کا رخ دانستہ بدلا۔

"بہت جلدی خیال نہیں آ گیا آپ کو میرا؟ خیر میں ٹھیک ہوں اب تھینکس۔" وہ بے حد رکھائی سے جواب دیتی معاذ کی سمت متوجہ ہوگئی۔

"لالے میرے سیل میں کریڈٹ نہیں ہے، اپنا سیل دیجئے، مجھے کال کرنی ہے؟" معاذ نے اپنا سیل جیب سے نکال کر اس کی سمت بڑھا دیا تھا۔

"ملازم کو بھیجو میں کالنگ کارڈ منگواتا ہوں۔" زینب نے محض سر ہلایا تھا اور پلٹ کر چلی گئی۔

"چلو نا اب تم بھی کچھ سنا دو یار۔" اس نے خود کو سنبھال کر معاذ کو مخاطب کر لیا تو اس کے چہرے پہ معنی خیز مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

"ہم میں سے کسی کو بھی کچھ نہیں سنانا تھا، بس تم دونوں سے سننا تھا۔"

"کیا مطلب؟" جہان واقعی ہی الجھ کر رہ گیا تھا۔

"مطلب یہ ہے مائی ڈیئر جے کہ تم نے جو اپنی ساسو ماں سے جھگڑا کر کے اپنی پیاری سی دلہن کو زبردستی اپنے پاس روکا ہے تو ہم اب ظالم سماج تو بننے سے رہے کہ تمہارا اتنا اہم اور قیمتی وقت یہاں کی بے کاری میں ضائع کر دیں، تم اپنی مسز کا ہاتھ پکڑو اور اپنے بیڈروم کی راہ لو۔"

وہ جواباً دانت نکال کر وضاحت کر رہا تھا، جس نے جہان کو خفت و خجالت سے سرخ کر دیا تھا، ژالے کا تو جیسے شرم سے برا حال ہو گیا تھا، دونوں کی بے ساختہ نگاہ ملی تھی، ژالے نے حیا سے جلتے چہرے کو بے ساختہ ہاتھوں میں چھپا لیا تھا، اس کی اس حرکت پہ معاذ اور زور سے ہنسنے لگا، جبکہ جہان خجالت مٹانے کو معاذ کو مارنے کو دوڑا معاذ اپنا آپ بچا رہا تھا، اسی کوشش میں دونوں گتھم گتھا ہو چکے تھے۔

☆☆☆

جہان کی شادی سے مہینہ بھر بعد بھی جب پرنیاں نے کالج جانے کا نام نہیں لیا تو معاذ کو بے تحاشا جھنجھلاہٹ نے آن لیا تھا، خود سے اسے مخاطب کرنا وہ بہت عرصے کا چھوڑ چکا تھا، سب کے سامنے جو بات چیت ہوتی وہ الگ بات تھی مگر بیڈروم کی حد تک وہ دونوں ہی ایک دوسرے کے لئے ممنوع ہو چکے تھے، دیکھنے اور بولنے تک کی حد تک بھی، اب بھی معاذ کی فطری رعونت اسے مخاطب کرنے میں آڑے آ رہی تھی مگر اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا، کالج سے لے کر یہاں گھر تک ہر بندہ پرنیاں کی ادھوری تعلیم

کے متعلق اسی سے سوال کرتا تھا اور وہ اس کی خاموشی یا دوسرے لفظوں میں نظر اندازی و پہلو تہی پہ بل کھا کر رہ جاتا۔

"کالج کیوں نہیں جاتی ہو تم؟" وہ کسی کام سے اندر آئی تو معاذ جو اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا، چھوٹتے ہی بھڑک کر بولا تھا، پرنیاں اپنے دھیان میں تھی یا پھر اس سے ایسی بات کی توقع نہیں کر رہی تھی کہ پہلے ٹھٹھکی پھر گہرا سانس بھر کے اسے دیکھا۔

"مجھے نہیں جانا، نہ مجھے پڑھنا ہے۔"

"کیوں؟ اب کیا تکلیف ہوئی ہے تمہیں؟ سب ہی سمجھیں گے کہ میں نے تمہیں روکا ہے، خود تو برا سمجھتی ہی ہو مجھے، دنیا کی نظر میں بھی برا بنا دینا چاہتی ہو؟" وہ اتنے قہر بھرے اتنے غصیلے انداز میں بولا چلا گیا تھا کہ پرنیاں تو حیران ہو کر اسے دیکھتی رہ گئی۔

"ہے کوئی تمہارے پاس میری اس بات کا جواب؟" معاذ نے اس کی خاموشی کو محسوس کر کے دانت کچکچائے تھے، پرنیاں نے ہونٹ بھینچ لیے۔

"میں نہیں پڑھ سکتی اب، اگر مجھے پڑھنا ہوتا تو اتنا ٹائم ضائع کیوں کرتی۔" وہ عاجز سی ہو گئی، معاذ نے سر کو زور سے جھٹکا۔

"اگلے ماہ ایگزامز ہیں تمہارے، میں تمہاری ہیلپ کرا دوں گا۔" معاذ کا انداز قطعیت لیے ہوئے تھا، پرنیاں بری طرح سے جھنجھلائی۔

"ہرگز نہیں، مجھے نہیں چاہیے، آپ کی ہیلپ، بس کہہ دیا نا مجھے نہیں پڑھنا۔" پرنیاں نے پھر اسی شدت سے انکار کیا تو معاذ کے چہرے پہ چند لمحوں کو سکوت سا چھا گیا۔

"آئی سی...... تمہیں میری اتنی سی توجہ بھی...... خیر میں کسی ٹیوٹر کا انتظام کر دوں گا، مگر ایگزام دے رہی ہو تم، محض ایک ماہ کی بات ہے، ڈگری ضائع نہیں کرنے دوں گا تمہیں۔" اس کا لہجہ ضدی سا تھا، مخصوص ہٹیلا پن لیے، پرنیاں کو غصہ آنے لگا۔

"آپ مجھے فورس نہیں کر سکتے سمجھے آپ، مجھے نہیں چاہیے کوئی ڈگری وگری۔"

"یہ تو پھر میں دیکھوں گا کہ تم کیسے نہیں پڑھتیں فی الحال تو میرے پاس ٹائم نہیں مگر کل سے تم کالج بھی جا رہی ہو۔" اپنی بات مکمل کر کے وہ رکا نہیں تھا، مضبوط قدموں سے نکلتا چلا گیا، پرنیاں غصے سے ہونٹ بھینچے کھڑی رہی پھر مشتعل ہو کر ہاتھ میں پکڑا ہینگر دوز اچھال دیا اور خود کو بستر پہ گرا کر بے بسی کے شدید احساس سمیت گھٹ گھٹ کر روتی چلی گئی تھی۔

☆☆☆

فراغت سے اکتا کر وہ بیڈ روم سے باہر نکل آئی اور پورے گھر میں گھوم پھر کر جائزہ لینے لگی، تین بیڈ رومز تھے، ساتھ ہی لاؤنج، لاؤنج سے ملحق ٹیرس تھا، ٹیرس کی وائیٹ گرل سے لپٹی بوگن ویلیا کی بہار دکھاتی بیل خوبصورتی میں اضافہ کر رہی تھی، گولائی سے اترتی سرخ کارپٹ سے ڈھکی سیڑھیاں اتر کر وہ نیچے آ گئی، نیچے کچن تھا جو ڈرائنگ روم سے جڑا تھا، وسیع و عریض سفید ٹائلز والا امریکن اسٹائل کچن جہاں وہ شادی سے پہلے بھی ایک بار کھڑے ہو کر کام کر چکی تھی، لاؤنج کے آگے چھوٹا سا صحن تھا اور صحن سے

آگے لان جس کے وسط میں مین گیٹ تھا جس کے ساتھ مختصر سا پورٹیکو تھا۔

یہ لاہور والا بنگلہ تھا جہاں شادی کے محض چند دنوں بعد جب جہان کو کام کے سلسلے میں یہاں آنا پڑا تو مما نے جہان کی حیل و حجت کے باوجود ژالے کو اس کے ساتھ کر دیا تھا، تو اس کی وجہ شاید یہی تھی کہ وہ ان کے بیچ موجود تناؤ اور کشیدگی کے علاوہ فاصلوں کو بھی محسوس کر چکی تھیں، ان سب کے ٹائی مون پہ کیے گئے اصرار کو بھی جہان نے اس شد و مد سے ٹالا تھا چونکہ جبھی لاہور ساتھ لانے سے اتنی سختی سے انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہا یہی وجہ تھی کہ وہ اب اس کے ساتھ یہاں تھی، اتنے دن یہاں آتے ہوئے تھے اس کے باوجود جہان نے اسے مسز آفریدی سے ملنے کی اجازت دی تھی نہ ہی خود اسے لے کر گیا تھا، یہ بھی شکر تھا کہ مسز آفریدی کو ابھی تک اس کے لاہور آنے کی اطلاع نہیں تھی ورنہ وہ ایک طوفان لازمی اٹھا دیتیں، ان کی مصروفیت ہی انہیں سر اٹھانے نہ دیتی تھی اس کے باوجود وہ اسے اکثر فون کیا کرتی تھیں۔

"مجھے پتہ ہوتا بنی کہ یہ جہانگیر تم پہ اسی طرح سے قبضہ جما کر بیٹھ جائے گا تو میں کبھی تمہاری اس سے شادی نہ کرتی۔" اس دن انہوں نے کسی قدر غصے میں آ کر کہا تھا، جواباً وہ بھی ترنگ میں آ گئی تھی۔

"آپ بھی یہ بات جانتی ہیں ممی کہ میں، میں نے شاہ کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کرنی تھی۔" بات کے اختتام پہ اس کی نگاہ جہان سے جا ملی تھی جو جانے کب وہاں آیا تھا، اسے خبر نہیں ہو سکی تھی، اس کی نظروں میں اتنی تپش اور تخی تھی کہ ژالے کو اپنا آپ جلتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

"سچ ہمیشہ منہ سے نکل جایا کرتا ہے، غلطی سے ہی سہی مگر آپ نے اعتراف تو کیا نا کہ آپ نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے، کتنی سطحی حرکت ہے یہ اندازہ ہے آپ کو؟" وہ اس کے روبرو آ کے کھڑا ہو گیا تھا، ژالے نے رابطہ منقطع کر دیا مگر خود کو اس کی عدالت میں بری نہیں کر سکی، جہان کی عادات بن گئی تھی قدم قدم پہ اسے ذلیل کرنے کی، اس وقت بھی وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال کر راہ میں آئی ہر شے کو ٹھوکروں پہ اڑاتا چلا گیا تھا، گھر میں ایک ہی ملازم تھا، ژالے پہ گھر کی اکثر ذمہ داریاں خود بخود آ گئی تھیں، جن سے اس نے جی نہیں چرایا بلکہ بہت خوش اسلوبی سے ہر کام کرتی تھی، جہان کا ہر کام کرنا اسے ویسے بھی گہری آسودگی اور تسکین سے دوچار کرتا تھا، مگر جہان نہیں سمجھتا تھا، اسے شاید یقین نہیں آتا تھا، ژالے صبر سے اچھے وقت کی منتظر تھی، جو پتہ نہیں آنا بھی تھا بھی کہ نہیں، اس کا دل اکثر ملول ہو کر سوچنے لگتا تھا۔

(جاری ہے)

محبت کا گماں

صدف اعجاز

خلیل جبران کہتا ہے:۔

محبت کا مزاج ہے
محبت کی روشنی اور رنگینی جھیل میں منعکس ہے
اس کی سطوت، برجوں اور رشتہ نشینوں پر جلوہ پیرا
ہے
محبت خواہ باغوں اور دور دراز اجنبی صحراؤں میں
ہو
وہ ہم پر حکومت کرتی ہے اور
وہی ہماری مالک ہے
محبت، ہاں ہم پر حکومت کرتی ہے
اور یہی محبت مجھ پر بھی حکومت کرتی ہے

میں نے خود سے اعتراف کیا، اک گہرا سانس بھرتے ہوئے آسمان پر ننھے ٹمٹماتے تاروں کو دیکھا۔

"میں انا آفندی سے محبت کرتا ہوں۔"

ایسا ہی اعتراف میں نے رمشا خالہ اور عادی کے سامنے بھی کیا تھا، جواباً عادی کا کان پھاڑتا قہقہہ اور مسکراتے لبوں سے پھوٹتے الفاظ مجھے سخت زہر معلوم ہو رہے تھے۔

"تم اور محبت۔" وہ ہنسے چلا جا رہا تھا۔

"ویری فنی ولید آفندی۔"

"What,s so funny in it?۔" (اس میں کیا فنی ہے؟) عادی نے انداز گفتگو پر مجھے تپ چڑھ گئی۔

"What,s so funny in it?" اس نے لفظ بہ لفظ میرا فقرہ دہرایا۔

"عادی، میں ہرگز مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔" عادی کا انداز سراسر مذاق اڑاتا ہوا تھا۔

"اوکے، اوکے ڈیئر کزن، آپ انتہائی سنجیدہ ہیں کیونکہ آپ محبت کرنے کی غلطی کر چکے ہیں، جبکہ آپ جیسا انسان محبت نہیں کر سکتا مگر بقول آپ کے اگر آپ انا آفندی سے محبت

مکمل ناول

کرنے لگے ہیں تو میں سرخم کر کے اسے تسلیم کرتا ہوں کہ ولید آفندی، انا آفندی سے محبت کرتا ہے اور اس کے سوا کسی اور کا تصور اس کے لیے......"

"شٹ اپ عادی۔" اس سے قبل کے وہ مزید گوہر افشانی کرتا میں چیخ اٹھا، اس پر سے نگاہ ہٹا کر میں نے رمشا خالہ کی جانب دیکھا جو اب تک اس گفتگو میں خاموش بیٹھی تھیں۔

میری نظریں خود پر پڑتے دیکھ کر انہوں نے ہلکے سے ہنکارا بھرا پھر مجھ سے پوچھنے لگیں۔

"ماں کو خبر ہے تمہاری؟" ان کا انداز گفتگو ہمیشہ یونہی دوستانہ سا تھا۔

"ممی کیا یہی کہ ان کے بیٹے کو محبت ہو گئی ہے۔" اس سے قبل میں جواب دیتا عادی درمیان میں دوبارہ ٹپک پڑا، اب کی بار میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی رمشا خالہ نے عادی کو گھورتے ہوئے آنکھوں میں خاموش رہنے کی تنبیہہ کی۔

"کیا؟" وہ میری طرف متوجہ ہوئیں تو بے ساختہ میرے لبوں سے بھی وہی پھسلا جو ان کو تپا گیا، اب ان کے گھورنے کی باری مجھ تھی۔

خود پر ان کی گھورتی نگاہیں محسوس کرتا میں کار کی چابی سے سامنے رکھی شیشے کی میز پر سر جھکائے لکیریں کھینچنے لگا۔

"یہی کہ تم انا آفندی سے شادی کرنا چاہتے ہو۔" مجھے گھورتیں ذرا رک کر وہ پوچھ رہی تھیں، یوں لگا جیسے دانت پیس رہی ہو۔

"نہیں۔" میں نے گردن نفی میں ہلا دی، عادی کی طنزیہ مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی، میں نے اسے اگنور کیا۔

"تمہارے ممی، بابا تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں تو بتایا کیوں نہیں اب تک۔"

"انا ایسا نہیں چاہتی۔" میں دھیرے گویا ہوا۔

"کیسا نہیں چاہتی۔" میرا جواب انہیں اچنبھے میں ڈال گیا۔

"یہی کہ۔" میں سوچنے لگا کہ جو کر رہا ہوں وہ درست ہے یا نہیں، رمشا خالہ کو بتاؤں یا نہیں۔

"خالہ، انا ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی۔" میں نے رمشا خالہ کو ساری سچویشن بتانے میں ہی عافیت جانی کیونکہ میری نجات دہندہ صرف وہی ثابت ہو سکتی تھیں۔

"ولی تم کن گھن چکروں میں ڈال رہے ہو، اماں بابا تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں تم انا سے شادی کرنا چاہتے ہو، وہ تم سے شادی کرنا نہیں چاہتی، مدد مانگنے آئے ہو تو کم از کم بات تو کھل کر کرو۔" ان کی نگاہوں میں ایک الجھن در آئی جیسے وہ میری بات کو سمجھ نہ پا رہی ہوں۔

"رمشا خالہ! انا دو سال تک شادی نہیں کرنا چاہتی وہ اپنا ماسٹرز مکمل ہونے تک کوئی کمٹ منٹ کے لیے تیار نہیں ہے۔"

"آہ، تو تم اپنے ماں باپ سے کہہ سکتے ہو آخر تمہارے بابا کی لاڈلی بھتیجی ہے اس کی خواہش کا ضرور احترام کریں گے۔"

"انا نہیں چاہتی کہ ہمارے تعلق کے بارے میں گھر کے بڑوں کو خبر ہو۔" میں نے اصل ایشو سے ان کو باخبر کیا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" رمشا خالہ مزید حیرت زدہ سی مجھے دیکھنے لگیں۔

"روحان چاچو اس پر شادی کے لیے دباؤ ڈالیں گے اور وہ اپنی تعلیم مکمل کر نہیں پائے گی۔"

"ولی فار گوڈ سیک، تم ایک کوالیفائیڈ انسان ہو، شادی ہو بھی گئی تو اسے پڑھنے دینا، دنیا میں ہزاروں مسائل اور ہیں، تم اتنی سی بات کو بڑا مسئلہ بنا رہے ہو۔" ان کے نزدیک میری باتیں

ذرا بھی اہم نہ تھی۔

"وہ اپنی ڈگری لندن سے کرنے جا رہی ہے۔"

"لندن سے۔" اب کی بار رمشا خالہ کھٹکیں۔

"تمہارے چاچو یہ سب کیسے افورڈ کر رہے ہیں۔"

"چاچو اپنا......" میں کوئی تمہید باندھتا وہ بول اٹھیں۔

"خیر یہ ان کا ذاتی مسئلہ ہے تم بتاؤ شادی دو سال کے لیے ڈیلے کروانی ہے اور انا آفندی سے محبت کرتے ہوئے یہ بھی کسی کو خبر نہ ہو۔"

"جی۔" میری بات ان کی سمجھ میں بالآخر آ ہی گئی، میں نے صد شکر ادا کیا۔

"بات کر کے دیکھتی ہوں تمہاری ماں سے لیکن ان کو قائل کرنے کے لیے میرے پاس کوئی ٹھوس وجہ نہیں ہے اور یہ ان کو خبر بھی نہ ہو تمہارے اور انا کے جذباتی لگاؤ سے۔"

"تھینک یو۔" میں بلاوجہ ان کا ممنون ہو رہا تھا۔

"زیادہ خوش نہ ہو کامیابی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے۔" میری ممنونیت ان کو امپریس نہ کر سکی۔

"ایک کوشش ہی سہی۔" میں نے لجاجت بھرے انداز میں کہا کیونکہ قوی امکان تھا کہ وہ ممی بابا کو منا لے گئیں۔

"اس امید کے ساتھ میں چلتا ہوں۔" میں نے جانے کی اجازت چاہی۔

"ٹھیک ہے تمہاری طرف چکر لگاؤں گی۔"

میں کھڑا ہوا تو عادی بھی میرے ساتھ اٹھ گیا، ہم دونوں آگے پیچھے چلتے باہر آ گئے، گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے عادی نے ایک بار پھر وہی سوال داغ دیا۔

"تمہیں انا آفندی سے بالآخر محبت ہو گئی ہے۔" لمحہ بھر کے لیے ایک پرسوچ نگاہ عادی پر ڈالتے ہوئے قدرے ٹھہر ٹھہر کر پوچھا۔

"مجھے انا سے محبت کیوں نہیں ہو گی؟"

"نہیں تمہیں انا سے ہی محبت ہو سکتی ہے۔" جواباً وہ میرے ہی انداز میں بولا۔

"عادی تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" میں عادی کی بے سروپا باتوں سے الجھ گیا۔

"یہی کہ تم انا سے محبت کرتے ہو۔"

"ہاں میں انا سے محبت کرتا ہوں اور دو سال بعد اس کا حتمی اعلان سب کے سامنے کروں گا۔" اس نے ہلکے سے ہاتھ بجا کر مجھے شاباشی دی۔

"عادی میں تمہارا سر پھاڑ دوں گا۔" اس کا یہ مذاق اڑانا اور طنزیہ انداز اب میری برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔

"تم خواہ مخواہ میں ناراض ہو رہے ہو میں تو تمہاری ہاں میں ہاں ملا رہا ہوں۔" اب کی بار مسکراہٹ اس کے چہرے پر تھی مگر وہ مسکرایا نہیں۔

"تم کچھ اور کہنا چاہتے ہو؟" میں نے اسے بتانا چاہا کہ تمہارے یہ فقرے میری سمجھ سے بالاتر ہیں۔

"جانتے ہو ولی، میں نے کہیں پڑھا تھا محبت چہروں سے نہیں روح سے کی جاتی ہے۔"

"مطلب؟" میں نے ابرو اچکائیں اور عادی کی ان ادھوری باتوں سے اصل مطلب اخذ کرنا چاہا۔

"تم جیسا حسن پرست آدمی ہی انا آفندی جیسے خوبصورت چہرے سے محبت کر سکتا ہے۔"

اپنے بارے میں اس کی صاف گوئی مجھے اچھی نہ

لگی وہ جانے کیا اول فول بول رہا تھا میں سمجھ نہیں پایا۔

"عادی!" جیسے ہی میں نے اسے پکارا وہ بول اٹھا۔

"کم آن ولی، میری باتوں پر زیادہ غور مت کرو، مجھے خوشی ہے کہ تم نے بالآخر کسی کا انتخاب تو کیا۔" اس کا انداز بات کو ٹالنے والا تھا میں مزید بحث ملتوی کرتا واپسی کے لئے چل پڑا مگر میرے دل و دماغ عادی کی باتوں میں الجھ پڑے، وہ مجھے کیا سمجھانا چاہ رہا تھا، وہ اتنا حیران کیوں ہوا؟ اسے میرے اور انا کے تعلق میں کیا عجیب لگ رہا تھا۔

☆☆☆

یہ ایک نیا جھٹکا تھا، خالہ کے لاکھ سمجھانے پر بھی ممی نہیں مانیں، وہ اب do and die کی بنیاد پر میری شادی کرنا چاہتی تھیں سو میں آخری کوشش انا آفندی کو راضی کرنے کی تھی جو میں کرنے چلا آیا۔

"ولی!" کئی ثانیے میری بات سننے کے بعد وہ خاموش رہی پھر آہستگی سے مجھے پکارتی کہنے لگی۔

"محبت کرتے ہو اور صرف دو سال انتظار نہیں کر سکتے۔"

"کر سکتا ہوں مگر ممی کو کیا کہہ کر روکوں، انا منگنی تو کر سکتے ہیں۔" اسے راضی کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

"نہیں، بابا مجھے کبھی جانے نہیں دیں گے۔" وہ سر جھکا کر آہستگی سے گویا ہوئی۔

"او کے صرف ممی کو بتانے دو اپنے اور میرے بارے میں۔" میں نے قائل کرنے کی اک اور سعی کی۔

"ولی! ایسا کرو تم شادی کر لو۔" جواباً وہ جھٹ سے بول پڑی۔

"واٹ! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔" مجھے اتنے اس ردعمل کی توقع نہ تھی۔

"تو اور کیا کہوں، میں تمہیں پسند کرتی ہوں مگر میری فیملی مجھ پر انحصار کرتی ہے میں ان کو ایسے حالات میں کیسے چھوڑ دوں۔" اس کی آواز میں بے بسی سی دکھائی دی اور یہ میں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

"انا! تمہیں دو سال چاہیے۔" اک حتمی فیصلہ کر کے میں نے گہرا سانس بھرا، نظریں اس کے چہرے پر جمائے میں پوچھ رہا تھا۔

"ہوں۔" اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"ٹھیک ہے میں ممی کو خود منا لوں گا۔" میں دانستہ اسے دکھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"تم چاہو تو شادی......" وہ بڑی گرفتگی سے کہہ رہی تھی۔

"انا! تم نہیں تو کوئی اور نہیں۔" میں نے اس کی گہری، چمکتی روشن آنکھوں میں مسکرا کر جھانکا تو وہ طمانیت سے مسکرا دی۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنے ساتھ ان گنت اندیشے لے کر لندن جائے سو میں نے اسے ہر فکر سے آزاد کر کے جانے دیا، میں اس کے کیریئر میں حائل نہیں ہونا چاہتا تھا بلکہ اس کے خوابوں کی تعبیر میں اس کا ساتھ دینا چاہتا تھا، آخر انا آفندی کی محبت مجھ پر حکومت کرتی ہے۔

☆☆☆

"گڈ مارننگ ڈیڈ۔" اک عزم سے میں نے ڈائننگ ہال میں انٹری دی، اخبار پڑھتے آفندی صاحب نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا، ہلکے سے مسکرا کر مجھ سے کہنے لگے۔

"گیٹ ریڈی، تمہاری ممی پلان ترتیب دے چکی ہیں۔"

"کون سا پلان؟" میں نے جان بوجھ کر اگنور کیا اور جگ پکڑ کر گلاس میں جوس انڈیلنے لگا۔

"اس گھر میں اب صرف تمہیں نہیں تمہارے بچوں کو دیکھنا چاہتے ہیں۔" میں نے چونک کر سر اٹھا کر بابا کو دیکھا وہ عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"بابا! آپ لوگ میری آزادی کے درپے کیوں ہیں؟" جوس کا سپ بھرتا میں قدرے عاجزی سے بولا۔

"صرف دو سال ہی تو مانگے ہیں۔"

"تم نے صرف دو سال ہی کیوں مانگے؟ ہو سکتا ہے انا کو واپس آتے آتے تین سال لگ جائیں۔" وہ بڑے آرام سے بولتے مجھ پر دھماکہ کر گئے کئی ثانیے میں ان کی بات کے معانی جاننے کی کوشش کرتا رہا۔

"کیا مطلب؟ یہ انا درمیان میں کہاں سے آ گئی۔"

"تمہارا انتظار انا کے لئے ہی ہو سکتا ہے میری اطلاع کے مطابق وہ دو سال کے لئے گئی ہے۔" وہ زیر لب مسکراتے مجھے دیکھ رہے تھے میرا دل چیخنے لگا کہ بابا کو بتا دوں مگر انا کی خفگی آڑے آ گئی اور میں دل اور چہرے کو نارمل کرتا بابا سے بولا۔

"بابا! یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں، کسی شریف لڑکی کا نام ایسے ہی کسی کے ہاتھ جوڑ دیتے ہیں۔"

"ہاں درست کہا، وہ بھی اس کیس میں جب لڑکا شریف نہ ہو۔"

"ویسے انا مجھے بہو کے طور پر قبول ہے اپنی ممی کو بتا دو۔" وہ شرارت آمیز انداز میں بولے تو میں پہلی بار مسکرا دیا۔

"کم آن بابا ایسا کچھ نہیں ہے۔" میں نے ہار نہ مانی۔

"تم اتنا سب کچھ صرف روحان کے لئے تو نہیں کر سکتے۔" ان کا لہجہ بظاہر سادہ تھا مگر پکڑے جانے کا ڈر مجھ پر حاوی۔

"انا کی پڑھائی کا خرچ کس نے اٹھایا ہے ولی۔" وہ پوچھ رہے تھے تو میں ایک دو لمحے چپ ہو گیا پھر کندھے اچکا کر بولا۔

"بابا! وہ میری دوست ہے۔"

"مجھے نہ بھی خبر ہوتی تو روحان بتا دیتا، وہ انا کے اس فیصلے پر ذرا بھی خوش نہیں، ویسے بھی اس کے خیال میں اس کی بیٹی کو تم نے بگاڑا ہے۔" بابا نے میرے پیش کردہ بیانات سے ذرا آمادگی ظاہر نہ کی۔

"یہ الزام ہے۔" بابا کی کھوجتی نگاہیں مجھے گھیرنے کی پوری کوشش میں محو تھیں۔

"وہ میری دوست ہے اس کی مدد کرنا بری بات نہیں۔" میں ابھی بھی اپنی بات پر بضد تھا۔

"دوست سے شادی کرنا بھی ہرگز بری بات نہیں۔" وہ مجھے چھیڑنے سے نہ رکے۔

"ممی کہاں ہیں؟" میں نے موضوع بدلنا چاہا۔

"تمہاری رمشا خالہ سے فون پر گپیں لگا رہی ہیں۔" انہوں نے چائے کا کپ لبوں سے لگایا۔

"صبح صبح۔"

"ہوں تمہارے لئے لڑکی دیکھنے جا رہی ہیں۔" کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر وہ بڑے آرام سے مجھ پر گہری نظریں جما کر بولے۔

"بابا!" ابھی میں کچھ کہتا ممی آ گئیں اور ان کے آتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"ناشتہ تو پورا کر لو۔" مجھے اٹھتا دیکھ کر ممی

نے کہا میں رکنا نہیں چاہتا تھا سو بہانہ داغ دیا۔
”بس ممی! مجھے میٹنگ کے لئے پہنچنا ہے۔“
ممی نے اک طائرانہ نگاہ مجھ پر ڈالی اور پھر دھیرے سے پکارتی کہنے لگیں۔
”سنو ولی! میں تمہاری خالہ کے ساتھ لڑکی دیکھنے جا رہی ہوں تمہیں ساتھ جانا ہو تو چھ بجے تک گھر آ جانا۔“ ان کا انداز حتمی تھا وہ کچھ بھی سننے کے موڈ میں نہیں تھیں سو میں اس وقت کسی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔
”تو ٹھیک، آپ خود ہی دیکھ لیجئے۔“
قدرے نروٹھے لہجے میں بول کر میں باہر نکل آیا، ممی کی شادی مہم کی پھرتیاں مجھے پھر سے پریشان کر گئی، آفس کے بجائے میں رمشا خالہ کے گھر چلا آیا۔
”کیوں آپ میری خوشیوں کی قاتل بن رہی ہیں۔“ میں اتنے زور سے چلایا کہ مگ ان کے ہاتھوں سے پھسلتے پھسلتے رہ گیا، خود کو سنبھالتی بولیں۔
”آؤ ناشتہ کرو۔“ ان کا اتنا اطمینان قابل دید تھا جو مجھے جلا گیا۔
”کر آیا ہوں۔“ کرسی کھول کر میں ان کے مقابل بیٹھ گیا۔
”لڑکی Reject کر کے آیئے گا۔“
”خوامخواہ میں، میں لوگوں کی لڑکیاں Reject کرتی پھروں، بے شک میری کوئی بیٹی نہیں پر خود تو لڑکی ہوں۔“ چائے کا گھونٹ بھر کے وہ مجھے جھاڑنے لگیں۔
”توبہ کریں خوش فہمی آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔“ میں نے ان کے خود کو لڑکی کہنے پر چوٹ کی۔
”تمہیں میں لڑکی نہیں لگتی۔“ وہ میرا اشارہ سمجھ چکی تھیں۔
”نہیں۔“ بڑی صاف گوئی سے میں نے سر ہلایا، میرا دل تڑپ رہا تھا اور ان کو خود کو لڑکی کہلوانے کا شوق چڑھ رہا تھا۔
”آہ ولی!“ وہ مصنوعی خفگی سے مجھے گھورنے لگیں۔
”لڑکی تو نہ کہیے خود کو خاتون خانہ ضرور ہیں۔“ مجھے ان کی خفگی اور گھورنے کی ذرا پرواہ نہ تھی۔
”مگر مسئلہ آپ کے لڑکی ہونے کا نہیں اس وقت۔“ میں نے خود ہی موضوع بدل دیا۔
”آپ کی شادی دو سال کے لئے ملتوی کرنا ہے۔“ انہوں نے میری بات مکمل نہ ہونے دی۔
”رمشا خالہ! ممی نے اپنی کوشش تیز کر دی ہے۔“
”تو کیا برا کر رہی ہے، تمہاری ماں ہے، انا کی خواہش کا احترام تو تم میں کوٹ کوٹ کر بھرا گیا ہے اور ماں کی خوشی کا ذرا خیال نہیں یہ محبت کرتے ہی لوگ اندھے کیوں ہو جاتے ہیں، ماں باپ دشمن نظر آنے لگتے ہیں اور......“
”اچھا بس زیادہ اموشنل نہ ہو اور نہ مجھے کریں۔“ میں ان کے ڈرامائی ڈائیلاگ سننا نہیں چاہتا تھا۔
”ممی کو اعتماد میں لو اور سب کچھ ان کے گوش گزار کر دو۔“ وہ ایک کپ چائے چڑھا چکی تھیں دوسرا کپ میں انڈیلتے ہوئے بڑے اطمینان سے مجھے مشورہ دے رہی تھیں۔
”محبت بچانی ہے تو بتا دو، ویسے بھی اب انا جا چکی ہے سو ان کے والد محترم کچھ نہیں کر سکتے۔“ میرے چہرے پر بڑھتی مایوسی دیکھ کر وہ مجھے سمجھانے لگیں۔
”یہ آئیڈیا ویسے مجھے کیوں نہیں آیا۔“ ادھر

میں نے سوچا اور ادھر منہ سے نکلا جواباً رمشا خالہ کی بات مجھے تپا گئی۔
”کیونکہ محبت میں صرف آنکھوں سے نہیں عقل سے بھی لوگ اندھے ہو جاتے ہیں۔“
”بات کرو گے انا سے یا دوسری آپشن بتاؤں۔“
”کیا کروں بھانجا محبت کر بیٹھا ہے۔“ بڑی شرارت آمیز مسکراہٹ ان کے چہرے پر تھی۔
”غلطی مت کہہ دیجئے گا۔“ اب خفا ہونے کی باری میری تھی۔
”تو حماقت کہہ لیتے ہیں ویسے میں خوبصورت غلطی کہنے والی تھی۔“ وہاں بھی میری خفگی کی رتی بھر پرواہ نہ تھی۔
”مجھے لگتا ہے انا راضی ہو جائے گی۔“ میں سیریس ہو گیا۔
”راضی ہو تو well and good نہیں تو......“ وہ رکیں۔
”نہیں تو کیا؟“ میں جلدی سے گویا ہوا۔
”شادی۔“ وہ بڑے آرام سے بولیں اور میں اچھل پڑا۔
”آپ۔“ بے بسی سے دانت پیستا میں جھنجلا گیا۔
”پوری بات تو سن لو۔“ وہ ناشتے سے فارغ ہو چکی تھیں، اب وہ پوری طرح سے میری جانب متوجہ تھیں۔
”عارضی شادی کر لو، ممی بھی خوش ہو جائے گی۔“
”واٹ؟“ وہ بولیں اور مجھے چار سو والٹ کا جھٹکا لگ گئیں، میرے چیخنے پر انہوں نے مجھے غصے سے گھورا۔
”یہ کیا واٹ، واٹ کی رٹ کر رہے ہو، پیسوں کے لئے آج کل لوگ سب کچھ کر سکتے ہیں، تم کسی کی ضرورت پوری کرو، وہ تمہاری۔“ میں لب بھینچے ان کو دیکھے جا رہا تھا، پھر سر ہلاتا آہستگی سے بولا۔
”آپ وکیل ہے نا اس لئے اتنی کرمنل باتیں سوچ رہی ہیں۔“ میری بات رمشا خالہ کو تڑپا گئی۔
”اس میں کرمنل کیا ہے۔“ تبھی ملازم کمرے میں آ کر کسی کے آنے کی اطلاع دینے لگا۔
”ربل بی بی آئی ہیں۔“
”ان کو لاؤنج میں بٹھاؤ میں آتی ہوں۔“
رمشا خالہ ادھر متوجہ ہوئیں۔
”میں انا سے بات کرتا ہوں۔“ مجھے انا سے بات کرنا ہی سب سے بہتر لگا، سو مزید بحث سے گریز کیا اور اٹھ کر چلا آیا۔
☆☆☆
مجھے انا کی باتیں عجیب لگ رہی تھیں، وہ اب بھی اپنا اور میرا رشتہ disclose نہیں کرنا چاہتی تھی، اس کے پاس بے پناہ وجوہات تھیں۔
”بابا زبردستی بلا لیں گے۔“
”میں چاچو کو منا لوں گا۔“
”میرا دھیان بٹ جائے گا، لوگ کہیں گے تم مجھے افورڈ کر رہے ہو۔“ اور بھی نجانے وہ کیا کہہ رہی تھی۔
اگر میں اس سے محبت کر کے اس کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں تو وہ کیوں نہیں، میرا دل انا کے لئے مثبت سوچتا اور دماغ۔
”اف یہ کیسی مشکل آ پڑی ہے۔“ میں اسے ممی کے اصرار کے بارے میں مزید بتانا چاہتا تھا مگر اس کے پاس وقت ہی نہ تھا، سو روشن خیال مرد ہونے کے خیال نے مجھے اسے اپنی بات سننے

کے لئے بھی مجبور نہ کیا۔

میرے پاس پسپائی اختیار کرنے کے لئے کوئی چارہ نہ تھا، میں مجبور تھا انا کی محبت میں، ممی کی محبت میں، میں ان دونوں کو خوش رکھنا چاہتا تھا، مجھے فی الحال دوسری آپشن پر غور کرنا پڑا۔

"کیا یہ اتنا آسان ہوگا۔" شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر میں نے خود سے سوال کیا اور جواباً وہی اتنے دن کی خاموشی ملی۔

☆☆☆

"تو تم عارضی شادی کے لئے تیار ہو۔" میں پھر رمشا خالہ کے دربار میں تھا۔

"اوہ اور کیا کر سکتا ہوں ممی بہت ناراض ہیں۔" میں اداس تھا، میری ممی اور میری محبت دونوں مجھے سمجھنے کو تیار نہ تھیں۔

"ولی کیا یہ اتنا آسان ہے۔" وہ آہستگی سے بڑبڑائیں تو میں تحیر سے انہیں دیکھنے لگا، مجھے رمشا خالہ پر شدید غصہ آیا مگر ضبط کرنا میری مجبوری تھی۔

"خود ہی مشورہ دے کر خود ہی ڈرا رہی ہیں۔" میں قدرے تحمل سے بولا، وہ میرے چہرے پر خفگی بھرا غصہ دیکھ رہی تھیں۔

"اتنا آسان نہیں۔" انہوں نے سانس بھرا۔

"اور میں کر بھی کیا سکتا ہوں۔" اپنی بے بسی پر مجھے غصہ در غصہ آئے چلا جا رہا تھا۔

"انا کی باتیں میرے تو کچھ پلے نہیں پڑ رہیں۔" رمشا خالہ کو عجیب واہمے ستانے لگیں، لیکن میں ان کو خاطر میں لانے کے موڈ میں نہ تھا، میرے سے زیادہ انا کو کون جان سکتا ہے وہ اتنی مخالفت کے بعد کیسے اپنے حالات سے لڑ رہی ہے۔

"اب دل برداشتہ نہ ہو۔" وہ جلد ہی اس کشمکش کی سچویشن سے باہر نکل آئیں۔

"لڑکی کیسی ہونی چاہیے۔" وہ وکیل تھیں اس لئے ان کی طرح ہر گھٹیا بات کر سکتی تھیں۔

"ایک سمجھوتہ، بعد میں کوئی ایشو نہ ہو۔" میں نے ان کا سوال اگنور کیا۔

"noted اور کوئی نقطہ۔" وہ بڑے پروفیشنل انداز میں پوچھ رہی تھیں، میں جھنجھلا گیا۔

"آپ کیا وکیلوں کی طرح میری لائف کے معاملات حل کر رہی ہیں۔" میرے جھنجھلانے اور جملے کو انہوں نے خوب انجوائے کیا، وہ مسکرائے چلی گئیں، تبھی لاؤنج میں کوئی داخل ہوا اور دھیرے سے سلام کرنے لگا۔

"السلام علیکم!" میں اور رمشا خالہ دونوں آنے والے کو دیکھنے لگے، وہ کوئی لڑکی تھی، میرے خیال میں رمشا خالہ کی مظلوم کلائنٹ، مگر میرا خیال جلد ہی غلط ثابت ہوگیا۔

"میں تمہارا ہی سوچ رہی تھی۔" رمشا خالہ بڑی خوش دلی سے مسکرائیں اور اسے بیٹھنے کو اشارہ کر کے اس سے حال چال دریافت کرنے لگیں، میں خاموشی سے ان کے درمیان ہونے والی بات چیت سن رہا تھا۔

"ولی یہ رمل ہے تمہارے ہاشم ماموں کی بیٹی۔" اچانک رمشا خالہ اپنا رخ میری جانب کر کے بڑے آرام سے بولیں۔

"رمل یہ ولید آفندی ہے بیشا کا بیٹا۔" اب وہ رمل کو مخاطب کرتیں میرا تعارف کروا رہی تھیں۔

کتنی عجیب بات ہے، وہ میرے ماموں کی بیٹی ہے اور میں پہلی بار اس سے مل رہا ہوں، میں شاکڈ ہوا تھا جبکہ مقابل شخص کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ہرگز نہ ابھرے تھے اس کا مطلب وہ میرے بارے میں جانتی ہے، سر جھٹک کر میں نے خود کو اس خیال سے نکالا اور وہی سوچنے لگا جو آج کل میری جان کا روگ بن گیا ہے، نجانے ممی کا کیا ری ایکشن ہو، ان گنت سوالات میرے اوپر حاوی ہو چکے تھے، اسی الجھن میں گھرا میں آفس آگیا۔

میٹنگ کا انبار، میں اٹینڈ کرنے کے موڈ میں نہیں تھا سو لغاری صاحب کو ساری تفصیل بتا کر یہ ذمہ داری ان کے حوالے کی، چند کاغذات اور ضروری چیک سائن کر کے میں گھر کے لئے روانہ ہوا، لفٹ کی جانب بڑھتے ہوئے میری نگاہ سیڑھیوں سے اوپر آتی ہستی پر ٹھہر گئی، وہ بلاشبہ وہی تھی، جس سے آج صبح میں رمشا خالہ کے گھر اپنی کزن کی حیثیت سے متعارف ہوا تھا، وہ مجھے دیکھ چکی تھی، حیرانگی ہم دونوں کے چہروں پر رقم تھی۔

"آپ یہاں؟"

"میں یہاں جاب کرتی ہوں۔" اس نے میرے ہی آفس کی جانب اشارہ کیا، اپنی بے خبری پر حیرت کا جھٹکا سا لگا۔

"اس آفس میں۔" میں نے دوبارہ سے دوہراتے ہوئے آفس کی طرف اشارہ کیا، اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"آپ لغاری صاحب کے انڈر کام کر رہی ہیں۔"

"جی!" اب کی بار وہ چونکی تھی، میں اس کی حیرت بھانپ گیا تھا سو اسے بتانے لگا۔

"میں ولید آفندی، اس آفس کا سی ای او اور رومان آفندی کا بیٹا ہوں۔"

"آپ کو یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی۔" اک رسمی سی فارمیلٹی پوری کر کے میں وہاں سے چلا آیا۔

☆☆☆

گھر پہنچ کر خبر ہوئی کہ ممی اور بابا دونوں اس وقت گھر پر نہ تھے، میں اپنے کمرے میں چلا آیا، مجھے تنہائی میسر تھی اور زندگی میں درپیش ہونے والا یہ مسئلہ میرے اطراف اک بے چینی اضطراب لئے تھا۔

میں نے جھک کر جوتے اتارے اور بیڈ پر دراز ہو گیا، تبھی دروازے پر ناک ہوا پھر دروازے کو کھلا محسوس کر کے اندر آ گیا، میں نے یونہی لیٹے لیٹے رخ موڑ کر دیکھا، ممی اندر داخل ہوئی تھیں۔

"تم نے کھانا نہیں کھایا ولی۔" میرے قریب پہنچ کر وہ بڑے شفقت بھرے انداز میں پوچھ رہی تھیں، ان کے لہجے میں ناراضگی کا عنصر نہ تھا۔

"کھا لوں گا آپ فکر مت کریں۔" ممی میرے غصے پر مسکرا دیں۔

"کیا مجھے اپنے بیٹے کی فکر نہیں ہونی چاہیے۔" ان کا انداز و لہجہ شگفتہ سا تھا، میری چھٹی حس یکدم بری خبر کی اطلاع دے رہی تھی میں بے اختیار اٹھ بیٹھا۔

"شادی کرنے کا ہی کہہ رہی ہوں اور تم اسے روگ سمجھ رہے ہو، اتنی بار کہا ہے کوئی لڑکی پسند ہے تو بتا دو بنا کسی اعتراض کے اسے بہو بنا کے لے آؤں گی۔"

"مگر دو سال نہیں دے سکتیں۔" میں نے نروٹھے لہجہ میں کہا۔

"ولی اگر دو سال تک میں زندہ نہ رہی تو۔" ماں باپ کا وہی اموشنل ہتھیار جیسے ہر دور میں استعمال کیا جاتا ہے، فرمانبردار اولاد ہمیشہ سر جھکا دیتی ہے میں نے بھی سر جھکا دیا۔

"ممی آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔" میں

نے بے اختیار ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کون ہے لڑکی؟"

"ملوادوں گا۔" میری آواز دھیمی پڑگئی۔

"کب؟" وہ خاصی سنجیدہ ہوگئیں۔

"کیا آپ اسے اپنی بہو قبول کریں گی۔"

"کیوں نہیں کروں گی، میرا بیٹا کسی ایسی ویسی لڑکی کو پسند نہیں کرسکتا اور یہ تم اتنے تذبذب کا شکار کیوں ہو، ملوا کیوں نہیں رہے؟" وہ جواباً خوشدلی سے بولیں۔

"بتا دیا ہے تو ملوا بھی دوں گا۔" میں نے انہیں ٹالنے کی سعی سی کی۔

"تو میں تھوڑا سا انتظار کرلوں گا۔"

"چلو آؤ کھانا کھالو۔" انہوں نے زیادہ اصرار کرنا مناسب خیال نہ کیا اور مجھے کھانے کا کہتے ہوئے باہر نکل گئیں، میں ایک عجیب سے احساس کے ساتھ بند دروازے کو دیکھتا رہ گیا۔

☆☆☆

شام میں ایک بار پھر میں رمشا خالہ کے گھر پر تھا، عادل اور عالی دونوں گھر پر نہ تھے، رمشا خالہ کے ساتھ کچھ شرائط طے کرنی تھیں اور لڑکی سے ملاقات جو اس ڈرامہ کا دوسرا اہم کردار کرنے جارہی تھی۔

میں کیوں مضطرب تھا، بے چین، الجھا ہوا، میرا دل بجھا ہوا تھا، رمشا خالہ چائے لینے گئی ہوئیں تھیں، میں نے سخت بے بسی بے چارگی سے دروازے کو دیکھا پھر رخ پھیر کر کچھ دیر کھڑکی کے پاس کھڑا باہر کے اندھیرے کو گھورتا رہا، جبھی رمشا خالہ بمعہ رنل کے ہمراہ اندر داخل ہوئیں۔

"رنل!" میرے لب بے آواز اس کے نام سے پھڑ پھڑائے۔

تو یہ لڑکی ہے جس سے رمشا خالہ میری شادی کروانا چاہ رہی ہیں، رمشا خالہ نے ہاشم ماموں کی بیٹی کو ہی کیوں چنا۔

"زیادہ انتظار تو نہیں کرنا پڑا۔" رمشا خالہ میری بے چینی سے اچھی طرح واقف تھیں، انہوں نے چائے کا بڑے درمیان میں رکھی تپائی پر رکھ دیا۔

"ن...... نہ...... نہیں۔" میں نے بے ساختہ نفی میں گردن ہلادی، میری نگاہیں ابھی تک رنل پر جمی ہوئی تھیں، جو ہاتھ میں تھمے سفید کاغذ کو جانے پڑھنے یا دیکھنے میں مشغول تھی۔

"تم دونوں سمجھ گئے ہو گے کہ یہاں کیوں ہو۔" رمشا خالہ ہم دونوں کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

"شرائط نامہ رنل کے ہاتھ میں ہے، تفصیل سے بات بھی کرسکتے ہو، میں تب تک رات کے کھانے کا انتظام کرلوں۔" مجھے چائے کا کپ تھما کر باہر نکل گئیں، اب ہم دونوں کمرے میں تھے اور دردناک خاموشی۔

اک گرم گھونٹ اپنے اندر اتارتے ہوئے میں نے رنل کو دیکھا وہ اب بھی انہی کاغذوں کو دیکھ رہی تھی۔

"آپ یہ شادی کیوں کرنا چاہتی ہیں۔" ہلکی سی سانس لبوں سے خارج کرتے ہوئے میں نے رنل سے استفسار کیا۔

"مجھے پیسوں کی ضرورت ہے۔" بہت دیر بعد اس کی آواز ابھری جس میں حقیقی شرمندگی کا عنصر تھا۔

"رمشا خالہ آپ کو سب کچھ بتا چکی ہوں گی۔"

"جی یہ شرائط نامہ ہے میرے ہاتھ میں۔" وہ مسلسل نگاہ جھکائے تھی اور میرے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ لہرا کر منجمد ہوگئی، میں سر جھکا کر پیالی سے اٹھتی بھاپ کو دیکھنے لگا۔

وہ سب کچھ جان چکی تھی اب مزید میں اس سے کیا کہا سو خاموشی میں عافیت جانی، مگر رنل ہاشم ماموں کی بیٹی، پیسوں کی ضرورت، اک نئی الجھن میں گرفتار ہوگیا تھا۔

☆☆☆

"ہاشم کی بیٹی۔" ممی نے بڑی بے یقینی سے بابا کو دیکھا جو میرے انکشاف پر خود بھی دنگ ہو گئے تھے۔

"وہ تمہیں کہاں ملی؟" ممی کے چہرے پر ناگواری کے جذبات واضح طور پر عیاں تھے۔

میں نے ممی اور بابا کے پریشان اور پھیکے پڑتے چہروں کو محسوس کیا پھر دھیرے سے بولا۔

"میرے آفس میں جاب کرتی ہے۔"

"تم ہاشم کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تمہیں کیسے پتہ چلا کہ وہ تمہاری......"

"رمشا خالہ سے۔" میں آہستگی سے گویا ہوا۔

ممی خاموش ہوگئیں، چند ثانیے کمرے میں خاموشی چھائی رہی جسے میری آواز نے توڑا۔

"ممی!"

"ولی! اس پورے جہاں میں تمہیں ہاشم کی بیٹی ہی ملی۔" اب کی بار وہ زہر خندی سے بولیں، ممی کی بات مجھے الجھن میں ڈال گئی، آخر وہ ہاشم ماموں کو اتنا ناپسند کیوں کرتی ہیں۔

"ممی!" میں نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے ہی تو بابا بول اٹھے۔

"او کے ولی! ہم اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔" بابا ممی کی حالت سے آگاہ تھے سو انہوں نے مجھے وہاں سے بھگانے کی اور میں اک نامعلوم سی خوشی میں وہاں سے چلا آیا۔

اب ممی وہاں راضی نہیں ہوں گی اور میں ضد پر اڑ جاؤں گا ناچار یہ معاملہ کچھ عرصے کے لئے ٹل جائے گا۔

"ریشا، یوں ولی کے سامنے بی ہیو کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" بابا کی آواز نے میرے بڑھتے ہوئے قدم بے اختیار روک دیئے اور دروازے کے باہر میں ان کی باتیں سننے کے لئے کھڑا ہوگیا۔

"کیا بھول جاؤں وہ سب، جو ہاشم کی بیوی نے کیا۔" ممی کی آواز میں نمی سی تھی۔

"وہ ہمارے لئے مر چکی ہے، ماضی کے سوا کچھ نہیں۔" بابا نے ممی کا ہاتھ تھپتھپا کر سمجھانا چاہا جسے ممی نے جھٹک دیا۔

"یہی سوچ کر سب بھول چکی تھیں، اس کی بیٹی ولی کی بیوی، یہ مجھے قبول نہیں۔" ممی اس لمحے کچھ سننا نہیں چاہتی تھیں۔

"مت بھولو، ولی کا انکار بھی اس لئے تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔"

"اور اس کا باپ اس کی ماں سے۔" ممی کی بات مجھے جھٹکا دے گئی۔

"ریشا میں اس سے محبت نہیں کرتا تھا صرف کزن کی حیثیت سے اس کی مدد کرتا تھا جسے غلط رنگ دے دیا گیا۔" بابا کی آواز میں عاجزی در آئی۔

"او خدایا، میرا بیٹا، ولی ایسا نہیں کرسکتا۔" ممی رو دینے کو تھیں۔

"ریشا پرانے قصوں کو مت چھیڑو اور......" بابا نے اپنے تحت ممی کو سمجھانے کی سعی کی۔

"اور آرزو کی بیٹی کو بہو بنا کر لے آؤں، آرزو زندہ ہے اور یہ چال اسی نے چلی ہے، میں اتنی لاعلم نہیں جتنا آپ مجھے سمجھتے ہیں۔" بابا کی بات پر ممی چڑا گئیں۔

"ٹھیک ہے منالو اپنے بیٹے کو، میں تمہارا ساتھ دوں گا۔" بابا، ممی کے آگے بالآخر اپنی ہار

تسلیم کرتے اٹھ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

لابی میں قدم رکھتے ہی میری نظر ممی پر پڑی، وہ کسی گہری سوچ میں گم تھیں، آہٹ پر چونکیں، اضطرابی انداز میں انگلیاں مسلتی وہ مجھے دیکھنے لگیں۔

"ممی!" انہوں نے میرے پکارنے پر پلکیں جھکالیں مگر میں ایک ٹک انہیں دیکھتا رہ گیا، ایک ہی رات میں کتنا زرد ہو رہا تھا ان کا رنگ۔

میں ممی کو دکھی نہیں کر سکتا تھا سو ساری حقیقت انہیں بتانے کے لئے میں ان کے قریب چلا آیا۔

"آپ اگر......"

"نہیں ولی، تم سے زیادہ کوئی خوشی میرے لئے اہم نہیں، فیصلہ مشکل ضرور تھا، مگر ناممکن نہیں، کب جانا ہے ان کے گھر۔" میں نے بے اختیار تڑپ کر ان کی طرف دیکھا، زرد چہرہ ممتا کی محبت سے ڈوبا دکھائی دیا، میرے لب ان کی عقیدت کے لئے وا ہوئے، ان کا ہاتھ چومتے ہوئے میں اندر ہی اندر ندامت کے سمندر میں ڈوبنے لگا، نرم ہاتھوں کا لمس میرے سر پر ضرور تھا، مگر اک گہری سانس ان کے لبوں سے نکل کر فضا اور مجھے بوجھل کر گئی، میں نے تاسف اور گہرے صدمے سے ان کی جانب دیکھا، وہ اب مسکرا رہی تھیں، ان کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں، میں جان نہ سکا، یہ مسکراہٹ خوشی کی تھی یا اندر کے دکھ کو چھپانے کی کوشش۔

"تم نے پسند کیا ہے تو ضرور کچھ خاص ہوگا اس لڑکی میں۔" میں جانتا تھا وہ اپنے دل کی زیر زبر ہوتی دنیا کو سنبھالے ہوئے ہیں، میں نے ان کے دونوں ہاتھ تھام کر ایک بار پھر بڑی عقیدت سے چھوا۔

"ممی لو یو۔"

"میرا بیٹا۔" انہوں نے مجھے سینے سے لگا کر کئی بار چوما اور میں خود کو پستی میں گرتا محسوس کرتا رہا۔

☆☆☆

یہ کیسی محبت ہے؟
جو مجھے کہاں لے آئی ہے
یہ محبت، مجھ سے کیا کروا رہی ہے

"انا" مجھے اپنی کنپٹیاں سلگتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔

میری خوشی، میرے دل کی خواہش پر ممی ہاشم ماموں کے گھر برسوں بعد چلی آئیں۔

وہاں پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ کبھی کبھی پیسے کی ضرورت انسان سے کیا کچھ کروا لیتی ہے، شاید رمل درست تھی، اس کا احترام درست تھا، وہ اپنے گھر والوں کی محبت میں گرفتار تھی اور میں انا کی، اس کی آواز میری محبت ہم سے یہ کیا کروا رہی تھی۔

ان کے معاشی حالات کافی خراب تھے، رمل کی سوتیلی ماں انتہائی خراب موڈ میں چبا چبا کر اپنی مصیبتوں کا رونا رو رہی تھیں۔

انہیں غصہ تھا رمل پر کہ وہ انہیں ان حالات میں چھوڑ کر اپنے لئے خوشیوں بھرا راستہ چن رہی ہے، ان کے خیال سے وہ بے حس تھی یا پھر حالات سے ڈر کر بھاگنے والی، وہ رمل کی خصوصیت ممی اور رمشا خالہ کے گوش گزار کرتی رہیں، یہاں تک کہ وہ اس کے سامنے بھی اپنا منہ بند کرنے کو راضی نہ تھی، میں نے رمل پر نگاہ ڈالی، بنا کسی تاثر کے، جذبات سے عاری چہرہ لئے وہ چائے کپوں میں انڈیل رہی تھی، وہ ممی سے بھی بڑے سپاٹ انداز میں ملی۔

تبھی ہانپتے کھانستے، لاغر سے ہاشم ماموں کمرے میں داخل ہوئے تو ممی بے اختیار اٹھ کھڑی ہوئیں، غالباً ممی کی ماموں سے ملاقات برسوں بعد تھی، بنا سلام خیر و عافیت پوچھے وہ ممی سے ہاتھ جوڑے معافی مانگ رہے تھے، ممی نے آنسوؤں کو سمیٹتے ہوئے ان کے ہاتھ تھام لئے، انہیں ماموں کی بے چارگی لاچاری اور حالت زار پر رونا آیا تھا، منہ کے فالج کی وجہ سے ہاشم ماموں بول نہیں سکتے تھے، ممی نے اپنے آنے کا مدعا بیان کیا تو وہ ایک بار پھر سے رونے لگے، رونے سے ان کی حالت مزید بگڑ رہی تھی، ممی اور رمشا خالہ انہیں سنبھالنے لگیں، میں نے رمل کو ایک بار پھر دیکھا وہ ان کے منہ میں پانی ڈال رہی تھیں اور ماموں کی بیوی صوفے پر لاتعلقی سے بیٹھی یہ منظر دیکھ رہی تھیں، خدا جانے ماموں اشاروں سے ممی اور خالہ کو کیا سمجھا رہے تھے۔

مجھے یہ سب بے حد عجیب لگ رہا تھا، میں یکدم حساسیت کی زد میں آ گیا، ایک افسردگی دل و جاں پر محیط ہونے لگی۔

مجھے ممی اور ماموں کی ناراضگی کی وجوہات جاننی تھی، یہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں، دو سال بعد رمل سے علیحدگی ممی اور ماموں کو دوبارہ دور کر دے گی۔

"اف خدایا۔" میں ممی کو روکنا چاہتا تھا، میں ایک قدم بڑھا اور تبھی ممی نے اپنے ہاتھ کی رنگ اتار کر رمل کو پہنا دی۔

"میری بیٹی، سدا خوش رہو۔" ممی کے الفاظ گونجے اور میرا دل کسی اتھاہ میں ڈوب گیا، میں نے اک بے بس نگاہ رمشا خالہ پر ڈالی جو اس لمحے میری طرح خاموش اور گم صم تھیں۔

☆☆☆

لاؤنج میں داخل ہونے سے پہلے ہی ممی کی آواز نے میرے قدم روک دیئے۔

"رمل بالکل آرزو سے مختلف ہے۔"

"آرزو سے مختلف...... اس سے کیا مراد ہے آپ کی؟" پاپا ممی کی بات نہ سمجھ سکے، ناسمجھی کی کیفیت میں دیکھتے وہ ممی سے پوچھنے لگے۔

"بڑی مختلف سی لڑکی ہے نہ آرزو جیسی خوبصورتی، ادائیں نہ ہی اس جیسا انداز گفتگو، پر اعتمادی، تیز طراری، بد دماغی، مجھے تو ڈرا سہا، جدوجہد کرتا عام سا وجود لگا۔" ممی نے اپنا تجزیہ رمل کے بارے میں پیش کیا تو پاپا بے ساختہ مسکرا دیئے۔

"وہ صرف آرزو کی ہی نہیں معمولی واجبی شکل والے عام سے ہاشم کی بھی تو بیٹی ہے۔" وہ لمحہ بھر کو رک کے پھر آہستگی سے گویا ہوا۔

"ریشا مگر زیادہ ضروری یہ نہیں، اہم تو یہ ہے آپ کے بیٹے کو اس میں کیا خاص لگا۔" ان کا انداز ممی کو سمجھانے والا تھا۔

"میرا بیٹا آپ کی طرح حسن پرست نہیں ہے۔"

"آپ کا بیٹا میری طرح اتنا سادہ بھی نہیں ہے۔" وہ ممی کو بڑے محظوظ کر دینے والی مسکراہٹ سے دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے، میں الٹے قدموں اپنے کمرے میں واپس آ گیا، اس دھوکا دہی اور فریب کے سفر میں جانے کیا ہوگا؟ اس لمحے دل کی حالت عجیب سی تھی۔

بیک وقت میرے شعور سے دو متضاد سوچیں ٹکرا رہی تھیں، ایک یہ کہ سختی سے یہاں رک جاؤں اور انا سے محبت کا اعتراف ممی، پاپا کے سامنے کرلوں، مگر انا کی روتی آواز اس کی قسم مجھے اس اقدام پر روک دیتی "محبت ہم پر حکومت کرتی ہے" میں نے تھک کر خود کو صوفے پر گرا کر دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا۔

☆☆☆

اس کھیل کا انجام کیا صورت اختیار کرے، یہ سوچ مجھے پریشان کیے اک نا معلوم احساس میں جکڑے ہوئے تھی اور میں اس کا توڑ اپنے دل کو مطمئن کرنے کے لئے چاہتا تھا، ایسے میں اس پرابلم کو رمل کے ساتھ شیئر کرنا ضروری سمجھا، حتمی فیصلہ کرتے ہوئے ایک گہری سانس میرے لبوں سے آزاد ہوگئی، میں نے آفس میں لنچ ٹائم کے دوران رمل کے کیبن کی ایکسٹینشن ملائی۔

''جی!'' ائیر پیس پر اس کی آواز ابھری۔

''میں ولید بول رہا ہوں۔'' ہلکی سی سانس اس کے لبوں سے خارج ہوگئی، وہ دھیرے سے بولی۔

''جی......آپ۔''

''میں اصل میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے میں قدرے رکا پھر دوبارہ سے گویا ہوا۔

''آپ مجھے تھوڑا سا وقت دیں گی۔''

''جی!'' ماؤتھ پیس پر اس کی آواز ابھری تو میں بنا یہ جانے کہ اس جی میں اقرار تھا یا حیرت اپنی ہی بولے گیا۔

''آفس ٹائم ختم ہونے کے بعد میں پارکنگ ایریا میں آپ کا منتظر ہوں گا۔'' رابطہ منقطع ہوا تو میں کتنی دیر تک ریسور پکڑے یہ سوچتا رہا کہ بات کس طرح کرنی چاہیے۔

نگاہیں بے ارادہ سامنے بڑی سی وال کلاک کی موٹی موٹی سیاہ سوئیوں پر جم گئیں۔

پورے تین گھنٹوں بعد میں اپنی گاڑی میں پارکنگ کی سڑک پر اس کا منتظر تھا، وہ سامنے سے آتی دکھائی دی، نجانے ایسا کیوں محسوس ہوا جیسے وہ مجبوراً خود کو گھسیٹ رہی ہو، اس نے قدرے قریب پہنچ کر نگاہیں دوڑائیں، اکا دکا گاڑیاں ہی تھیں، میں گاڑی کے فرنٹ سے ٹیک لگائے ہوئے بھاگتی دوڑتی گاڑیوں کا کھیل دیکھ رہا تھا، اس کی نگاہ مجھ پر پڑی، وہ دھیرے دھیرے قدموں سے میری گاڑی کے پاس آگئی۔

''سوری آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی دراصل وہ...... میں۔''

''نہیں کوئی اتنی زیادہ بھی نہیں، صرف پندرہ منٹ انتظار کرنا پڑا۔'' میں نے ہلکی ٹھنڈی سانس بھری، وہ شرمندہ سی ہوگئی تاہم اس کے بولنے سے پہلے میں جلدی سے بول اٹھا۔

''اب سوری میں وقت ضائع نہیں کرتے۔''

''جی!'' اس کی پلکیں لرز کر اٹھی رہ گئیں، میں اس کی طرف دیکھے بغیر ''آیئے بیٹھیے'' کہہ کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر اس کے لئے فرنٹ ڈور کھولنے لگا۔

گاڑی دھیمی رفتار سے چلاتے ہوئے میں ایک موڑ کاٹ کر لمبی شفاف سڑک پر دوڑنے لگا، ذرا سا رخ موڑ کر بولا۔

''کہاں جایا جائے۔'' وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اضطراری انداز میں ایک دوسرے میں پھنسا رہی تھی۔

''آپ بات کیجئے میں سن رہی ہوں۔'' اس نے اپنے خلفشار سے نکل کر مجھے دیکھا پھر چہرہ جھکا لیا، اس کے چہرے کے تاثرات میں بے اعتباری کے رنگ ٹھہرے نظر آرہے تھے۔

مجھے اچنبھا سا ہوا، کیا وہ میرے ساتھ آنا نہیں چاہتی تھی یا یوں ملنا نہیں چاہتی تھی؟

''آپ آنا نہیں چاہتی تھی یا یوں ملنا نہیں چاہتی تھی۔'' بے ساختہ میرے لبوں سے پھسل گیا۔

''نن...... نہیں...... یہ بات نہیں۔'' وہ

بولتے بولتے رک گئی، اس کی نگاہوں سے میری نگاہیں ملیں تو اس کی آواز ٹھہر گئی مگر میں برا منائے بنا کندھے اچکا کر بولا۔

''محتاط ہونا اچھی بات ہے مگر میں اب اتنا اجنبی نہیں ہوں آپ کے لئے۔'' میرا لہجہ سادہ تھا مگر خفت سے اس کے رخسار گلابی ہوگئے، وہ متوحش ہراساں سی آنکھیں مجھے تذبذب میں ڈالنے لگیں۔

''وہ...... میں۔'' وہ شرمندہ سی ہو کر بولنے لگی تو میں جلد سے بول اٹھا۔

''خیر اسے رہنے دیجئے، آپ سے ملنے کا مقصد یہ تھا کہ ممی اور ماموں ایک عرصے بعد تمام گلے شکوے بھلا کر ملے ہیں اور دو سال بعد جب یہ رشتہ ختم ہوگا تو ان کے تعلقات دوبارہ خراب ہو جائیں گے۔'' میرا لہجہ دھیما تھا میں ایک لمحے کو رکا۔

''یہ ایک خیال مجھے اس اقدام سے روکنے پر مجبور کر رہا ہے۔'' گاڑی میں لحظہ بھر خاموشی چھائی رہی، گاڑی کا موڑ کاٹتے ہوئے میں نے اسے دیکھا، جہاں کچھ بے چینی کی لہریں امڈی تھیں۔

''آہ دو سال، بابا کے پاس اتنا وقت کہاں ہے۔'' وہ بڑی بوجھل آواز میں گویا ہوئی، میں سن سا ہو گیا، شاک کی کیفیت میں رمل کی جانب دیکھا۔

لب بھینچے سر جھکائے وہ اضطرابی انداز میں انگلیاں مسلنے لگیں، وہ کچھ کہنے کے لئے شاید لفظ جمع کر رہی تھی یا ہمت، میں اس کے جواب کا منتظر تھا۔

''بابا اب کسی سے کبھی خفا نہیں ہوں گے میں ان کو سمجھا لوں گی۔'' اس کی آواز میں ایسی لرزش تھی جیسے روشنی سائے سے ڈر کر لرزتی دکھائی دے، اس نے پلکیں اوپر اٹھائیں، اس کی آنکھوں کی سطح پر نمی چمکنے لگی۔

''اور ممی۔'' میں نے خود سے سوال کیا۔

''سمجھا لوں گا۔'' پھر خود ہی خود کو تسلی دی۔

''اگر تم سمجھتی ہو کے ماموں خفا نہیں ہوں گے تو......'' میں اس کی جھکی پلکوں پر نگاہیں جماتے ہوئے بولا پھر جان بوجھ کر فقرہ نامکمل چھوڑ دیا۔

''یہ تو طے کہ یہ کھیل ہم دونوں کو کھیلنا ہی تھا۔'' سو میں نے گاڑی واپسی کے راستے پر ڈال دی، واپسی کا راستہ بے حد خاموشی سے کٹا، ہم دونوں اپنی سوچوں میں الجھے تھے ویسے بھی کہنے کو کچھ نہ تھا درمیان میں۔

☆☆☆

آرزو، ہاشم ماموں کی بیوی، رمل کی ماں اور بابا کی چچا زاد تھیں، ان کے درمیان کوئی اور رشتہ تھا یا نہیں رمشا خالہ اس سے لاعلم تھیں، ہاں بابا آرزو اور ان کی فیملی کی مالی معاونت ضرور کرتے تھے، آرزو بابا کو کب سے پسند کرتی تھیں یہ معلوم نہ تھا البتہ ہاشم ماموں سے شادی کے بعد بھی وہ بابا کے لئے اپنی پسندیدگی کا اظہار کرنا نہ بھولی تھیں، ان کا بابا سے التفات برتنا ممی سے چھپا نہ رہ سکا، ممی نے اپنے رویے سے سمجھانا چاہا تو وہ ممی کے سامنے بڑے دھڑلے سے اعتراف کر گئیں، ممی تو دنگ کیا ہوتیں بابا کے بھی ہوش آڑ گئے۔

تقریباً ایک سال ممی مجھ سمیت رمشا خالہ کے ہاں ٹھہریں، ہاشم ماموں نے آرزو کی حمایت اور ممی کو جھوٹا کہہ ڈالا اور ممی نے ان سے ہمیشہ کے لئے قطع تعلق کر لیا، خدا جانے بابا ممی کو کیسے راضی کر کے گھر لائے مگر ممی گھر واپس آگئیں، بابا نے آرزو سے ہر طرح کا رابطہ ختم کر ڈالا کیونکہ وہ مجھ سے اور ممی سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔

چند سالوں بعد آروز نے ہاشم ماموں سے طلاق لے کر ان سے قدرے بہتر اسٹیٹس کے آدمی سے شادی کرلی اور رمل کی پرواہ کیئے بنا شہر کیا ملک ہی چھوڑ گئیں۔

جانے ہاشم ماموں کو ممی کی سچائی پر تب یقین آیا یا نہیں یہ تو خبر نہ تھی البتہ انہوں نے کسی رقاصہ کی بیٹی سے شادی کرلی اور در در کی ٹھوکریں ان کا نصیب بن گئیں۔

مالی حالات کبھی بھی خاص نہ تھے، بچوں کی پیدائش مزید بدتر کر گئے، چرس پیتے پیتے وہ بستر سے جا لگے، ممی نے اتنے برس ان سے کوئی رابطہ نہ رکھا ہاں رمشا خالہ رمل سے ضرور ملتیں اور اسے کسی نہ کسی طرح سپورٹ کر کے معاشرہ کا باعزت شہری بنانے میں بھی مدد کرتی رہتیں تھیں۔

☆☆☆

ہاشم ماموں کی طبیعت کے پیش نظر نکاح بالکل سادگی سے کیا گیا اور ولیمہ تھوڑے عرصے کے لئے ملتوی۔

ممی شادی کی فضول بے کار غیر شرعی رسومات کے خلاف تھیں جو مجھے کسی نعمت سے کم نہ لگیں، گھر پہنچ کر ممی رمل کا ہاتھ تھام کر اسے گھر دکھانے لے گئیں، پھر اسے اپنی محبتوں کا یقین دلاتے ہوئے بالآخر میرے کمرے میں لے گئیں، بے چینی بھری کیفیت میں اِدھر اُدھر چکر کاٹنے لگا اور میری حالت زار سے عادل نے خوب حظ اٹھایا، جبکہ رمشا خالہ اس تمام عرصے میں خاموش تماشائی بنی مجھے کچھ پراسراری معلوم ہوئیں، یہ خاموشی ان کا خاصا ہرگز نہ تھا۔

☆☆☆

ہلکے سے دروازے کو بجا کر میں کمرے میں آیا تو وہ ڈھلے ہوئے منہ کے ساتھ صوفے پر بیٹھی تھی، مجھے دیکھ کر بے اختیار کھڑی ہوگئی۔

"تم اطمینان سے بیٹھو۔" میں اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتا کھڑکی کی جانب بڑھ گیا، گلاس ونڈو کھول کر میں نے تازہ ہوا اندر آنے دی، پھر کمرے میں ممی کا اکلوتا پھولوں کا بکے اٹھا کر بالکونی سے باہر رکھ دیا، اس پل ان پھولوں کی خوشبو سخت ناگوار رہی تھی، جتنا خود کو نارمل کرنے کی سعی کرتا اتنا ہی دل کے کسی کونے سے عجیب سا خوف بادل کی طرح اٹھتا محسوس ہو رہا تھا، کمرے میں اس لمحے ایسا سناٹا تھا، جیسے کسی ذی روح کی موجودگی کا احساس نہ ہو اور یہ سناٹا میرے دل پر ہولے ہولے اتر رہا تھا، اگر میرا یہ حال ہے تو اس بے چاری کی کیا حالت ہوگی، پھر اس سکوت کو میں نے ہی توڑا۔

"تم چاہو تو بیڈ پر سو جاؤ۔" میں الماری کی طرف چلا آیا۔

"نہیں میں یہیں ٹھیک ہوں۔" جواباً وہ آہستگی سے بولی تو میں خاموش ہوگیا۔

کپڑے بدل کر جب میں واش روم سے باہر آیا تو وہ بدستور اسی پوزیشن میں بیٹھی تھی، دونوں ہاتھوں کو جوڑے گہری سوچ میں گم، میں بیڈ پر جا کر بیٹھ گیا، ماحول کو بہتر اور نارمل کرنے کے لئے ضروری تھا کہ میں عام سی بات چیت کرتا۔

"تمہیں پیسے کیوں چاہیے تھے؟" اس نے سر اٹھا کر ایک سیکنڈ مجھے دیکھا پھر چہرہ دائیں جانب کھڑکی کی طرف موڑ لیا۔

"مجھے اپنا گھر بچانا تھا۔"

"مطلب؟" میں نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا۔

"بابا کے علاج کے لئے میں نے گھر کے کاغذات رکھوا کر قرض لیا تھا، جسے اب واپس کرنا ضروری ہوگیا تھا۔" اک شدید جھٹکا مجھے لگا، ظلم در

ظلم سفا کی بے حسی خود کو سنبھالتا آہستگی سے بولا۔

"اس کے لئے اتنا بڑا اقدام کیوں اٹھایا تم رمشا خالہ سے مانگ لیتیں۔"

"پتہ نہیں یہ بڑا اقدام تھا یا وہ جو ہونے جا رہا تھا۔" اس کی آواز دھیمی تھی مگر میری سماعت تک باخوبی پہنچی تھی۔

"ان کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے۔" وہ اب بھی کھڑکی سے باہر چھائی مہیب اداسی کو دیکھ رہی تھی۔

"آفس سے مانگ لیتی۔" جانے میں کیا پوچھنا چاہ رہا تھا، میں شرمندگی کے گہرے گھڑے میں خود کو گرتا محسوس کر رہا تھا، میں بنا کسی شرط کے اس کی مدد کر سکتا تھا، مگر ہم انسان محبت میں اتنے اندھے ہو جاتے ہیں کہ اپنا نفع سب سے پہلے دیکھتے ہیں، میرا ذہن منتشر اور اپنا آپ خالی سا لگا۔

"اتنی رقم نہیں مل سکتی تھی۔" وہ دھیمے سے بولی۔

"مجھ سے......" میں بولتے بولتے یکدم چپ ہوگیا پھر بے چینی کے عالم میں کھڑکی میں پھیلنے والی تاریکی کو خود بھی گھورنے لگا، بلکہ اسے شدت سے محسوس کرنے لگا۔

میرے سامنے بیٹھا وجود، کس انتہا سے گزر کر یہاں پہنچا ہوگا، وہ سادہ سی لڑکی بنا کسی سہارے کے خود کے ساتھ کیا کر بیٹھی تھی اور میں جو اسے اس اذیت سے نکال سکتا تھا خود ہی اسے اس آگ میں گھسیٹ لایا، اپنی غرض کے لئے، اپنی محبت کو بچانے کے لئے۔

باہر پھیلی تاریکی میرے اندر بھی ڈیرا ڈالنے لگی، میں نے اک نگاہ خاموش بیٹھے وجود پر ڈالی اور خاموشی سے لیٹ گیا، لیمپ آف کر کے میں نے خود کو اس اضطراب سے نکالنا چاہا تبھی موبائل کی روشنی میں مجھے اپنی جانب متوجہ کرلیا، وہ انا کا میسج تھا، اپنے اس اقدام سے میں اسے انفارم کر چکا تھا، وہ بھی میرے لئے مقام حیرت تھا کہ اس نے احتجاج نہ کیا بلکہ مجھے دو سال سکون سے گزارنے کی مبارکباد پیش کی۔

"کیسی ہے وہ؟" انا کا یہ پوچھنا مجھے اچنبھا سا ہوا، وہ کیا پوچھ رہی ہے اس پل میرا بے قرار دل اس سے کچھ سننا چاہتا تھا، جو چند لمحوں کے لئے دل کو سکون بخش دے۔

"مجھے کیا پتہ۔" میں جھنجھلا ہی تو گیا۔

"خوبصورت ہے؟" اس نے ایک اور سوال داغ دیا۔

"مجھے نہیں پتہ۔" اب کی بار میں غصے میں آ گیا۔

"ایسا کرو اس کی تصویر سینڈ کر دو۔" اس کا یہ میسج تپا گیا، میں نے بے بسی سے غصہ ضبط کرتے ہوئے اسے گڈ نائیٹ کا جواب دیا جب ٹھک سے اس کا ایک اور میسج آ گیا۔

"کم از کم یہی کہہ دو انا مجھے تم سے محبت ہے۔" میں بے ساختہ مسکرا دیا، میرا دل بھی تو کسی ایسی بات کا تمنائی تھا، انا تم بھی تو کہتی تمہیں مجھ سے محبت ہے، یہ سب میں صرف سوچ سکا اس سے کہہ نہ پایا۔

"انا آفندی تم میرے دل پر حکومت کرتی ہو۔" یہ فقرہ لکھ کر اسمائیل پک تصویر کے ساتھ بھیج دیا، جواباً مجھے صرف ہارٹ کی تصویر ملی بنا کسی اظہار کے چلو رات کی نیند تو کم از کم سکون سے آئے گی۔

☆☆☆

روشن اور چمکدار سورج بڑی سی کھلی کھڑکی سے اپنی نوکیلی کرنیں میرے پورے وجود میں پھیلا رہا تھا، ذہن کے جاگتے ہی ایک ایک

کر کے سارے منظر یاد آنے لگے، میں نے گردن موڑ کر صوفے کی طرف دیکھا وہاں وہ موجود نہیں تھی، اک گہرا سانس بھرتا اٹھ گیا۔

فریش ہو کر میں لابی میں آیا تو ممی رمل کے ساتھ باتوں میں مشغول تھیں، مجھے ممی کے چہرے پر گہرا سکون دکھائی دیا ”تو کیا رمل ان کے دل میں جگہ بنا گئی ہے۔“

”ولی رمل نے ہاتھوں میں نہ مہندی لگائی اور نہ ہی چوڑیاں پہنی ہیں، اتنی سادہ شادی کی بھی میں خواہش مند نہ تھی، ہاشم ٹھیک ہو جائے پھر شاندار ولیمہ کریں گے۔“ ممی کی بات پر ہم دونوں نگاہیں چرانے پر مجبور ہو گئے تھے۔

”ممی آج کیا ناشتہ نہیں ملے گا۔“ میں ممی کی مزید باتوں سے رمل کو اپ سیٹ نہیں کرنا چاہتا تھا سو ان کا دھیان ناشتے کی طرف موڑا۔

”کیوں نہیں؟ ابھی لگواتی ہوں، تم نے ریمی کو کوئی گفٹ نہیں دیا۔“ ممی کی رمل سے ریمی تک فرینک نس مجھے ہلا گئی۔

”ممی پہلے ناشتہ کر لیتے ہیں۔“ میں تیزی سے اٹھ کر ڈائننگ ہال کی طرف آیا، میرے اس ری ایکشن پر ممی حیران ضرور ہوئی تھیں مگر اب ہر چیز میرے بس سے باہر ہو رہی تھی، یہ اتنا آسان ہو گز نہ تھا جیسا میں نے سوچا تھا بلکہ سوچا ہی نہ تھا، وہ رمل کو لئے میز تک آ گئیں، ان کی گہری نگاہ مجھ پر تھی مگر میں اگنور کرتا ناشتہ کرنے لگا، بابا خاموشی سے ممی اور مجھے دیکھ رہے تھے، ممی نے رمل کو میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے کے لئے کہا وہ بنا کسی آواز کے بیٹھ گئی میں نے ذرا فاصلے پر رکھے ٹوسٹ اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیئے۔

”کیا لو گی آملیٹ بٹر جیم۔“ میں بڑے نارمل انداز میں اس سے پوچھنے لگا، اس کا آج یہاں پہلا دن تھا وہ ضرور نروس ہو گی۔

”یہ کافی ہے۔“ اس نے ٹوسٹ پلیٹ میں رکھ لیا اور دھیرے دھیرے اسے کترانے لگیں۔

”رمل آملیٹ لو نہ۔“ ممی نے آملیٹ کی پلیٹ اس کے سامنے رکھ دی، اس نے تھوڑا سا پلیٹ میں ڈال لیا، بابا ناشتہ کرتے اخبار کی ہیڈ لائنز مجھ سے ڈسکس کرنے لگے تو میرا موڈ کافی حد تک بہتر ہو گیا۔

اپنے کپ میں چائے لیتے ہوئے میں نے ذرا کی ذرا رمل کو دیکھا وہ ابھی تک وہی ٹوسٹ کتر رہی تھی۔

”تم کچھ کھا نہیں رہی۔“ میں نے اسے ذرا ایزی کرنے کے لئے نارمل انداز اپنایا ممی سے زیادہ اس وقت میں مہمان نواز ثابت ہو رہا تھا، میں نے اپنی بنائی گئی چائے کا کپ اس کے آگے رکھ دیا۔

میری یہ تمام حرکات ممی، بابا کو دکھانے کے لئے نہیں تھی بلکہ رمل کے لئے تھی، یا اس جذبے کے لئے جو رات میں نے اس کے لئے محسوس کیے، مجھے اس سے ہمدردی تھی، وہ حالات کا بری طرح شکار تھی، میں نے شعوری طور پر ایسی کوشش نہ کی تھی مگر ممی کو کافی حد تک مطمئن کر گئی۔

☆☆☆

شام کو گھر آیا تو ممی نے حکم صادر کر دیا۔

”تم رمل کے ساتھ آج ڈنر باہر کرو گے۔“

میں نے ممی کو منع کرنا چاہا مگر رمل کے سامنے انکار کر کے میں اس کی انسلٹ نہیں کرنا چاہتا تھا، سو رمل کو تیار ہونے کا کہہ کر وہاں سے چلا آیا۔

تقریباً آٹھ بجے میں گاڑی میں بیٹھا رمل کا انتظار کر رہا تھا، وہ گاڑی میں آ کر بیٹھی، میں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اس پر ایک سرسری نگاہ ڈالی، بلیک شفون کا سادہ سا سوٹ پہننے بنا میک اپ کسی اور آرائش وہ تیار ہوئی تھی، مجھے اس

کی اتنی سادگی پر حیرانگی ہوئی تھی، میں نے سوچا۔

نجانے ممی نے اسے اس حالت میں میرے ساتھ جاتے دیکھا بھی ہے یا نہیں ورنہ یوں اتنے سادگی بھرے حلیے میں کبھی نہ جانے دیتی۔

اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹا کر ونڈ اسکرین پر کرتے ہوئے سوچا، پھر خود ہی چونک گیا۔

”یہ کیا سوچ رہا ہوں۔“ خود کو سرزش کرتا بے حد ریش انداز میں گاڑی بھگانے لگا۔

ڈنر تو خاک کرواتا میں رمل کو لئے سمندر پر آ گیا، سمندر کی موجوں کو دیکھتے ہم دونوں لہروں کا شور سن رہے تھے، میں سگریٹ اضطراب کی کیفیت میں پیتے ہوئے گہری چپ میں غرق تھا، جبکہ میرے بائیں جانب کھڑی رمل، چھوٹے چھوٹے کنکر پانی میں پھینک رہی تھی۔

”آپ مجھے رمشا خالہ کے گھر ڈراپ کر دیتے۔“ شاید وہ میرا اضطراب بھانپ گئی میں نے چہرہ گھما کر اس کی طرف دیکھا، وہ میرے قریب کھڑی تھی۔

”نہیں، ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ میں نے اس کے ہاتھ میں تھمے آخری کنکر کو اٹھا کر سمندر میں اچھال دیا۔

چاند کی روشنی میں سادہ سا روپ دھارے وہ اداس آنکھیں لئے بے ضرر سا وجود مجھے رات کی تاریکی کا حصہ ہی محسوس ہوئی، ہم دونوں لہروں کو پاؤں تلے روندے دھیرے دھیرے چلنے لگے۔

”تم اتنی چپ کیوں رہتی ہو، بولتی کیوں نہیں ہو۔“ میرے اندر اس پل سناٹا تھا میں کسی لڑکی کے جذبات کو زندگی بخشنے کا کام دے رہا ہوں کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ کھیل کہیں اس کا وجود زخمی نہ کر دے، وہ بے اختیار پلکوں کی جھالریں جھکا گئی، ساحل کی نرم ریت ہمارے پاؤں سے کھسکے جا رہی تھی، وہ ہلکی سانس کے ساتھ بولی۔

”بولتی ہوں مگر زیادہ نہیں۔“

”میرے پاس کہنے کو کسی سے کچھ بھی نہیں۔“ اس کی آواز دھیمی تھی۔

پچھلی تمام ملاقاتوں کے برعکس وہ مجھے آج قدرے پر اعتماد سی دکھائی دی، میرے ساتھ آنے پر وہ ذرا بھی خوف زدہ نہ تھی، مجھے کسی الجھن، وسوسے اور واہموں کا گمان اس کے چہرے پر دکھائی نہیں دیا، کیا یہ سب؟ اس نام نہاد کاغذی رشتے کا نتیجہ تھا، میں اسے ضرورت سے زیادہ سوچ اور محسوس کر رہا تھا، مجھے اپنے اور اس کے درمیاں لاتعلقی کا فاصلہ قائم رکھنا چاہیے۔

میں نے بے اختیار نظریں اس کے چہرے سے ہٹا کر جھاگ اڑاتی لہروں پر مرکوز کر دیں اور جیب سے سگریٹ نکال کر لبوں سے لگا کر اسے لائٹر کا شعلہ دکھانے لگا۔

”کیا کھاؤ گی؟“ اب اسے لایا تھا تو یہ فرض بھی پورا کرنا تھا۔

”ہمیں گھر چلنا چاہیے۔“ جواباً وہ میرا سوال اگنور کر گئی، میں نے لائٹر جیب میں ڈال کر سگریٹ کو انگلیوں میں دباتے ہوئے دوبارہ اس پر ایک نظر ڈالی وہ سمندر کی لہروں کو تک رہی تھی۔

”تمہیں سمندر اچھا لگتا ہے۔“ میں نے یونہی اس کی نگاہوں کی سمت دور اچھلتی شور مچاتی موجوں کو دیکھتے ہوئے قیاس کیا۔

”میں پہلی بار سمندر کو دیکھ رہی ہوں، بہت کچھ سنا تھا اس کے متعلق مگر کبھی دیکھا نہیں۔“ وہ اڑتے بال سمیٹتے ہوئے بولی مگر نظریں سمندر پر مرکوز تھیں۔

”پہلی بار۔“ میں چونکا، گردن گھما کر اسے

دیکھا، وہ میری حیرت بھانپ گئی تھی تبھی گہرا سانس خارج کرتی پھیکی سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے بولی۔

"وقت اور حالات کی اجازت نہیں تھی۔" وہ ساحل کی نرم ریت پر انگلی سے لکیریں کھینچنے لگی، میں اس کی کھینچی گئی لکیروں پر نگاہیں جماتا پھر سے مضطرب ہو گیا۔

"اس کی انتہا کیا ہو گی؟"

"میں اسے کہاں لا کر چھوڑوں گا؟" یہ میرے دل نے سوال کیا تھا اور کیوں کیا؟ میں نہیں جانتا تھا، میرے اندر سناٹا، بے چینی، یاسیت اور اضطراب پھیلنے لگا۔

☆☆☆

میں لاؤنج میں آیا تو ممی کو آس پاس بکھرے شاپنگ بیگز دیکھ کر بولا۔

"یہ آپ اپنے اردگرد کیا پھیلائے بیٹھی ہیں۔"

"یہ سب میں نے رمل کے لئے خریدا ہے۔"

"م...... ممی!" میں نے کچھ کہنا چاہا مگر ان کے چہرے پر اس وقت رمل کے لئے محبت آمیز جذبات دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

"تمہارے بابا کہتے ہیں، رمل میں ایسا ضرور کچھ ہے جو ولی نے اسے پسند کیا، میں تمہارے فیصلے پر بہت خوش ہوں۔" ممی کی رمل کے لئے اتنی گرم جوشی مجھے چونکا گئی، میرے اندر ابھرتا احتجاج لبوں تک آ کر دم توڑنے لگا۔

"آپ کی رائے اس کے بارے میں اتنی جلدی کیسے بدل گئی۔" اک گھٹن جو پر زور بڑھتی جا رہی تھی۔

"میری رائے کی اہمیت نہیں تمہاری رمل کے لئے اہمیت نظر آنی چاہیے، دو ماہ سے زیادہ ٹائم تمہاری شادی کو گزر چکا ہے، پچھلے ڈیڑھ ماہ سے رمل ہاشم کے گھر ہے، تم ایک بار بھی ملنے نہیں گئے۔" ممی کی باخبری پر میں خود کو ملامت کرنے لگا۔

"تمہاری غیر موجودگی میں آ کر ہمیں مل کر چلی جاتی ہے، مجھے تو ذرا بھی محسوس نہیں تا کہ تم اسے اپنی پسند، مرضی سے بیاہ کر لائے ہو۔"

"خوشی کا اظہار چلا چلا کر کروں۔" مجھے ممی کی بات غصہ دلا گئی، میں چڑ گیا۔

"چلانے کی کیا ضرورت ہے، خوشی کا اظہار چہرے سے عیاں ہو جاتا ہے۔" انہوں نے میرے غصے کی ذرا پرواہ نہ کی۔

"اور آپ کو لگتا ہے میں خوش نہیں ہوں۔"

"مجھے باتوں میں مت الجھاؤ۔" وہ میری ماں تھیں میرے بے معنی حیلے بہانوں سے ہرگز امپریس نہ ہونے والی تھیں۔

"السلام علیکم!" میں نے اور ممی نے بیک وقت لاؤنج کے داخلی دروازے کی طرف دیکھا۔

"وعلیکم السلام!" جواباً میں نے اور ممی نے بڑی گرم جوشی سے جواب دیا۔

ممی تو اسے دیکھ کر خوشی ہوئی تھی اور میں ممی کا شک زائل کرنے کے لئے اس کا اظہار کر رہا تھا۔

ممی نے اک طائرانہ نگاہ سے مجھے گھورا اور رمل کی جانب متوجہ ہو گئیں، جو ہم دونوں کا جوش و خروش دیکھ کر پریشان نہیں تو حیران ضرور ہوئی تھی۔

"ہاشم کیسا ہے؟" اسے اپنے قریب بٹھائے خیر عافیت کا سیشن ممی شروع کر چکی تھیں سو میں نے چپکے سے کھسکنے میں عافیت جانی جونہی قدم دروازے کی جانب بڑھے ممی نے پکار لیا۔

"ولی! رمل اتنے دنوں بعد آئی ہے، تم

کہاں جا رہے ہو؟" وہ مہذب لفظوں کا چناؤ کرتیں مجھے ٹھیک ٹھاک سنا گئیں۔

"اتنے دنوں بعد آئی ہے، اسی لئے چائے بنانے کے لئے کہنے جا رہا ہوں۔" میں نے جلدی سے بات بنا کر ان کو مطمئن کرنا چاہا، میرے قدم باہر بڑھے اور ممی کا رخ رمل کی جانب۔

"آپ بہت اچھی ہیں، بہت محبت کرنے والی۔" میں واپس کمرے میں داخل ہوتا کہ رمل کی آواز پر دروازے میں ہی رک گیا۔

"ولی سے محبت کے بعد بھی اندازہ نہیں ہوا اولاد تو ماں باپ کی کاپی ہوتی ہے۔" ممی اسے گھیرنے لگیں۔

"تم ولی سے محبت کرتی ہو پھر اتنی اداس سی کیوں ہو، تم خوش تو ہو نہ۔" آج ممی ہم سے سچ اگلوانے کے درپے تھیں۔

"پہلے ولی نے تم کو پسند کیا ہو گا۔" ممی سوالیہ نظروں سے رمل کو دیکھ رہی تھیں، اس نے سر اثبات میں ہلا دیا، اس سے پہلے ممی مزید تحقیقاتی سیل کھولتیں میں اندر آ گیا۔

"ممی آپ کی ملازمہ آس پاس کہیں دکھائی نہیں دی۔"

"تم رمل سے باتیں کرو، میں جا کر دیکھتی ہوں۔" ممی باہر کی جانب بڑھیں تو میں صوفے پر بیٹھی رمل پر اک اچٹتی نظر ڈال کر آہستگی سے بولا۔

"ولی نے تم کو کب پسند کیا تھا اور وہ بھی پہلے۔" جواباً وہ خاموش رہی تو میں اس پر قدرے جھکا سخت تیوروں سے دیکھنے لگا۔

"ہم دونوں پسند کرتے، یہ بھی کہا جا سکتا تھا۔"

"لیکن میں آپ سے محبت نہیں کرتی۔" وہ پلکوں کے ساتھ چہرہ بھی جھکا گئی، میں ایک ٹک اسے دیکھتا رہ گیا۔

"تو پھر کیا میں کرتا ہوں۔"

"نہیں۔" اس کا چہرہ میری سفاکی پر تپا تپا محسوس ہونے لگا، مگر مجھے اس وقت اس کی پرواہ نہ تھی۔

"یاد رکھنا، یہ ایک معاہدہ ہے عارضی شادی کا۔"

"جانتی ہوں، دہرانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے دیکھا اس کے چہرے پر عجیب سا رنگ آ کر گزر گیا۔

"اگر بلیک میل کرنے کی کوشش......" میں سلگتی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اب آپ حد سے بڑھ رہے ہیں، مجھے ایسا کچھ کرنے کا شوق نہیں۔" اس کے چہرے پر لمحہ بھر سرخی بڑھ گئی۔

"میں......" میں نے کچھ بولنا چاہا۔

اس نے پلکیں ایک پل کے لئے اٹھائیں مجھے دیکھ کر پھر جھکا گئی، نظروں کا تصادم ہوا تھا، اس کی آنکھیں جس سے بے بسی جھانکتی نظر آئی۔

نجانے یک دم، مجھے اپنے کہے گئے جملوں پر شرمندگی ہوئی، وہ ہنوز سر جھکا کر بیٹھی تھی، میں نے خود کو اس کے سامنے صوفے پر گرا دیا۔

"ہاشم ماموں کیسے ہیں؟" میں نے اپنی کہی گئی بات کا اثر زائل کرنے کے لئے بات بدلنے کی کوشش کی۔

"بہتر ہیں۔" اس نے سر اٹھا کر اک لمحہ مجھے دیکھا پھر دروازے کی جانب دیکھنے لگی۔

وہ بے حد سادہ اور معصوم سی دکھائی دی، نا حق میں نے اسے یہ سب کچھ کہا وہ بے ضرر سی انسان مجھے نقصان پہنچا سکتی تھی بھلا، میں نے بلاوجہ اسے دکھی کیا۔

"اگر کسی بھی مدد کی ضرورت ہو تو مجھ سے کہہ سکتی ہو۔" میں اب تک اپنی کہی بات کی خجالت مٹا رہا تھا۔

"شکریہ۔" وہ اب بھی اتنا ہی بولی۔

میری بات بری طرح سے اسے ہرٹ کی تھی، اس کے یوں کترائے، روٹھے انداز پر مجھے بلاوجہ ہنسی آ گئی، اس نے گردن گھما کر ذرا کی ذرا میرے مسکرانے کو دیکھا پھر دوبارہ دروازے کی جانب دیکھنے لگی، اپنی جگہ سے اٹھ کر میں اس کے قریب آ گیا قدرے جھک کر اس نے تپتے چہرے کو گھورتے ہوئے میں ہولے سے بولا۔

"مجھے یقین ہے تم ایسا کچھ نہیں کرو گی کیونکہ تم بہت اچھی لڑکی ہو، میں اپنے کہے گئے الفاظ واپس لیتا ہوں آئی ایم سوری۔" میں براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا، وہ پلکیں بے ساختہ جھکا گئی، کیا کچھ نہیں تھا ان آنکھوں میں۔

ریمی کو گئے دو ماہ سے زیادہ عرصہ ہو چکا تھا، ہاشم ماموں کی طبیعت سنبھلنے پر نہ آ رہی تھی، ممی الگ پریشان تھیں، گزرے تمام دنوں میں میرا رمل سے کوئی رابطہ نہ ہوا تھا۔

☆☆☆

گلاس ڈور کھول کر میں لغاری صاحب کے آفس میں داخل ہوا تو مجھے دیکھ کر سب میری جانب متوجہ ہو گئے۔

"سوری میں ذرا لیٹ ہو گیا۔" میں معذرت کرتا لغاری صاحب کے برابر بیٹھ گیا، تبھی دروازہ کھول کر رمل اندر داخل ہوئی، اس کے ہاتھ میں کوئی فائل تھی شاید لغاری صاحب نے منگوائی تھی۔

کمرے میں موجود تمام نفوس نے رمل کو سر سے پیر تک دیکھنا اپنا فرض سمجھا، اس کی موجودگی اور تمام لوگوں کا متوجہ ہونا، مجھے بے حد برا معلوم ہوا، وہ مجھے دیکھ چکی تھی اور میری موجودگی اسے تھوڑا سا نروس کر گئی، وہ چل کر لغاری صاحب کی میز کے قریب آئی فائل تھما کر جونہی پلٹی انہوں نے اسے پکار لیا، میں جو اس کے آنے پر چھا جانے والی خاموشی کو توڑتا میٹنگ میں بیٹھے حضرات سے ڈسکشن کرنا شروع ہوا تھا ان کی بات سن کر خاموش ہو گیا۔

"مس رمل! عاصمہ آج نہیں آئی، آپ ذرا چائے سرو کر دیں۔" جہاں لغاری صاحب کی فرمائش پر وہ ٹھٹک کر رکی وہاں بے ساختہ میں نے اپنے لب بھینچ ڈالے۔

انکار کا اس کے پاس کوئی جواز نہ تھا، مرے مرے قدموں سے وہ ریک کی جانب بڑھی تو میں اٹھ کر اس کے قریب چلا آیا۔

"رمل!" میرے پکارنے پر سر اٹھا کر اس نے مجھے دیکھا، ہمیشہ کی طرح اس کے چہرے پر وہی خفت تھی۔

"تم جاؤ صابر (پیون) کو بھیج دو، وہ یہ کام کر لے گا۔" وہ سر جھکا کر تیزی سے باہر نکل گئی اور میں پلٹ کر واپس اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔

لغاری صاحب میرے اس اقدام پر حیرت زدہ تھے ان کی سوالیہ نگاہیں مجھ پر تھیں مگر میں نے اس کی پرواہ نہیں کی، میں اس کمپنی کا مالک تھا کسی کے سامنے جواب دہ نہیں، رمل کی یہ جاب ہرگز نہ تھی، آخر وہ میری کزن بھی تھی۔

☆☆☆

ہاشم ماموں کا انتقال ہو گیا، میں ممی اور بابا کے ساتھ رمل کے گھر آیا تھا، رش اور رمل کی حالت کے پیش نظر میری اس سے ملاقات نہ ہو سکی پورے دن کے بعد ممی مجھے گھیرتی ہوئی رمل کے پاس لے آئیں۔

"تمہاری تسلی اور موجودگی اسے حوصلہ دے گی۔" دروازے کے باہر کھڑی وہ مجھے سمجھا رہی تھیں۔

"میری۔" میں نے خود کی جانب اشارہ کیا اور جواباً ممی خشمگیں نگاہوں سے گھورتی پھر قدرے جتاتے ہوئے بولیں۔

"ہاں تمہاری کیونکہ وہ تمہاری بیوی ہے۔" جواباً میں نے خاموشی اختیار کرنے میں ہی عافیت جانی۔

میں کمرے میں آیا، وہ بے حد چھوٹا کمرا تھا، پلستر اکھڑتی، سیلن زدہ دیوار کے آگے بچھی چٹائی پر بیٹھی وہ زارو قطار رو رہی تھی، میں دھیرے سے چلتا اس کے قریب آ کر رک گیا، مجھے اپنے سامنے پا کر وہ گالوں پر بکھرے آنسوؤں سمیٹنے لگی۔

"حروف تسلی۔" میں سوچنے لگا۔

"اس موقع پر کیا تسلی بھرے حرف کسی کو تسلی دے سکتے ہیں۔" کئی ثانیے کمرے میں تاریکی کے ساتھ خاموشی چھائی رہی، میں نے کمرے میں آویز بلب کو دیکھا جس کی مدھم سی روشنی میں ہم دونوں کے سائے سامنے دیوار پر نمودار ہو رہے تھے، خود کو اس وقت گرفتار مشکل میں پایا، یاد کرنے پر بھی ایک لفظ تسلی کے لئے یاد نہ آیا، میں اس کے دائیں جانب دیوار کو ٹیک لگا کر چٹائی پر اس کے برابر بیٹھ گیا، وہ اب بھی بے آواز رو رہی تھی۔

دائیں طرف والا وجود، دنیا کی نظروں میں میری بیوی اور میرے لئے کاغذی، عارضی تعلق

"تو کیا ایسا ہی تھا؟" میں نے خود سے سوال کیا، یکدم اک احساس نے اس کی ہمت بندھانے کی چاہ کی۔

"یوں مت روؤ، تمہارے رونے سے ہاشم ماموں کی روح کو تکلیف پہنچے گی، بے شک یہ غم ناقابل تلافی ہے اور اتنی جلدی سنبھلنا ناممکن مگر تم خود کو اکیلا مت سمجھنا، ہم سب تمہارے ساتھ، اس غم میں برابر کے شریک ہیں۔" بولنا شروع ہوا تو بولتا ہی چلا گیا، لفظوں نے بھی ساتھ نہ چھوڑا۔

میں نے تسلی کے لئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ ہاتھوں میں چہرا چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"ایسی حالت میں انسان کے پاس سوائے بے بسی کے کچھ نہیں ہوتا۔" ہولے سے بولتا، اس کے گرد بازو پھیلا کر میں نے اسے خود سے لگا کر تھپکی دی، یہ صرف ایک ہمدردانہ فعل تھا جو اس پل مجھ سے سرزد ہوا، صرف چند سیکنڈ بعد وہ جھٹکے سے پیچھے ہٹی اور آہستگی سے بولی۔

"میں خود کو سنبھال لوں گی۔" میں نے ناسمجھی کے عالم میں اس کی جانب دیکھا، وہ اب تیزی سے اٹھ کر کمرے میں مزید لائٹس آن کرنے لگی، میں بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا، سر جھکائے وہ آنکھوں سے چھلکتے آنسو پونچھ رہی تھی۔

نگاہیں چراتا وجود مجھے وہاں سے جانے کا سگنل دے رہا تھا سو میں چلا آیا، حالانکہ مجھے رمل کا ردعمل اچھا نہ لگا تھا۔

☆☆☆

میں تھکا ہارا جیسے ہی اندر داخل ہوا ٹھٹک کر رک گیا، ہاشم ماموں کے انتقال اور رمل کی گھر واپسی کے بعد میں جب بھی کمرے میں داخل ہوتا لائٹ آف ہوتی اور نائٹ بلب جلا ہوا ہوتا تھا، رمل کبھی بھی مجھے کمرے میں دکھائی نہ دیتی، وہ ہمیشہ میرے سونے کے بعد دبے قدموں خاموشی سے آ کر بنا آواز کیے صوفے پر سو جاتی، اگرچہ میری ایسی کوئی ہدایت نہ تھی، یہ احتیاط یا گریز وہ

خود برتی تھی، مگر آج تیز روشنی کی لکیر بند دروازے سے بھی باہر آرہی تھی، اندر داخل ہوا تو وہ صوفے پر بنا تکیے، سکڑی سمٹی پتا نہیں سو رہی تھی یا جاگ رہی تھی، میں اندازہ نہ کر پایا۔

سو نظر انداز کرتا میں ہمیشہ کی طرح واش روم میں گھس گیا، گرم پانی سے نہانے کے بعد تولیے سے سر رگڑتا جب باہر آیا تو وہ یونہی بے حس و حرکت تھی میں بستر پر بیٹھ کر پاؤں کے پاس رکھا کمبل اوڑھ کر لیٹنے ہی والا تھا کہ وہ یکدم ہڑبڑا کر اٹھ گئی شاید آہٹ سے یا...... میں نے رمل کی روئی روئی آنکھوں کو دیکھا۔

"مم...... مجھے ٹمپریچر ہو گیا تھا، ممی نے زبردستی سونے کے لئے بھیج دیا۔" وہ بڑے وضاحتی انداز میں اپنی، مجھ سے پہلے کمرے میں موجودگی کی وجہ بیان کر رہی تھی اس کی آنکھیں بخار کی تپش سے سرخ ہو رہی تھیں یا پھر وہ روتی رہی تھی۔

"ٹمپریچر ابھی بھی ہے۔" میں نے اس کی بات اگنور کر دی۔

"شاید۔" اس نے ہولے سے اپنے ماتھے کو چھوا جیسے بخار کی نوعیت چیک کر رہی ہو اور اس کی یہ بے ساختگی بھرا انداز مجھے ہنسنے پر مجبور کر گیا۔

"میڈیسن لی ہے؟" میں مسکراہٹ ضبط کرتا بولا۔

"جی!" اس نے گردن اثبات میں ہلا دی۔

"کچھ کھایا بھی ہے؟" بنا آواز کے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"تم آرام کرو۔" میں بولا تو وہ لیٹ گئی، لمحہ بھر ٹھہر کر میں نے اپنا کمبل اٹھایا اور بیڈ سے اتر کر اس کے اوپر ڈال دیا، وہ چونک کر اٹھ بیٹھی۔

"یہ...... کمبل۔"

"تم فکر مت کرو، میں گیسٹ روم سے لے آؤں گا۔"

"گڈ نائیٹ۔" میں اپنے بستر پر آکر لیٹ گیا اور میری سوچوں کا دھارا رمل کی طرف موڑنے لگا، ماموں کی وفات کے بعد سے وہ کافی اپ سیٹ تھی، اب تک سنبھل نہ پائی تھی، بقول رمشا خالہ جن روپوں کے لئے وہ میرے ساتھ اس ڈرامے میں شامل ہوئی، وہ بھی اس کی ماں گھر چھڑوانے کے بجائے جانے کہاں خرچ کر چکی تھیں۔

عادلی، عالی، میں اور رمل ہم سب کزن تھے، ہماری زندگیوں میں کتنا فرق تھا، حالانکہ روحان چاچو بھی مالی طور پر اتنے مستحکم نہ تھے مگر انا، مناہل کو رمل جیسے حالات ہرگز فیس نہ کرنے پڑے تھے۔

"اگر انا، رمل کی جگہ ہوتی؟" اک خیال میرے تصور پر ابھرا۔

"وہ یہ سب کیسے کرتی، وہ بہت نازک اور ڈرپوک سی ہے۔" میں تھا انا کے ساتھ اور رمل؟ میں سوچتے سوچتے رک گیا۔

خدا جانے کیوں؟ میں نے ان دونوں کا موزانہ کیا اور یہی موزانہ کرتے کرتے میں نیند کی وادی میں اتر گیا۔

☆☆☆

ممی چاہتی تھی، رمل اب جاب چھوڑ دے، انہوں نے میری مرضی جاننی چاہی تو میں نے رمل کی رضا پر چھوڑ دیا۔

"یہاں سے جانے کے بعد مجھے جاب کی ضرورت ہو گی پھر میں دوبارہ سے جاب تلاش کروں گی۔" وہ میری جانب دیکھے مجھ سے پوچھ رہی تھی اور میں کتنے پل اس کے چہرے سے نظر

نہ ہٹا سکا۔

"او کے تم آفس دوبارہ جوائن کر لو۔" میرے جواب پر اس نے ممنونیت سے سر جھکا لیا۔

☆☆☆

میں ٹیرس کی گرل سے لگا لان میں کام کرتے مالی کو غیر دلچسپی سے دیکھ رہا تھا جب میرا سیل فون بج اٹھا، وہ انا کی کال تھی۔

کتنے دن گزر گئے تھے انا سے بات کیے، وہ اتنی مصروف تھی کہ اس کے پاس وقت ہی نہ تھا اور اسے ڈسٹرب کرنا میں نے بھی مناسب نہ سمجھا، کچھ دنوں کے لئے وہ پاکستان آنا چاہتی تھی اور اس کی پاکستان آمد مجھے بے انتہا خوش کر گئی۔

"میں نے تمہیں بے حد مس کیا ولی۔" اک محبت آمیز انداز لہجہ ساری تھکاوٹ سارے اندیشے سارے خوف اڑا گیا جیسے بارش دیوار سے گرد کو۔

اک دلفریب مسکراہٹ لبوں پر سجائے میں کمرے میں آیا، بیڈ پر رکھی خلیل جبران کی کتاب کو اٹھا کر سائیڈ شلف پر رکھنے کے لئے اٹھائی، بند کرتے کرتے میں رک گیا۔

"محبت ہم پر حکومت کرتی ہے۔" لائن کے نیچے نیلی روشنائی سے درج تحریر مجھے چونکا گئی۔

"محبت آنکھوں سے نہیں دل سے دیکھتی ہے، اس لئے محبت کے دیوتا کو اندھا بتایا گیا ہے۔" یہ شیکسپیئر کا قول تھا، میں جانتا تھا مگر یہ لکھائی کس کی تھی۔

"رمل!" چند سیکنڈ سوچنے کے بعد لبوں پر آ کر ٹھہر گیا وہ کمرے میں اس وقت موجود نہ تھی۔

"رمل کیسے ہو سکتی ہے، کوئی اور بھی نہیں ہو سکتا۔" دماغ نے تفتیشی عمل شروع کر دیا، مجھے رمل کے لکھنے پر حیرت تھی۔

رمل بڑی لئے دیئے رہنے والی لڑکی تھی، اس نے مجھ سے براہ راست بہت کم بات کی تھی اب تک۔

میری حیرت اب سنجیدگی میں بدل گئی، ادرک پر یقین ثابت ہوتا محسوس ہوا تو ناسمجھی میں گھرا لکھے گئے قول میں معانی تلاشنے لگا۔

"محبت کا اندھا دیوتا۔" میری نگاہوں کے پار تحریر دوبارہ گھوم گئی اور اس بارے بے ساختہ میرے لب مسکرا دیئے۔

☆☆☆

میں نے انا کو ائیرپورٹ سے خود ریسو کیا، وہ پہلے سے کہیں زیادہ فریش اور خوبصورت دکھائی دی، سارا راستہ میں اس کی روداد سنتا رہا، اس نے مجھے بولنے کا ذرا بھی موقع نہ دیا۔

"اف تم کتنا بدلتی ہو۔"

"کیوں کیا رمل نہیں بولتی؟" سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ اسٹیرنگ پر جمے میرے ہاتھ پر رکھ دیا، میں چونک سا گیا، اس کے نازک شفاف ہاتھ کو کتنی دیر تک دیکھتا رہ گیا پھر ہلکی سی سانس بھرتے ہوئے اسے دیکھا۔

"تمہیں خوش دیکھ کر بہت اچھا لگا۔" میں نے آہستگی سے کہا، وہ بڑی بے نیازی سے شکریہ بجا لاتی وہی سے دوبارہ سے شروع ہو گئی جہاں رکی تھی۔

☆☆☆

اگلے دن صبح صبح انا میرے گھر موجود تھی، ممی نے انا سے رمل کو میری بیوی کی حیثیت سے متعارف کروایا، مجھے انا کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات بڑے واضح دکھائی دیئے، تبھی تو تنہائی ملتے ہی اس نے اس کا اظہار بھی کر ڈالا۔

"رمل تو بہت معمولی شکل و صورت کی لڑکی ہے، تائی اماں نے کیسے پسند کیا اور تائی اماں کی اتنی محبت اسے یہاں اپنا راج نہ قائم کروا لے۔"

وہ بڑی نخوت سے بول رہی تھی اور مجھے اس کے رمل کے لئے استعمال کیے الفاظ ذرا بھی اچھے نہ لگے، میں نے اسے ٹوک دیا۔

''وہ ایسی نہیں ہے بڑی بے ضرر سی لڑکی ہے۔'' میری فیور پر ذرا کی ذرا اس کی آنکھیں پھیلی پھر سر جھٹک کر وہ قدرے بگڑے ہوئے انداز میں کہنے لگی۔

''مجھے تو اتنی بے ضرر سی نہیں لگی، تائی اماں کی بھرپور محبت حاصل ہے۔''

''ممی کی محبت نہیں، ان کے بیٹے کی محبت اس گھر میں رہے گی۔'' میں نے انا کا موڈ بہتر کرنا چاہا، وہ مسکرا دی مگر اس کی نگاہیں گلاس ونڈو کے پار موجود رمل کا ایکسرے کررہی تھی۔

☆☆☆

اس دن انا کے ساتھ شاپنگ کے دوران میرے دل پر عجیب سی کیفیت حملہ آور ہوئی تاہم میں نے اندر کی لہروں کو اندر ہی دبالیا، اتنے برسوں اور ملاقاتوں کے بعد پہلی بار میں انا کے رویے پر غور کررہا تھا۔

''کہیں میں ضرورت سے زیادہ حساس تو نہیں ہورہا ہوں۔'' میں نے خود سے سوال کیا، وہ اتنا غلط بھی نہیں کررہی۔

انا پرفیوم خرید رہی تھی اس نے میری رائے جاننی چاہی، اس پر فارمین لکھا تھا میں نے انا کو جب اس جانب متوجہ کیا تو وہ مسکراتے ہوئے بڑے آرام سے بولی۔

''آئی نو، میں اپنے فرینڈ ارحم کے لئے لے رہی ہوں، ولی لندن میں اس نے میری بہت مدد کی۔'' اس پل میں نے انا کے چہرے پر کچھ اور طرح کے رنگ دیکھے، مگر میری محبت نے مجھے اتنا سوچنے کہاں دیا۔

''میں اس کے لئے بیسٹ گفٹ لینا چاہتی ہوں۔''

اسے سب یاد تھے، سب کی پرواہ تھی سوائے میرے جبکہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے، مجھے ولید آفندی کو انا آفندی سے کچھ نہیں چاہیے، مگر میرا دل عجیب واہمے کا شکار ہو رہا تھا، وہ میرے پیسوں سے سب کے لئے شاپنگ کررہی تھی اور میں اسے یاد نہ رہا۔

''ان چیزوں سے کیا فرق پڑتا ہے ولی، محبت تو وہ تم سے کرتی ہے۔'' خود کو تسلی دے کر میں نے سر جھٹک کر ان سوچوں سے خود کو نکالا۔

☆☆☆

میں ممی کے کمرے میں آیا تو انہوں نے ایک رنگ مجھے تھمائی، رنگ دیکھ کر میں حیران ہوا۔

''تمہیں خود سے کوئی گفٹ لاکر رمل کو دینے کی توفیق نہیں ہوئی، اب یہ اپنی طرف سے اسے سالگرہ کا گفٹ دے دو۔'' اس دم ممی کے کمرے کا دروازہ کھلا اور رمل اندر چلی آئی۔

''آؤ رمل، یہ ولی تمہارے لئے رنگ لایا ہے بہت خوبصورت ہے پہنا دو۔'' ممی کی تیزی ہم دونوں کو ٹپٹانے کے لئے مجبور کرگئی، ممی کے اشارے پر ناچار میں سرعت سے اٹھ کر اس کے مقابل آکھڑا ہوا، مجھے دیکھ کر لمحہ بھر کو وہ ٹپٹا گئی، اس کا ہاتھ تھامنے کے لئے میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا، بڑی بے بسی سے خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے ہاتھ آگے کردیا، ممی کی نظریں ہم دونوں پر فوکس تھیں، ذرا سا آگے بڑھ کر میں نے اس کا لرزتا ہاتھ تھام لیا اور رنگ اس کی انگلی میں ڈال دی۔

''Happy Birthday۔'' میری آواز کافی دھیمی تھی، مگر میں براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا تھا، اس کا ہاتھ ابھی

بھی میرے ہاتھ میں کانپ رہا تھا، خفت سے اس کا چہرہ لال ہوگیا میری گرفت سے اپنا ہاتھ نکال کر وہ پیچھے ہٹ گئی، اک نامعلوم مسکراہٹ میرے لبوں پر ابھری، عین اسی پل انا اندر داخل ہوئی، ہم دونوں کو ایک دوسرے کے قریب کھڑے دیکھ کر وہ ٹھٹکی۔

''آؤ انا۔'' میں نے اپنا رخ انا کی جانب کیا، رمل اور ممی بھی انا کو دیکھنے لگے۔

''آنے کا وقت نامناسب تو نہیں۔'' اس کا لہجہ سرد تھا، اس کی نگاہ مجھ سے ہوکر ممی پر رک گئی۔

''بالکل نہیں، بیٹھو، ولی رمل کے لئے گفٹ لایا تھا بس وہی دے رہا تھا۔'' ممی مسکرا کر بڑی محبت سے انا کو بیٹھنے کے لئے کہہ رہی تھیں۔

''رمل بیٹھ جاؤ۔'' ممی نے رمل کو اپنے برابر بیڈ پر بیٹھا لیا، جبکہ میں اور انا ایک ہی صوفے کے دونوں کارنر پر بیٹھ گئے۔

''کوئی خاص موقع ہے جو تحفے تحائف کا سلسلہ چل رہا ہے۔'' انا نے گردن گھما کر مجھے اور پھر ممی اور رمل کو دیکھا، میں نے انا کا چبھتا لہجہ محسوس کیا، اس کی جانب پلٹا تو وہ رمل کے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔

''ولی رمل کے لئے یہ رنگ گفٹ لے کر آیا ہے، بس وہی دے رہا تھا۔'' ممی کو انا کا انداز گفتگو ذرا نہ بھایا تھا تبھی رمل کا ہاتھ پکڑ کر انا کے سامنے کرکے جتاتی نظروں سے بولیں، انا نے اک شکوہ کناں نگاہ مجھ پر ڈالی، میں اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''ولی تم نے مجھے تو کبھی ایسا گفٹ نہیں دیا۔'' وہ بڑے تحمل سے ٹھہر ٹھہر کر بولی اور میرے حواس اڑا گئی، ممی نے ایک تحیر آمیز نگاہ ہم دونوں پر ڈالی، میں اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہ گیا۔

''ولی کی بیوی میں بنوں گی، رمل نہیں تائی اماں ولی مجھ سے محبت کرتا ہے، رمل سے شادی تو عارضی ہے جب تک میرا ماسٹرز مکمل نہیں ہوجاتا، اس لئے اس رنگ پر صرف میرا حق ہے۔'' وہ جانے کیا بولے چلے جارہی تھی، ایک تمسخرانہ تبسم اس کے لبوں پر پھیل آیا۔

''رمل کا حق نہیں ہے۔'' وہ جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھی اور دروازہ کھول کر نکل گئی۔

ممی یونہی پتھرائی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں اور سبکی کے احساس سے سر جھکائے رمل لبوں کو کچلے جارہی تھی۔

میں اب تک شاک تھا، یہ سب یوں اس طرح اس طریقے سے ممی کو پتہ نہیں چلنا چاہیے تھا۔

ممی اب بھی بڑی بے یقینی سے مجھے دیکھ رہی تھیں، حد سے زیادہ حیرت کے صدمے سے ان کے لب کھلے رہ گئے۔

''تم میرے ہی بیٹے ہو نا۔'' وہ دھیرے سے یوں بولی جیسے ان کے سوئے ہوئے اعصاب جنبش کھا کر بیدار ہوگئے ہوں تاہم وہ مکمل طور پر اپنی حیرت سمیٹ نہیں پائیں، میری مسلسل خاموشی پر انہوں نے ایک موہوم سی امید پر رمل کی طرف دیکھا، وہ سر جھکائے شرمندہ سی دکھائی دی۔

مجھے لگا جیسے میری ساری ہمت سارے حوصلے ریت کی دیوار کی مانند بیٹھتے جارہے ہوں، پہلی بار میں ان کی محبت کرنے والی آنکھوں سے بے رخی ٹپکتی دیکھی، میں جذبات کی رو میں یہاں تک آگیا کہ انجام کی پرواہ ہی بھول گیا، ممی میری منتظر تھی، خود کو سنبھالتا میں دھیرے دھیرے انہیں سب کچھ بتانے لگا۔

''بس، تم جاؤ، مجھے رمل سے بات کرنی ہے۔'' ممی نے یکسر سخت لہجے میں میری بات

کاٹتے ہوئے کہا، میں ممی کی اداسی محسوس کرتا اٹھ آیا۔

☆☆☆

پورے گھر میں خاموشی کا راج تھا، ممی کمرے میں بند تھیں اور بابا سخت آف موڈ کے ساتھ لائبریری میں، میں کمرے میں آیا۔

رمل آنکھیں کھولے چھت کو گھور رہی تھی، مجھے انا کا رویہ یاد آ گیا، کتنی حقارت تھی اس کے الفاظ میں وہ رمل کو کتنی ناپسندیدگی سے دیکھ رہی تھی۔

"رمل!" میں نے ایکسوز کرنے کے لئے اسے پکارا، وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تم انا کے آج والے رویے کا برا نہ ماننا وہ تھوڑی سی جذباتی لڑکی ہے۔" میں ٹھہر ٹھہر کر انا کا دفاع کرنے لگا۔

اک نگاہ مجھ پر ڈال کر اس نے سر اثبات میں ہلا دیا، میں نے اس کی آنکھوں میں نمی دیکھی، اپنی بے کسی اور بے بسی پر۔

ایک اذیت کی لہر جیسے رگ رگ کاٹنے لگی، یہ ایک دھچکا تھا آگاہی کا، میرے دل نے اس کے درد کو اتنی شدت سے کیوں محسوس کیا؟ آخر کیوں؟

☆☆☆

آج صبح کا سورج میرے لئے اک اذیت بھرا ادرک ثابت ہوا تھا، کاش کاش میں ولید آفندی کبھی انا آفندی کا وہ چہرہ نہ دیکھ سکتا میں اپنی خوش فہمیوں میں جی لیتا، یا کاش میں انا کی دہلیز پر ہی نہ جاتا۔

میں اسے اپنے اور اس کے ساتھ کا یقین دلانے گیا اور وہ بڑی بے دردی کے ساتھ نہ جانے کس سے اپنے اور میرے درمیان قائم رشتے کی دھجیاں بکھرتی ہوئی ملی۔

"اُف۔" میں نے کرب سے دونوں ہاتھوں میں سر تھام لیا، اپنے نام پر میں چونکا اور لاؤنج کے دروازے پر ہی رک گیا۔

"آپ ولی بھائی سے شادی نہیں کریں گی۔" وہ منائل کی آواز تھی اور اس کے مقابل انا بیٹھی تھی جس سے وہ یہ سوال کر رہی تھی۔

"نہیں۔" بڑا مختصر واضح اور سپاٹ انداز تھا۔

میں نے دروازے کے سرے پر رکھے ہاتھ کو مضبوطی سے دروازہ پر جما دیا۔

"انا آپی، ولی بھائی آپ سے محبت کرتے ہیں۔" منائل کی آواز میں ایسی حیرت تھی جیسے انا کا جواب اسے دکھی کر گیا ہو۔

"جانتی ہوں، لیکن میں ولی سے محبت نہیں کی، وہ میرا صرف کزن اور دوست ہے اور......"

وہ لحہ بھر رکی۔

"اور۔" منائل کے لب پھڑ پھڑائے۔

"میرا ATM card۔" وہ اپنے جملوں کی آگ میرے چاروں طرف دہکا گئی تھی کیا کچھ چھپا نہیں اس میں۔

"انا آپی، یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔" وہ اس کی بہن اب بھی حیرت زدہ تھی۔

"تم کتنی سلفش ہو۔"

"میں ارحم سے محبت کرنے لگی ہوں میں نے ولی سے کبھی بھی محبت نہیں کی۔" موہوم سی امید جو دل خوش فہم نے یونہی باندھی اس کا آخری ناتا بھی ٹوٹ گیا۔

وہ دونوں اندر بحث کر رہی تھی اور میرے کان صرف اپنی حیثیت انا کے نزدیک اے ٹی ایم کارڈ سے زیادہ نہیں پر ساکت تھے۔

اس بری طرح سے دھوکا کھانے کا تصور میرے پاس نہ تھا، ایسی ہیبت ناک صورت حال

آئے گی، اس نوبت کا گمان بھی نہ گزرا، میں ٹھٹھرے ہوئے اعصاب اور ماؤف دماغ کے ساتھ بت بنا کھڑا تھا، مجھے لگا جیسے میری روح جسم سے نکلنے لگی ہو یا میرے قدموں سے کسی نے زمین ہی کھینچ لی ہو، احساس تذلیل سے اپنے جسم کا سارا خون چہرہ پر سمٹتا محسوس ہوا، اس کے الفاظ میرے رگ رگ کو چھیدتے ہوئے گزر گئے وہ اب بھی بول رہی تھی، میں جھٹکے سے اپنی جگہ سے پیچھے ہٹا، جیسے اچانک ہی توانائی میرے اندر بھر گئی ہو، گلاس ڈور سے نکلتے ہوئے میں نے پلٹ کر دیکھا جہاں وہ بے حسی سے بول رہی تھی، ماضی کے پردے پر انا آفندی کی تصویر ابھری، اس کے ساتھ گزرے وہ لمحات جو اس پل میرے لئے بدصورت یاد سے زیادہ نہیں تھے، اذیت آمیز لمحات جو میں نے بے خبری میں گزار دیے، اس کا تصور اب میرے لئے جہنم کی آگ سے کم نہیں لگ رہا تھا، میں صرف ایک بار اس کا مکروہ چہرہ دیکھنا چاہتا تھا کہ دھوکا دینے والے کا چہرہ کیسا لگتا ہے مگر دیکھ نہ پایا۔

میں کس کس بات کا ماتم کرتا یوں ایک عورت کے ہاتھوں جذبوں کے لٹ جانے کا، اپنی قسمت کی تاریکی پر، تقدیر کی ستم ظریفی، انا آفندی کی اس بے یقینی سنگدلی پر یا ماں باپ کا دل دکھانے پر اور رمل، دل بہت زور سے ٹوٹا تھا مگر اس کے ٹوٹنے کی صدائیں صرف میں ہی سن سکتا تھا، دور کھڑا سفاک فقروں سے چھلنی کرتا وجود نہیں۔

یہ میری پہلی اور آخری شکست ہے، میرے دل پر یکلخت گہری یاسیت، تھکن اُمڈ آئی، کوئی خیال نہیں تھا کہ جھٹک دیتا، وہ حقیقت تھی سفاک حقیقت اسٹیرنگ پر ہاتھ کا دباؤ ڈالتے ہوئے اذیت سے آنکھیں میچ لیں، وہ کوئی خواب تو نہیں تھا کہ آنکھ کھلنے پر گم ہو جاتا۔

☆☆☆

میں نے سگریٹ نکال کر لبوں سے لگائی اور لائٹر کا شعلہ دکھا کر ایک گہرا کش لے کر دھواں آنکھوں کے سامنے پھیلا لیا اور ہاتھ کا تکیہ بنا کر جوتوں سمیت صوفے پر دراز ہو گیا، تبھی دروازے پر کھٹکا ہوا، کسی نے دستک دی تھی پھر دروازے کو کھلا محسوس کر کے اندر آ گیا، میں نے لیٹے لیٹے رخ موڑ کر دیکھا رمل اندر داخل ہوئی تھی، اس نے قریب کے لیمپ کا بٹن آن کیا اور دوسرے پل کمرے میں قدرے بہتر روشنی ہو گئی، لحہ بھر کو ہم دونوں کی نگاہ ملی پھر میں نے ہی اس پر سے نگاہ ہٹا کر سگریٹ کا ایک اور کش لیا۔

"آپ نے کھانا نہیں کھایا۔"

"تمہیں میرے کھانے کی یا میری پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں۔" میں راکھ جھاڑتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا، میں نے سارا غصہ اس پر نکال دیا۔

"ممی نے پوچھنے کے لئے بھیجا ہے۔"

میرے جواب پر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور اپنی جلد بازی پر، میں قدرے نادم ہو گیا۔

"مجھے بھوک نہیں۔"

"جی۔" سر ہلا کر وہ جونہی پلٹی میں مزید گویا ہوا۔

"ممی کو کہنا میں سو رہا ہوں۔" وہ جاتے جاتے رک کر دروازے کو پکڑ کر ذرا سا پلٹی پھر دروازہ ہلکے سے بند کر کے چلی گئی، میں عجیب سے احساس کے ساتھ دروازے کو دیکھتا رہ گیا۔

میں سلگنا کڑھنا نہیں چاہتا تھا، لیکن اس کا خیال آتے ہی پھر وہی تملاہٹیں اُمڈ اُمڈ کر زخمی کرنے لگتیں اور وہ سب کچھ یاد آ کر سینے میں کھولن بننے لگا۔

میری انا، خود داری، اک صرف، دھوکا،

سراب، خود کا استعمال ہونا، یہ سب میری سوچوں میں آگ سی بھر گیا، میں ولید آفندی آسمان سے زمین پر پٹخ دیا گیا، کہاں کمی سی تھی محبت میں جو تم نے انا آفندی مجھے یوں ذلیل کیا، سوگ تو منانا تھا، اک وقت چاہیے تھا، یہ سب بھولنے اور خود کو سنبھالنے کے لئے، میں خود پر بیتے گئے اس حادثہ کو کیا نام دوں بے وفائی۔

''آہ، یہ تو تب ہوتی جب تم بھی محبت کرتی۔''

رفاقت اتنی جاں افزا نہیں ہوتی، جتنی جدائی جان سوز ہوتی ہے، لوگ جدا ہو جاتے ہیں تو عذاب نازل ہوتا ہے لوگوں کا بدلنا بھی تو جدائی ہے، اک تھکی سانس میرے لبوں سے نکلی اور گزرے لمحوں کی قلم میں اذیت ناکی سے میرے ذہن و نگاہوں کے راستوں سے رینگ رہی تھی، اس کے کرب کا اندازہ صرف میرے دل و دماغ کو تھا۔

☆☆☆

صبح اپنے معمول کے مطابق ہوئی، نہ سانس رکی نہ کوئی اور قیامت آئی بس میرا دل مر گیا تھا، جذبات سے باہر نکل کر اب مجھے اپنی انا، عزت نفس کو بچانا تھا، انا آفندی کے دھتکارنے سے پہلے خود کو اس راستے سے ہٹانا تھا۔

میں فریش ہو کر باہر آیا، ناشتے کی میز پر تینوں افراد کی موجودگی کے باوجود سرما کی شاموں جیسی خاموشی بکھری ہوئی تھی، صرف برتنوں کی ہلکی ہلکی آواز ابھرتی اور دم توڑ دیتی۔

میں کرسی گھسیٹ کر رمل کے برابر میں بیٹھا تو دبیز خاموشی میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا مگر میرے اندر کی خاموشی کا ٹوٹنا ضروری تھا سو میں بابا کو مخاطب کر کے بولا۔

''اب بابا میں انا سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔'' کمرے میں موجود چہروں کے زاویوں میں بڑی تیزی سے تبدیلی آئی تھی، بابا نے چائے کا کپ ہونٹوں سے ہٹا کر ٹیبل پر رکھ دیا۔

''ولی یہ کیا تماشہ ہے؟'' بہت دیر بعد ان کی آواز ابھری میری لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آ کر منجمد ہو گئی، میں سر جھکا کر پیالی سے اٹھتی بھاپ کو دیکھنے لگا اچانک مجھے لگا یہ ساری بھاپ میری آنکھوں میں گھسی جا رہی ہے اور روح میں اترتی جا رہی ہے میں چپ تھا۔

''اب ان بے معنی باتوں کا کیا مطلب ہے؟ میں نے روحان کو آج گھر بلایا ہے۔'' پلکیں جھپک کر میں دھند کو پلکوں کے پار دھکیلتا ہوا بولا۔

''آپ ان کو منع کر دیجئے۔''

''کوئی تو وجہ ہو ولی۔'' میں نے سر اٹھا کر مجروح نظروں سے بابا کو دیکھا پھر ممی کو، جو اب بھی خفگی سے اخبار پر نظریں جمائے ہوئے تھیں بظاہر مگر درحقیقت اس طرف سے بیگانی نہیں تھیں، بے اختیار ذرا کی ذرا ان کی نگاہ مجھ پر پڑی اور میرے ویران چہرے کو جانچ گئی۔

''ولی ابھی نہیں کرنی یا......'' ممی نے اخبار لپیٹ کر ایک طرف رکھ کر پہلی بار براہ راست میرے چہرے کو دیکھا، بابا نے میری طرف دیکھا مگر میں ایک گہرا سانس بھر کر کرسی دھکیل کر اٹھتے ہوئے بولا۔

''کبھی بھی نہیں۔'' اور پھر ٹھہرا نہیں بلکہ لاؤنج سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

''سر! انا آفندی آپ سے ملنے آئی ہیں۔'' انٹرکام پر مجھے اطلاع دی گئی اور لیپ ٹاپ پر چلتا میرا ہاتھ تھم گیا۔

''انہیں بٹھاؤں، بزی ہوں، انتظار کریں

اور مس رمل کو میرے کمرے میں بھیج دیجئے۔''

میں کیا کرنے جا رہا تھا مجھے نہیں معلوم، انا کی آمد ضرور، میرے رات بھر سے اب تک کوئی رابطہ نہ کرنے پر تھی، وہ صبح سے کتنی بار فون اور میسج کر چکی تھیں اور میں نے ایک پر بھی غور نہ کیا۔

میرا دل چاہا کہ ایک ہلکی سی ٹھیس میں انا کو پہنچاؤں، وہ تکلیف، وہ اذیت جو رات بھر میں نے محسوس کی۔

بظاہر بند مٹھی ہونٹوں پر جمائے میں سامنے رکھے لیپ ٹاپ پر نگاہیں جمائے ہوا تھا، مگر دماغ کچھ اور سوچ رہا تھا۔

''آپ نے بلایا؟'' تقریباً سات منٹ بعد رمل میرے آفس میں تھی اور انا کو انتظار کرتے نو منٹ گزر چکے تھے۔

''بیٹھو۔'' میں نے اسے اپنے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا، وہ بنا آواز کیے بیٹھ گئی۔

''صبح میرے آنے کے بعد ممی بابا نے کوئی بات تو نہیں کی۔''

''نہیں۔'' اس نے آہستگی سے سر نفی میں ہلایا۔

میں نے بڑے غور سے رمل کا چہرہ دیکھا اس کی آنکھوں میں تحیر امڈا ہوا تھا، وقت سرکتا تو انا آفندی کا انتظار بڑھنے لگتا۔

اس سے قبل وہ کچھ کہتی انا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی اور ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر ٹھٹک گئی، میں نے اس کے خوبصورت چہرے کو تاریکی میں بدلتے دیکھا۔

''تم آج کہاں بزی ہو۔'' اس نے رمل کی جانب اشارہ کیا تو رمل گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

''نجانے کیوں؟'' وہ رمل کو دیکھ کر تڑپی تھی، اسے مجھ سے محبت تو نہ تھی۔'' میں بس سوچ کر رہ گیا، کہہ نہ پایا حالانکہ میرا دل چیخ چیخ کر پکار رہا تھا کہ اپنے تمام حساب کتاب مانگ لوں، یوم حساب کا دن آ گیا ہے، میرے پلان کے مطابق سب کچھ ویسے ہی تھا۔

''رات سے مجھے نظر انداز کر رہے ہو، اس کے لئے۔'' رمل ایک بار پھر انا کے ٹارگٹ پر تھی، انا کا رمل کو بار بار نشانہ بنانا مجھے غصہ دلا گیا۔

''انا، تم تمیز سے بات کرو، یہ میرا آفس ہے اور......''

''اور یہ تمہاری عارضی بیوی۔'' میری بات مکمل ہونے سے پہلے وہ چیخ پڑی، وہ شاک کی کیفیت میں تھی اسے میری فیور رمل کے لئے اچھی نہ لگی۔

''بیوی، بیوی ہوتی ہے یہ عارضی کیا ہوتا ہے انا۔'' میں ایک ایک لفظ پر زور دیتا بڑے دل جلانے والے انداز میں بولا۔

وہ اب تک شاک کی کیفیت میں تھی، تبھی رمل باہر دروازے کی جانب بڑھی ہی تھی کہ میرے پکارنے پر رک گئی۔

''رمل آئی ایم سوری، ہم پھر بات کریں گے۔'' میرے لہجے میں رمل کے لئے اتنی نرمی دیکھ کر انا اپنے ہونٹ چبانے لگی۔

رمل نے نہ تو پلٹ کر دیکھا اور نہ ہی کوئی جواب دیا بس کمرے سے باہر چلی گئی اور میں اپنی جگہ سے اٹھ کر انا آفندی کے مقابل کھڑا ہو گیا، اس کے چہرے پر نگاہیں جمائے اس کے تاثرات دیکھنے لگا۔

''ولی تم اتنے خفا کیوں ہو؟'' وہ خود کو کافی حد تک سنبھال چکی تھی، میرے چہرے پر اپنے لئے سپاٹ تاثرات اسے الجھن میں ڈال رہے تھے، وہ اب بھی نا سمجھی کی کیفیت میں مجھے دیکھ

رہی تھی مگر میرا ضبط جواب دے چکا تھا۔

"ولی میرے لئے اے ٹی ایم کارڈ سے زیادہ کچھ نہیں۔" اک فقرہ جو مجھے زمین پر پٹخ گیا، وہ آواز کسی اور کی نہیں انا آفندی کی تھی جسے میں نے شدید محبت کی تھی، جس کے لئے میں نے اپنے ماں باپ کا دل دکھایا، رمل کو اذیت بھرے راستے سے گزرا، شاید یہی میری سزا تھی۔

"انا آفندی تمہارا اے ٹی ایم کارڈ (Expire) ہو چکا ہے۔" میں بولا تو اس کے حواس مختل کر گیا۔

"ولی۔" اس کے لب پھڑ پھڑائے، اک بے یقینی تھی انا کی آنکھوں میں۔

"میں ولید آفندی تمہیں اپنی محبت سے آزاد کرتا ہوں۔" میری انا میری محبت انا پہ حاوی ہو ہی گئی۔

"میں تمہیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں تم میرے دل پر حکومت کرتی ہو۔" مگر میرے دل کی آواز اندر ہی گھٹ گئی۔

"ولی۔" وہ منمنائی تو میں نے ہاتھ کے شارے سے اسے بولنے سے روک دیا۔

"انا مجھے گزرے دنوں پر ندامت نہیں افسوس ہے، تم محبت کا دعویٰ کیے بنا بھی مجھے اپنا اے ٹی ایم سمجھ لیتی تو میں سب کچھ تمہارے لئے کرتا کیوں کہ میں تو تم سے محبت کرتا تھا، میں نے اسے دھتکارنا چاہ مگر میں ایسا کر نہ سکا، میری محبت شفاف تھی اس میں کوئی کھوٹ نہ تھی۔"

"محبت مر سکتی ہے۔" اس کے لبوں سے پھسلا اور میرے دل کے اندر کرب کروٹ لینے لگا، وہ مجھے پھر سے امتحان میں ڈالنے کے لئے کھڑی تھی، میں نے اک گہری نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔

"وہ کیوں اب یہ پوچھ رہی ہے۔"

"ہاں انا محبت مر سکتی ہے۔"

"محبت تو اس پودے کی طرح ہے جسے پانی، ہوا بڑھنے میں مدد دیتے ہیں، نہ دو تو سوکھ جاتا ہے۔"

میری عزت نفس انا آفندی کا مزید شکار بننے کو تیار نہ تھی، تبھی تو میرا دل آج انا آفندی کے خوبصورت چہرے اور دلکش محبت بھرے انداز پر دھڑکنا بند ہو چکا تھا۔

"ولی ایک بار میری بات تو سن لو۔" وہ عاجزی سے میری جانب بڑھی مگر میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔

"ولید آفندی کو کسی کی خواہش نہیں، میں تم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔" وہ رو رہی تھی اور میرا دل تڑپ رہا تھا مگر میرے چہرے پر ابھرتا سکون اسے حیران و پریشان کر رہا ہوگا، روتے ہوئے اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"ولی میں تم سے محبت......" میں نے ٹوک دیا۔

"اب اور نہیں انا، تم جا سکتی ہو۔"

"میں پھر آؤں گی، اس پل تم غصے میں ہو، تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔" وہ اپنی نم آنکھیں میرے چہرے پر سجائے بڑے وثوق سے کہہ رہی تھی اور میرا دل انا آفندی کی محبت سے خالی ہوا جا رہا تھا، یہ سچ تھا میں اسے دھتکار نہ سکا اور خود کو اس کی زندگی میں نکال لیا۔

وہ شکستہ قدموں سے لوٹی یا نہیں، میں نہیں جانتا، درد، سسکیاں، کیا کچھ نہیں چھپا تھا۔

"کیا محبت مر سکتی ہے؟" میرے کانوں کے قریب وہ اب بھی کھڑی پوچھ رہی تھی۔

"مفاد پرست لوگوں کی محبت مر سکتی ہے۔"

لیکن اس محبت میں میرا مفاد کہاں تھا۔

"وہ پھر آئے گی۔" وہ کہہ کر گئی تھی۔

"انا اپنی طرف آنے والے تمہارے سارے راستے میں خود ہی بند کر چکا ہوں۔" میں نے اک گہرا سانس بھر کے خود کو کرسی پر گرا لیا، میں اس لمحے ہر سوچ کو دور پھینکنا چاہتا تھا۔

☆☆☆

وہ گھر جانے کی بجائے بے مقصد سڑک کے کنارے درختوں کی لمبی سی قطار کے نیچے کنارے کنارے چلنے لگی، جا بجا سوکھے پتے بکھری ہوئے تھے جو قدموں تلے آ کر چرمرا رہے تھے اسے لگا اس کی زندگی بھی شاخ سے ٹوٹا ہوا پتا بن کر رہ جائے گی۔

بے حیثیت، بے نوا، بے کس، وقت کی ہوا جہاں چاہے گی اڑاتی لے جائے گی اس کا ذہن ولی کی باتوں اور ان کے طنزیہ فقروں میں الجھا ہوا تھا، اس نے محسوس کیا اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی ہیں، ہر چیز دھندلی دھندلی نظر آ رہی ہے بس ایک تصویر تھی جو صاف اور واضح تھی جو اس کے دل کے جزدان میں ابھری تھی، وہ رک گئی، سامنے ہی اسٹاپ تھا، بارش کی بوندیں تیز ہونے لگیں وہ اسٹاپ پر موجود کھردری سطح والے بینچ پر بیٹھ کر بارش کے رکنے کا انتظار کرنے لگی، اس کا دل عجیب کیفیت کا شکار ہو رہا تھا، اپنی حیثیت بے نوا، بے کس سی معلوم ہو رہی تھی۔

میں بڑی بددلی سے آفس سے نکلا تو بارش اپنے جوبن پر شروع ہو چکی تھی۔

"آہ محبت، شاید دکھ ہی دکھ ہے، وصل کی چھاؤں ہو یا ہجر کی دھوپ، نہ بکھرنے دیتی ہے نہ جڑنے۔" سڑک پر اچھی خاصی رونق تھی مگر میرے اندر تو سناٹا اترا ہوا تھا اور اپنے اندر کا یہ سناٹا مجھے ہر شے پر محسوس ہو رہا تھا، درخت بھی مجھے بے حد خاموش، ملول اور اداس اداس سے دکھائی دے رہے تھے، افسردگی میں ڈھلے جیسے میرے دل کے ہمراہ رو رہے ہوں، اچانک مجھے سڑک کے کنارے بینچ پر بیٹھی رمل دکھائی دی، میں نے قدرے نزدیک جا کر گاڑی روک دی، معذرت بھی کرنی تھی، دوپہر میری اور انا کی لڑائی میں وہ خواہ مخواہ نشانہ بن گئی تھی، میں نے ہارن بجایا تو ذرا سا گھوم کر اس نے دیکھا، میں نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا، وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر آئی اور کھلے دروازے سے اندر جھانک کر بولی۔

"شکریہ میں چلی جاؤں گی۔" مجھے اس کا لہجہ قدرے روکھا سا لگا، شاید وہ دوپہر والے واقعے پر خفا تھی، وہ ناراض ہو سکتی تھی، مجھے اپنی اور انا کی جنگ میں اسے شامل نہیں کرنا چاہیے تھا۔

"آ جاؤ، رمل میں گھر ہی جا رہا ہوں تم سے بات بھی کرنی ہے۔" دو تین منٹ کشمکش و پنج میں مبتلا کھڑی بارش میں بھیگتی رہی پھر آ کر بیٹھ گئی، اس کا انداز خفگی لئے تھا اور میرے لبوں پر بے ساختہ ایک مسکراہٹ بکھر آئی۔

"تم میرے ساتھ سفر کرنے سے تو ڈر نہیں رہی۔" میں نے یونہی بات شروع کرنے کے لئے کہا، وہ میری بات پر حیران ہوئی پھر ٹھنک کر بولی۔

"کیوں؟ میں کیوں ڈروں گی۔" میں نے ہلکے سے گردن موڑ کر اسے دیکھا وہ سامنے ونڈ اسکرین کے پار برستی بارش کو دیکھ رہی تھی۔

"اس لئے کہ آفس کا کوئی فرد ہمیں ایک ساتھ نہ دیکھ لے پھر اسکینڈل بن جائے گا۔" میں ہلکے سے مسکرایا جواباً وہ بنا کسی تاثر کے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی، میں اس پل اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا سو پوچھنے لگا۔

"کب تک جاب کرو گی۔" میرے سوال

اسے حیران کر رہے تھے چہرہ موڑے کتنے پل وہ مجھے گھورتی رہی پھر اس کے لبوں نے جنبش کی۔

"آپ نکالنا چاہتے ہیں۔"

"یہ کیوں سوچا۔" میں نے ابرو اچکا کر قیاس کیا۔

"آپ نے یہ کیوں پوچھا؟" وہ میرے ہی انداز میں جواباً بولی تو میں بے ساختہ مسکرا دیا۔

"دو سال پورے ہونے والے ہیں ہمارے اس عارضی بندھن کو اور تمہاری اماں تمہیں گھر سے نکال چکی ہیں، اب کہاں رہنے کے ارادے ہیں۔" میں خاصی بے پروائی بھرے انداز میں پوچھ رہا تھا۔

وہ میری طرف دیکھ کر رہ گئی شاید اسے مجھ سے ابھی بھی اتنی سفاکی کی امید نہ تھی۔

"رمشا پھپھو کے گھر کچھ دن رہوں گی، بعد میں ہوسٹل چلی جاؤں گی۔" اس کی آواز اتنی دھیمی تھی جیسے بامشکل بول پا رہی ہو، ایک ثانیہ کے لئے میں خاموش ہو گیا پھر دوبارہ سے گویا ہوا۔

"اتنا عرصہ ساتھ رہنے سے تمہارے ہمارے درمیان قائم رشتے کو لے کر کوئی جذبات پیدا نہیں ہوئے۔"

میں نے ونڈ اسکرین سے باہر برستی بارش کو دیکھتے ہوئے آہستگی سے پوچھا، بارش کی وجہ سے کار کی رفتار کافی کم تھی، میں اس کے جواب کا منتظر تھا کئی ثانیے گاڑی میں خاموشی چھائی رہی، ابرو اچکا کر میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"کیسے جذبات۔" اس کا چہرا بالکل سپاٹ تھا، آواز میں بھی کھردرا پن سا تھا، پتا نہیں اہانت کا احساس ہوا تھا یا۔

"کیا مجھے فیلنگ کو بیان کرنا پڑے گا۔" بے ساختہ میرے لبوں سے پھسلا اور وہ لب بھینچے شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

"میں تمہارا جواب چاہتا ہوں۔" میں نے دوبارہ اسے متوجہ کیا۔

"آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں صاف صاف بات کریں۔" اپنے لہجے میں مضبوطی بھرتے ہوئے وہ بولی تھی، میں اس سے کیا کہتا کہ ہمارے مابین جو رشتہ ہے اس کو قبول کر لو کہ محبت تو ہو چکی تھی۔

"یہی کہ تم چاہو تو ہمارے گھر رہ سکتی ہو ہمیشہ کے لئے اگر تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔" میں نے لفظ اب پر خاصا زور دیا، وہ چونکی تھی، یوں محسوس ہوا جیسے وہ خود کو سنبھال رہی ہو۔

"ہم نے کمٹ منٹ کی تھی۔" اس نے مجھے کچھ یاد دلانے کی کوشش کی۔

"مجھے سب یاد ہے ذرا ذرا سا۔" میرے لب بے ساختہ مسکرا دیئے، وہ ایک بار پھر سے خاموشی کا لبادہ اوڑھ گئی تو مجھے اسے متوجہ کرنا پڑا۔

"تم نے میری کسی بات کا جواب نہیں دیا۔"

"جیسے کہ۔"

"جیسے کہ میری ڈائری پر تم نے شیکسپیئر کا قول لکھا تھا، محبت آنکھوں سے نہیں دل سے ہوتی ہے اس لئے محبت کے دیوتا اندھے ہوتے ہیں۔" وہ گڑبڑا گئی تھی، وضاحتی انداز اپنایا ہی کہ میں بول پڑا۔

"تم نے اندھا دیوتا مجھے کہا تھا۔" میں براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک کر پوچھ رہا تھا۔

"میں نے کہیں پڑھا تھا یاد رہا اور......"

"سو میری ڈائری میں لکھ دیا۔" میں نے اس کا فقرہ مکمل کر دیا، وہ شرمندگی سے سر جھکا گئی اور اک زیر خند یاد، میرے چہرے پر زخمی مسکراہٹ بکھیر گئی۔

"ہاں محبت کا دیوتا اندھا ہوتا ہے، جبھی تو یہ کچھ محسوس کر پاتا ہے نہ دیکھ۔" دھیمے لہجے میں گویا ہوا۔

"مگر ہم اس جذبے سے خود کو روک نہیں سکتے یہ کب ہمیں اپنا اسیر کر لے کیا خبر۔" وہ ہولے سے بولی تو میں چونک گیا، میرا پاؤں بے اختیار بریک پر پڑا، حیرت زدہ انکشاف سے خود کو سنبھالتے ہوئے میں نے گاڑی سائیڈ پر روک دی، اپنی بے اختیاری پر قابو پاتی وہ مجھ سے گاڑی روکنے کی وجہ پوچھنے لگی۔

"آپ نے گاڑی کیوں روک دی؟" میں پہلو بدل کر اس کی طرف رخ کرتا ہوا بولا۔

"تم کسی سے محبت کرتی ہو۔"

"محبت طویل قربتوں کا ردعمل نہیں بلکہ یہ تو وحی کی طرح ہمارے دلوں میں اتر جاتی ہے، ہاں رل، وہ لمحہ جس میں تمہیں محبت ہوئی اور میرے دل سے محسوس کرنا شروع کی، کیا اعتراف محبت اتنا ہی مشکل ہے۔" یہ میرے دل کی آواز تھی۔

"ن...... نہ...... نہیں۔" اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبا کر تیزی سے نفی میں سر ہلایا، میں نے اس کی آنکھوں میں ابھرتے پانی کو دیکھا وہ نم آنکھیں لئے مجھے دیکھ رہی تھی، ان نم آنکھوں میں، میں نے اک عکس دیکھا، ایک گہری سانس بے ساختہ میرے لبوں سے خارج ہو گئی۔

"مجھے اپنا عکس اس کی آنکھوں میں دکھائی دیا تھا اور یہ فطری عمل تھا اگر وہ مجھ سے محبت کر بیٹھی تھی تو، میں اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا اس کا شوہر، چاہتے نہ چاہتے بھی وہ میرے نکاح میں تھی، حقیقت اور سچائی کی روشنی میں میری منکوحہ، ایک چھت تلے ہم نے کئی ماہ

ساتھ گزارے تھے ایک دوسرے کے غم بانٹتے ہوئے۔

میرے آبلے دل پر اک پھوار پڑی تھی۔
لمبی مسافت کے بعد، تھکن سے چور، ٹھہراؤ کے لئے آسرا، میں رمل کو ہر گز نہیں بتاؤں گا کہ میں جان گیا ہوں وہ مجھ سے محبت کر چکی ہے، میں اسے مان، عزت ضرور دوں گا۔

میرا دل ابھی زخمی تھا اتنی جلدی زخم بھر نہیں سکتا تھا مگر میں کسی اور کا دل زخمی نہیں ہونے دوں گا، میں تم سے محبت کروں گا، رمل مگر کچھ وقت درکار ہے، پرانے زخم بھرنے کے لئے ہاں میں تمہارے دل کو ٹھیس ہر گز نہیں لگنے دوں گا، وہ میری خود پر مسلسل مرکوز نگاہ دیکھ کر نروس سی ہونے لگی تو میں نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا، وہ شاکڈ ہوئی تھی اس کی نگاہ میرے ہاتھ میں تھمے اپنے ہاتھ پر تھی، وہ آنسوؤں کو روکنے کی کوشش میں مجھ پر مزید عیاں ہوتی جا رہی تھی۔

"آؤ، گھر چلیں جہاں ممی بابا ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔" میں نے اس کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ لیا، وہ پلکوں کو جھپکتی ہاتھ چھڑانے لگی، میں نے اس کے ہاتھوں کو اور مضبوطی سے تھام لیا، وہ رونے لگی تھی، شاید تشکر کے آنسو تھے، رکے آنسو گالوں پر بہنے لگے۔

"رمل، میں اپنی پوری زندگی تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں اور جب ہم اس سفر پر ساتھ ہے تو ہمارے دل بھی ایک ساتھ ہوں گے اور پھر مجھے تم سے محبت ہو جائے گی اور......" میں نے اس کی دھندلائی آنکھوں میں جھانکا۔

"اور تمہیں بھی۔" میں معنی خیزی سے مسکرا دیا جبکہ وہ بے اختیار نگاہ پھرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی، اس سمے وہ مجھے بہت معصوم اور پیاری لگی تھی۔

میں نے اسے مزید تنگ نہ کیا، اس کے گالوں پہ بکھرے آنسوؤں سمیٹتا، گاڑی اسٹارٹ کر کے گھر جانے والے راستے پر ڈال دی، ذرا کی ذرا گردن گھما کر اک اچٹتی نگاہ رمل پر ڈالی، وہ اب بھی بے آواز روتی، کھڑکی سے باہر بھاگتے نظاروں کو دیکھ رہی تھی، برستی بارش میرے دل کی سطح پر بھی گر رہی تھی۔

"تمہیں مجھ سے محبت ہو گی ہے۔" میرے لبوں نے بے آواز فقرہ ادا کیا اور دل میں طمانیت اتر آئی کیونکہ اب میرا دل چاہنے لگا تھا کہ کوئی مجھ سے محبت کریں اب منزل تک جانے والا راستہ بے حد شفاف اور روشن تھا۔

اور ساتھ بیٹھے وجود نے باہر برستی بارش کو دیکھتے سوچا، کتنا عجیب تھا یہ سب کچھ؟

میں نے سنڈریلا والی کہانی کے خواب کبھی نہیں دیکھے، میں نے زندگی کو حقیقت پسندی سے گزرا تھا اور مجھے سنڈریلا جیسی زندگی مل گئی، حالانکہ نہ تو میں سنڈریلا کی طرح خوبصورت تھی اور نہ میرا دل ویسا جس نے محبت کی خواہش کی ہو۔

مگر محبت پھر بھی ہم پر حکومت کرتی ہے تبھی تو میرا دل میرے آگے بے بس ہو گیا اور مجھے ولید آفندی سے محبت ہو گی تھی

☆☆☆

ننو کی گڑیا

سائرہ غفار

آنسو اس کے رخسار پر بہتے چلے آرہے تھے وہ مسلسل اپنی میلی سی ہتھیلیوں سے اپنے آنسو پونچھ رہی تھی پھر بھی مسلسل بارش برسے ہی جا رہی تھی، قصہ مختصر یہ کہ ننو ایک آٹھ سال کی گول مٹول سی سرخ وسفید سی بچی تھی اور اس کا قصور محض اتنا سا تھا کہ وہ ایک فقیر کی اولاد تھی، عام بچوں کو (چاہے امیر ہوں کہ غریب) پھر بھی دنیا کی کئی نعمتیں میسر آہی جاتی ہیں مگر ننو......؟ اس کی تو بس ایک یہ خواہش تھی، ایک ہی آرزو تھی، اور وہ آرزو، وہ خواہش تھی، ایک خوبصورت سی لال فراک پہنے گڑیا۔

ایک دن ننو سڑک پر کھڑی بھیک مانگ رہی تھی کہ اس کی نظر ایک چمچماتی سوئفٹ پر پڑی جو چند سیکنڈ پہلے ایک کونے پر بنی کارپارکنگ میں آکر رکی تھی، اس کے قدم خود بخود سوئفٹ کی طرف بڑھنے لگے، وہ سوئفٹ کے سامنے پہنچ کر شیشے پر ہاتھ مارنے لگی، شیشہ جونہی نیچے اترا، اس کی نظر لال فراک پہنے اس گڑیا پر پڑی، اس نے دم بخود ہو کر گڑیا کو دیکھنا شروع کر دیا جیسے ہپناٹائز ہو گئی ہو، پلکیں جھپکائے بغیر وہ محض گڑیا کو گھورے جا رہے تھی، پھر اچانک اس سے ایک خطا سرزد ہو گی، اس نے بے اختیار ہی ہاتھ بڑھا کر گڑیا کو چھوا، اس کا ہاتھ کیا گڑیا سے ٹکرایا ایک کہرام سا بپا ہو گیا، گاڑی میں موجود نرم ونازک، چھوٹی موٹی سی، گڑیا کی مالکن، کار کے مالکوں کی گڑیا نے بھاں بھاں کر کے رونا چلانا شروع کر دیا۔

”اس گندی لڑکی نے میری گڑیا گندی کر دی...... امی...... پپا...... میری گڑیا...... او مائی گاڈ......اب میری گڑیا کو فلو ہو جائے گا امی...... پپا......ڈاکٹر کے پاس چلیں۔“

سوئفٹ کے مالکوں نے ننو کی ٹھیک ٹھاک عزت افزائی کی، امی صاحبہ بولیں۔

"چھوڑیں کامی! ایسے لوگوں کے منہ نہیں لگتے اور تبسم بیٹا آپ روئیے مت ہم آپ کو گڑیا کو ڈیٹول سے نہلا دیں گے، یہ ہائی جینک ہو جائے گی، نجانے یہ لوگ کیسی کیسی بیماریاں ساتھ لے کر چلتے ہیں، اُف کامی جلدی چلیں ناں، دیکھیں تو تبسم کتنا رو رہی ہے۔" سوفٹ اسٹارٹ ہوئی اور دھول اڑاتی شہر کی سڑکوں پہ کھوگئی۔

بے عزتی اور ہتک کے احساس سے ننو کا رواں رواں کانپنے لگا، اس سے پہلے کبھی اس کے ساتھ ایسا نہیں ہوا تھا، وہ مسلسل روئے چلی جا رہی تھی، اپنے رخسار زور زور سے رگڑتے ہوئے وہ وہیں پارکنگ ایریا کے ساتھ بنے چبوترے کے کونے پہ ٹک گئی، سامنے کئی مزدور قطاریں لگائے بیٹھے تھے، ایک مزدور نے بڑی لگاوٹ سے پوچھا۔

"کیا ہوا ہے بھئی؟ کیوں رو رہی ہو؟" ننو نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا وہ بڑی بے باکی کے ساتھ اس کے جسم پر نظریں جمائے بیٹھا تھا اور سگریٹ کے کش پہ کش لیے جا رہا تھا، ننو کو ہر طرح کی نظروں کی بڑی اچھی پہچان تھی، وہ فوراً وہاں سے اٹھ گئی اور سڑک کے دوسری طرف پہنچ گئی، اپنے پیچھے اس نے اس مزدور کی آواز سنی۔

"لو جی ہمدردی کا تو زمانہ ہی نہیں ہے۔" پھر اس نے بھیانک سا قہقہہ لگایا، ننو کے تن بدن میں آگ لگ گئی مگر وہ خاموشی سے وہاں سے کھسک گئی۔

اس کا ننھا سا دل ابھی تک گڑیا کے واقعے میں اٹکا ہوا تھا، رات کو سوتے سے وہ اچانک ہڑبڑا کر جاگ گئی، خواب میں اس نے دیکھا تھا کہ لال فراک پہنے گڑیا اس کے بغل میں سوئی ہوئی ہے، وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور آنکھیں مل مل کر وہ دوبارہ لیٹ گئی اور آنکھیں موند لیں، گڑیا کے خیالوں میں کھوئے نجانے کب وہ نیند کی وادی میں اتر گئی، صبح اماں کے ٹھڈوں نے اسے جگایا، وہ جلدی سے دو چھپاکے پانی کے منہ پہ مارتی اماں کے پیچھے پیچھے ہولی، سارا دن کسلمندی کے ساتھ سڑک کے کنارے لگے درخت کے نیچے ہاتھ پھیلائے بیٹھی رہی اور خیالوں میں گڑیا گھومتی رہی، دوپہر کو جاموا سے ڈھونڈتا ہوا آ گیا۔

"کیوں ری آج کیوں اتنی کم کمائی کی ہے چھوری؟" وہ بالوں کو چھڑانے کے لئے چیختی رہی مگر اماں نے جب تک پیٹ بھر کے اس کو گالیاں نہیں دیں تب تک اسے چھوڑا نہیں، دوپہر کے کھانے کے چند لقمے زہر مار کر وہ اٹھ گئی اور پھر سے بھیک مانگنے میں مصروف ہوگئی۔

رات گئے جھونپڑی میں لوٹنے کے بعد ننو نے اماں سے کہا۔

"اماں مجھے چند روپے چاہئیں۔"

"کیوں ری؟ کیا کرنے ہیں تو نے روپے؟" اماں نے دونوں بازو کمر پر جما کر کرخت لہجے میں پوچھا۔

"بس چاہئیں۔" گڑیا خریدنے کی خواہش کا ذکر کرتے کرتے وہ جھجک گئی۔

"چپ چاپ سو جا، کم بخت ایک تو کماتی کم ہے اوپر سے عیاشیاں کرنی ہیں چل دفع ہو ادھر سے، کم کر اپنی شکل۔" اماں نے اسے دھکا دیا، وہ دوڑتی، روتی، ننگے پاؤں جھونپڑی سے باہر نکل گئی اس کا ننھا سا دل دکھ سے بھر گیا تھا، تھی تو ایک معصوم بچی ہی ناں، دوڑتے بھاگتے روتے وہ جھونپڑیوں کے پیچھے بنی چند قبروں کے پاس جا بیٹھی، یہاں کل آٹھ قبریں تھیں جن میں سے تیسری قبر ننو کے باپو کی تھی، وہ باپو کی قبر کے پاس بیٹھ کر زور زور سے رونے اور بین کرنے لگی، رو رو کر ساری کتھا قبر میں سوئے باپو کو سنائی پھر قبر سے لپٹ کر سسکنے لگی اور سسکتے سسکتے وہیں سوگئی، صبح جب جاموا سے اٹھانے آیا تو وہ چپ چاپ اس کے ساتھ بھیک مانگنے نکل کھڑی ہوئی، اس دن ننو نے اس قدر دل جمی کے ساتھ بھیک مانگی کہ مالا مال ہوگئی، اماں اس کے کمائے نوٹوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں، رات گہری ہوتے ہی ننو خاموشی سے اپنے بستر سے نکلی اور پیچھے بنے قبرستان میں آ کر باپو کی قبر کے سامنے دو زانو بیٹھ گئی، چند لمحے بیٹھی چپ چاپ قبر کو دیکھتی رہی، پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر انگلی ہونٹوں پر رکھ کر ہش کیا اور باپو کی قبر کے ساتھ مٹی کھود کر مٹھی میں دبے چند روپے نکال کر اس گڑھے میں ڈال کر اوپر سے مٹی برابر کر دی، پھر خاموشی سے اٹھ کر واپس جھونپڑی میں آ کر سوگئی۔

چند ہفتوں تک ننو کا یہی معمول رہا، پھر ایک دن جب اسے اندازہ ہوا کہ اچھی خاصی رقم جمع ہوگیا ہے اور اب وہ ایک عدد گڑیا خرید سکتی ہے، تو وہ تپتی دوپہر میں باپو کی قبر کے پہلو سے اپنا خزانہ نکال لائی اور بازار میں داخل ہوگئی، کچھ خریدنے کی طاقت جب انسان میں آ جاتی ہے تو اس کی چال میں عجیب سا اطمینان اور وقار پیدا ہو جاتا ہے، ایسی ہی باوقار چال چلتی ننو بھی بازار کی گلیوں میں گھومتی گھامتی کھلونوں کی دکان کے پاس پہنچ گئی، تمام کھلونوں کو جانچتی پرکھتی بالآخر لال فراک پہنے گڑیا اسے ننو کی آنکھیں چار ہوئی اور ننو کی آنکھیں چمکنے لگیں، عین اس لمحے کسی مضبوط ہاتھ نے اس کا گریبان سختی سے پکڑ لیا، ننو نے پہلے حیرت زدہ انداز میں اپنے گریبان کو پکڑے ہاتھ کو پھر ہاتھ والے انسان کو دیکھا، وہ ایک لمبا سا آدمی تھا، جس کی آنکھوں میں خباثت کی سرخی پھیلی ہوئی تھی، اس نے ڈانٹنے کے سے انداز میں پوچھا۔

"کیا کر رہی ہے ادھر؟"

"وہ...... وہ...... گگ...... گڑیا؟" ننو ا ٹکنے لگی، اس کے رخسار پھر سے بھیگنے لگے تھے، اس کے دل کو ایک بار پھر زبردست ٹھیس پہنچی تھی۔

"اچھا تو اب یہ زمانہ آ گیا ہے کہ فقیر چوری کرنے لگے ہیں۔" وہ آدمی زور سے بولا تو اردگرد کے لوگ جمع ہونے لگے۔

"نن...... نہیں...... مم...... میں نے...... چچ...... چوری...... نہیں۔" ننو سے بولا ہی نہیں گیا، وہ تو بس قسمت کی ستم ظریفی پہ حد درجے حیران تھی۔

"چل نکل یہاں سے اور اگر آئندہ یہاں کا رخ بھی کیا تو اچھا نہیں ہوگا۔" اس آدمی نے ننو کا گریبان چھوڑتے ہوئے عجیب سے انداز سے ننو کے سارے جسم پر ہاتھ پھیرا تو وہ دہل کر رہ گئی، وہ دوڑ کر وہاں سے دور بھاگنے لگی، پیچھے سے اس نے ویسی ہی مکروہ اور بھیانک قہقہے کی آواز سنی جیسی اس مزدور کی تھی، وہ دوڑتی، روتی، بلکتی خواہ مخواہ کے احساس جرم سے لدی پھندی باپو کی قبر کے پاس آ بیٹھی اور پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے سب باپو کو کہہ سنایا، پھر اس نے ڈھیر سے آنسو پونچھے، اس نے یہ حقیقت تسلیم کر لی تھی کہ وہ ایک چھوٹی بچی نہیں ہے، وہ محض ایک فقیر ہے، فقیر بنت فقیر، اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے باپو کی قبر کے پہلو میں مٹی کھود کر گڑھا بنایا پھر ساری جمع پونجی اس گڑھے میں ڈال کر مٹی برابر کر کے کپڑے اور ہاتھ جھاڑتی بھیک مانگنے چل دی، ننو نے اپنی جمع پونجی کے ساتھ ساتھ گڑیا خریدنے کی خواہش بھی باپو کے پہلو میں دفنا دی تھی۔

☆☆☆

کاسۂ دل

سندس جبیں

آٹھویں قسط

اگلی صبح مرینہ اور تیمور احمد واپس اسلام آباد کے لئے نکل گئے تھے، اسید ان سے نہیں ملا تھا، مرینہ نے اس سے ملنے کی کوشش کی تھی مگر اسید نے ملازمہ کے ہاتھ پیغام بجھوا دیا تھا کہ وہ سو رہا ہے، مرینہ سب سمجھتی تھیں مگر چپ رہیں، وقت واقعی بدل چکا تھا، کل کا زیر آج زبر بن چکا تھا۔

وہ دونوں اس سے ملے بغیر چلے گئے، جو بھی تھا مگر اندر ہی اندر تیمور بہرحال مطمئن تھے، انہوں نے اسید کا بدلا ہوا رویہ دیکھ لیا تھا اور اب وہ پہلے کی طرح خوفزدہ اور ڈرے ہوئے نہیں تھے، انہیں رخصت کر کے حبا بہت دیر تک لان میں پھرتی رہی، یہ جنوری کی ایک دھندلی صبح تھی اور پورا لان ہلکے ہلکے سفید بادلوں سے گھرا ہوا تھا، دھند کے مرغولوں نے اونچے درختوں کی شاخوں کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا، بے خیالی میں چلتے ہوئے وہ کھجور کے تناور درخت کے پاس

ناولٹ

رک گئی، کچھ سوچ کر اس نے بالوں میں لگی ہیر پن اتاری اور درخت کے تنے پہ کھرچنے لگی، کچھ دیر بعد اس نے پیچھے ہٹ کر دیکھا تو اس درخت کے سپاٹ تنے پہ "اسید" کا نام بہت خوش نما لگ رہا تھا۔

تمہارا اور میرا نام، جنگل میں درختوں پر
ابھی لکھا ہوا ہے تم کچھ جا کے مٹاؤ
بہار آتی ہے لیکن ان درختوں پر نہیں آتی
ہمارے نام پڑھتی ہے تو واپس لوٹ جاتی ہے
یہی ہر بار ہوتا ہے، وہ راستے جن پر مڑ کر
کبھی نہ ہم آئے، نہ تم آئے
اب آیا ہوں تو یہ کہتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں
اکیلے پھر نہیں آنا، اکیلے پھر نہیں آنا

اس نے ہاتھ پھیر کر اس نام کو محسوس کیا اور پھر دھیرے سے آگے بڑھ گئی، زندگی میں کچھ چیزیں کبھی واپس نہیں ملتیں، نہ وہ پیار جو ہم اپنی

لاپروائی کے باعث کھو دیتے ہیں اور نہ وہ خالص پن جسے ہم اپنی من مرضی کی مطابق ڈھالنے کی کوشش میں آلودہ کر دیتے ہیں، یادوں کا اپنا خزانہ تھا اس کے پاس کہ وہ ساری زندگی ان ہی یادوں کے ساتھ بسر کر کے گزار سکتی تھی، مگر اس خزانے پہ سانپ بن کے بیٹھے اس کے اعمال جو اسے اس خزانے کو چھونے بھی نہیں دیتے تھے، ہر بار ایسی کوشش میں وہ ڈسی جاتی اور اپنا ہارا ہوا وجود لے کر اذیت خانے میں لوٹ جاتی، اس کے اندر پیاس کا وہ صحرا اٹھا تھا کہ ساری دنیا کے سمندر پی کر بھی اس کی پیاس بجھنے والی نہ تھی۔

سب کچھ تو ہو گیا تھا، سارے فرائض ادا ہو گئے تھے، اسید مصطفیٰ نے اب کی بار اس کے لئے جو قربانی دے دی تھی اور جو احسان اس پہ کر دیا تھا اس کا بوجھ بہت بھاری تھا، اتنا کہ حبا کے لئے اس بوجھ کو سہارنا دشوار ہو رہا تھا، اس کے کندھے اس بار سے ٹوٹ رہے تھے، اس بار اسید مصطفیٰ نے اس کے لئے وہ کیا تھا کہ حقیقتاً حبا کا دل چاہ رہا تھا اپنا وجود ریزہ ریزہ کر کے اس کے قدموں کی خاک بنا دے یا پھر اپنے جسم میں دوڑتا خون کا ہر قطرہ اس پہ نچھاور کر دے۔

اسید مصطفیٰ نے اسے اپنا ''نام'' دیا تھا، حبا تیمور کو ''شناخت'' دی گئی تھی، وہ جنگ جو ''رشتے کی شناخت'' کے لئے حبا تیمور نے شروع کی تھی، اسے اسید مصطفیٰ نے بڑے منطقی انداز میں انجام تک پہنچایا تھا۔

اور اب زندگی کا انداز یقیناً مختلف ہونے والا تھا، وہ سارے برے خیال، برے خواب اور واہمے جو اسے ڈراتے تھے اب یقیناً ایسا کچھ نہیں ہونے والا تھا، اب یقیناً اسید کی زندگی میں اور کسی نے نہیں آنا تھا، حبا کو آن دا ریکارڈ اس کی بیوی ہونے کا اعزاز ملا تھا اور کوئی بھی اب اس سے اس اعزاز کو چھین نہیں سکتا تھا حتیٰ کہ خود اسید بھی نہیں، حبا تیمور آج سرخرو تھی۔

''اب تم پاؤں کی خاک سمجھو یا سر کا تاج، میں ہر حال میں خوش ہوں اسید مصطفیٰ۔'' وہ سوچتے ہوئے اندر آ گئی اور لاؤنج کا دروازہ اپنے پیچھے بند کر دیا تھا۔

☆☆☆

''عجیب سی بات ہے، مگر یہ ایک انویٹیشن آیا ہے، مغل ہاؤس سے؟ میں تو تقریباً بھول چکا تھا، مگر انہیں شاید یاد ہے، یہ دیکھو...... آخر شادی کس کی ہے؟'' پاپا نے لاؤنج میں بیٹھے ہوئے ستارا اور معصب کو مخاطب کر کے کہا تھا۔

''مغل ہاؤس؟'' معصب نے چونک کر انہیں دیکھا، ستارا کے لئے بھی یہ نام نیا تھا۔

''مجھے یاد پڑتا ہے کچھ کچھ۔'' معصب نے کارڈ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' ستارا نے پوچھا۔

''پاپا! یہ ''مغل ہاؤس'' میں تو میں جا چکا ہوں، ان کے بیٹے کی ڈیتھ پہ، حیدر کے ساتھ گیا تھا۔'' اسے فوراً یاد آیا تھا۔

''ڈیتھ پہ؟ کیا مطلب؟ کب؟ مجھ سے ذکر کیا تھا؟'' وہ کچھ حیران ہوئے تھے۔

''جی کیا تو تھا، آپ کو شاید یاد نہیں، ان کے کسی بیٹے کی ڈیتھ نیویارک میں ہوئی تھی، اس کی ڈیڈ باڈی آئی تھی پاکستان، تب میں حیدر کے ساتھ گیا تھا تعزیت کے لئے، بہت بااخلاق اور ملنسار لوگ ہیں۔'' اس بار وہ تفصیل سے بولا۔

''اوہ ہاں یاد آ گیا، بتایا تھا تم نے، میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے بولے تھے۔

''ہوں مگر شادی کس کی ہے؟'' معصب کارڈ کھولنے لگا، مگر اسی وقت اس کا فون بج اٹھا، وہ فون کی طرف متوجہ ہو گیا، جبکہ وہ ادھ کھلا کارڈ وہیں رہ گیا تھا، ستارا نے اسے اٹھ کر وہاں سے جاتے دیکھا، پھر اس کی پشت کو دیکھتی رہی، اسے مغل ہاؤس کی کسی شادی میں کوئی دلچسپی نہ تھی، جبھی اس نے کارڈ کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور جس پر اس کی توجہ مرکوز تھی کیا اس میں دلچسپی تھی؟

☆☆☆

''کیوں چھوڑ دوں میں اسے؟ یہ سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو؟'' شاہ بخت بدستور اس کے بازو کو جھنجھوڑتا ہوا چیخ رہا تھا۔

وقار نے اسے کھینچ کر الگ کرنا چاہا مگر اس نے جھٹکا دے کر اپنے آپ کو چھڑا لیا۔

''تم انسان کہلانے کے قابل ہی نہیں ہو، چھوڑو مجھے، تمہاری خواہش کبھی پوری نہیں ہو گی۔'' علینہ نے اسے پرے دھکیلتے ہوئے چلا کر کہا تھا۔

''ہونہہ، دیکھیں گے کون کیا نہیں کرتا۔'' وہ مذاق اڑانے لگا۔

''تم...... تم شاہ بخت...... مر کیوں نہیں جاتے؟'' وہ بے بسی کی انتہا پہ جا کر نفرت سے بولی تھی، شاہ بخت لحہ بھر کو ساکت ہوا تھا اور اسی لمحے احمر مغل نے علینہ کے بازو کو اس کی گرفت سے آزاد کروایا تھا، شاہ بخت کی نظر ان پر پڑی تو وہ شرمندگی کی عمیق کھائیوں میں ڈوبا تھا، وہ بہت بے بس اور پریشان نظر آ رہے تھے۔

''سوری تایا ابو۔'' وہ بے ساختہ بولا۔

''بھاڑ میں جاؤ اپنے سوری کے ساتھ۔'' علینہ غرا کر پڑی۔

''تم سے کون بات کر رہا ہے۔'' وہ کہاں پیچھے رہنے والا تھا۔

''تو میرے کمرے میں کیا لینے آئے تھے؟'' وہ فوراً یاد دلا کر بولی تھی۔

''بے وقوفی تھی میری، سوچا تھا تمہیں پیار سے سمجھاؤں گا، مگر میں بھول گیا تھا کہ تمہیں پیار کی زبان سمجھ کہاں آتی ہے۔'' وہ ترکی بہ ترکی بولا تھا۔

''بس کرو تم دونوں۔'' نبیلہ بیگم نے چیخ کر دونوں کو چپ کروایا تھا۔

''آپ اسے سمجھاتی کیوں نہیں تائی امی، یہ بہت بدتمیز ہو گئی ہے۔'' شاہ بخت نے انہیں بھی بیچ گھسیٹا تھا۔

''ہونہہ...... میں اور بدتمیز...... خود تم نے کون سا کبھی تمیز سکول کی شکل دیکھی ہے؟'' علینہ نے مذاق اڑانے کی حد کر دی تھی۔

''بس کرو علینہ اور کتنا لڑو گی؟'' نبیلہ بیگم نے اسے ڈانٹا تھا۔

''تم چلو یہاں سے شاہ بخت۔'' وقار نے اسے باہر کو دھکیلا۔

''ہاں لے جائیں اسے اور اسے کہیں دوبارہ میرے کمرے میں مت آئے۔'' وہ چلا کر پھر بولی تھی۔

''میں آؤں گا بھی نہیں، اب تم آؤ گی۔'' وہ چیلنج کرتا ہوا، وقار کے ہاتھ سے اپنا بازو چھڑا کر باہر نکل گیا۔

''بند کر دو یہ تماشا...... تم...... علینہ...... مجھے یقین نہیں ہو رہا، تم اس قدر بدتمیز اور بدلحاظ ہو سکتی ہو، مجھے اندازہ ہی نہیں تھا، اب تمہارا یہ رویہ دیکھ کر تمہارے بابا کیا سوچیں گے؟ کچھ فکر ہے تمہیں؟'' نبیلہ بیگم غصے و حیرانی کے ملے جلے تاثر سے اس پر برس رہی تھیں۔

''چپ کرو تم۔'' احمر مغل نے بیگم کو ڈانٹا تھا۔

''آپ بھی مجھے ہی چپ کروائیں، دیکھ لی آج حقیقت، مجھے بھی سمجھ نہیں آتی تھی کہ آخر

بخت ہی کیوں اس پر بھڑکتا ہے؟ آج مجھے علم ہوا ہے کہ یہ بھی اس کے ساتھ برابر کا جھگڑا کرتی ہے، ہونہہ، آپ بند کریں اس کی طرف داری اور حقیقت پسند بن کے سوچیں، کب تک ہم یہ تماشے بھگتتے رہیں گے، کوئی حل ڈھونڈیں اس سب کا۔" وہ اپنا سارا غبار نکال کر باہر نکل گئیں اور اپنے کمرے میں جا کر بھی ان کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا تھا، وہ بدستور بڑبڑا رہی تھیں۔

"حد ہوتی ہے ایک چیز کی، باپ کو بیٹی کی مرضیاں ماننے کی پڑی ہے، بھائی صاحب کو اپنے ہی بچپن کے دوست میں خامیاں نظر آنے لگ گئی ہیں اور بیٹی کے کام سب سے انوکھے نرالے ہیں، بھئی...... تمہیں نہیں کرنی اس سے شادی، تو نہ کرو پھر اس سے جو بچپن لڑانے کی بھی کیا ضرورت ہے، خوامخواہ شوق کو ہوا دینے والی بات۔" دوسری طرف احمر مغل، طارق اور احمد مغل کے سامنے موجود تھے۔

"میری بیٹی، میرے ہی گھر میں غیر محفوظ ہو گئی ہے، شاہ بخت کا غصہ بڑھتا جا رہا ہے، آج وہ اس کے کمرے میں جا کر اس سے باز پرس کر رہا تھا، پاگلوں کی طرح جھگڑ رہے تھے وہ دونوں، اتنی اونچی آواز میں، مجھے ڈر ہے بخت غصے میں کوئی قدم نہ اٹھا لے۔" ان کے انداز سے گہری تشویش جھلک رہی تھی۔

"ایسا نہیں ہے احمر، تم خوامخواہ پریشان ہو رہے ہو۔" بڑے تایا ابا نے انہیں تسلی دینا چاہی۔

"مجھے بخت کے مزاج کا اندازہ ہے، وہ اس وقت واقعی پاگل ہو رہا ہے، اپنے جنون میں اگر اس نے علینہ کو اب کوئی نقصان پہنچایا تو میں کبھی خود کو معاف نہیں کروں گا، آپ پریشان مت ہوں میں اسے عباس کے پاس کراچی بھجوا دیتا ہوں، کچھ دن وہاں رہے گا تو شاید دماغ بدل جائے گا اس کا۔" یہ بخت کے بابا تھے، بہت افسردہ اور پریشان نظر آتے تھے۔

"ایسا مت کہو طارق، اس کا دل نہیں بدل سکتا، خواہ ہم اسے کتنی بھی دلیلیں دے لیں۔" تایا جان نے سر جھٹک کر کہا۔

"میں کب اس کا دل بدلنے کی بات کر رہا ہوں بھائی صاحب، طارق تو فضول بے وقوفوں والی بات کر رہا ہے۔" احمر مغل نے قدرے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب؟ میں نے تو اپنی عقل سمجھ کے مطابق صحیح بات کی ہے۔" طارق بے چارے پریشان ہو گئے۔

"یہ ہی تو بات ہے، طارق جو بات تم کر رہے ہو، وہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔"

"تو پھر مسئلے کا حل کیا ہے؟" احمد اور طارق نے بیک وقت استفسار کیا تھا۔

"وہ ہی جو بخت چاہتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" طارق بے ساختہ چونک گئے۔

"میری طرف سے ہاں ہے۔" احمر مغل نے دھیمے لہجے میں دھماکہ کیا تھا۔

☆☆☆

انسان کو حیوان ناطق یا Social Animal کہا جاتا ہے، ایسا کیوں ہے؟ کیا اس لئے کہ انسان جب اشرف المخلوقات کے رتبے سے گرتا ہے تو جانور سے بھی بدتر ہو جاتا ہے یا پھر اس لئے کہ اس انسان نامی مخلوق میں بھی جانوروں والی صفات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں، صدیوں سے دانش اور اس گتھی کو سلجھانے کی کشمکش میں مشغول ہیں کہ انسان کے ساتھ یہ حیوان کا سابقہ کیوں لگا؟

وہ بھی انسان تھی، حیوان نہیں، لیکن اپنی

غرض کے لئے اس نے اسید کے سر پہ جھوٹ کا جال بن دیا۔

وہ بھی انسان تھا، حیوان نہیں، لیکن اپنے طیش اور نفرت میں وہ اپنے وقار سے گر کر ایک درندہ بن گیا۔

تو انسان اگرچہ ایک جانور ہے مگر اسے سچ مچ کا جانور بنتے قطعی دیر نہیں لگتی، جیسے ان دونوں کو نہیں لگی تھی۔

وہ حبا سے بے پروا اور بے حس ہو گیا تھا، بالکل ویسے جیسے تیمور اور مرینہ، اسید سے بے پرواہ اور بے حس ہو گئے اور انسانی رشتوں کی یہ بے حسی انسان کو اس کے مرتبے اور وقار سے گرا کر کسی نالی میں رینگتا ہوا کیڑا بنا دیتی ہے، جیسے وہ بن گئی تھی، اگرچہ وہ احتجاج نہیں کرتی تھی مگر بحیثیت انسان اس کا سراپا اس کا رواں رواں روتا تھا کہ اسے توجہ چاہیے، پیار کے دو بول اور تھوڑی سی اہمیت چاہیے سانسوں کی ان ڈوریوں کو کھینچنے کی مشقت کے لئے اسے محبت کی آکسیجن چاہیے تھی، مگر اس کے ہونٹ جبر کی سختی سے سل چکے تھے اور احساسات سرد مہری کی ٹھنڈک میں جم چکے تھے۔

شفق جس کا نام مرینہ نے بہت شوق سے "نور شفق" رکھا تھا، اس امید پہ کہ وہ ان دونوں کی زندگی صبح کا نور بن کے آئے گی، وہ نور تو کیا بنتی اس کی قسمت میں بھی شاید حبا کے نصیب والی سیاہی تھی، اس وقت وہ چھ ماہ کی ہو چکی تھی اور حبا کو نہیں یاد تھا کہ کبھی اسید نے اسے دیکھا ہو یا دیکھنے کی خواہش ہی کی ہو، وہ اپنی ماں سے زیادہ غیر اہم تھی۔

یہ اوائل فروری کی ایک کھلی سی صبح تھی جب وہ لیٹ اٹھا تھا، حبا نے بھی اس کی اجازت کے بغیر اس کے کمرے میں جانے کی جرأت نہ کی تھی، بہت سی چیزوں کی سمجھ وقت خود بخود دے دیتا ہے۔

وہ اٹھ کر لاؤنج میں آ گیا، رات کے لباس میں وہ صوفے پہ ٹانگیں پھیلا کر نیم دراز ہو گیا اور ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کر لیا، یہی وقت تھا جب شفق رینگتی ہوئی باہر نکل آئی، وہ اس لمبے چوڑے شخص کو اکثر گھر میں چلتا پھرتا دیکھتی تھی مگر صرف دور سے، آج اس نے جانے کیا سوچا، وہ رینگتی ہوئی آگے بڑھتی گئی اور اسید کے زمین پہ رکھے پیر کے نزدیک آ گئی، پھر اس نے اپنے ننھے ننھے ہاتھ اسید کے پیر پہ رکھے اور اس کی انگلی پہ منہ رکھا اور پھر اسے ہونٹوں میں دبا لیا، اسید ایک دم چونکا اور پھر چند لمحوں کے لئے گنگ ہو گیا۔

"حبا!" اس کی دھاڑ بہت بلند تھی، پھر اس نے جھٹکے سے اپنا پیر واپس کھینچا تھا۔

اور اس گھر میں حبا نے پہلی دفعہ اس کی اتنی بلند آواز سنی تھی، وہ کچن سے بھاگتی ہوئی باہر نکل آئی تھی، اس نے جیسے ہی دیکھا کہ شفق اس کے قریب زمین پر بیٹھی تھی، وہ ایک دم گھبرا گئی اور پھر تیزی سے بھاگتی ہوئی آگے آئی تھی، اس نے جلدی سے شفق کو اٹھایا تھا اور ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر وہاں سے نکلتی گئی، اپنے کمرے میں آ کر وہ کتنی دیر خالی الذہنی کے عالم میں بیڈ پہ بیٹھی شفق کو تھپکتی رہی، اس کا دماغ بہت تیزی سے آگے کی ترکیب سوچ رہا تھا اور اگلے آنے والے دنوں میں اس نے شفق کو ساتھ رکھنا شروع کر دیا، وہ اسے اکیلا کمرے میں چھوڑ کر جاتی تو دروازہ بند کر جاتی، وہ اٹھتی اور رینگتی ہوئی دروازہ کے پاس آ جاتی پھر ننھے ہاتھوں سے دروازہ پیٹنا شروع کر دیتی، کچھ تو حبا اسے اٹھا کر لے جاتی اور کبھی وہ کہیں مصروف ہوتی تو اسے پتا نہ چلتا، جب وہ واپس کمرے میں جاتی تو اسے شفق زمین پہ سوئی

ہوئی ملتی وہ اسے اٹھاتی اور بیڈ پہ لٹا دیتی۔

اس نے شفق کے اخراجات کا کوئی بوجھ نہیں اسید پہ ڈالا تھا، نہ ہی کوئی اسپیشل دودھ منگواتی نہ کچھ اور یہاں تک کہ اس نے شفق کو فیڈر اور چوسنی تک کی اجازت نہ ڈالی تھی۔

اسید کے کی نظر سے مہینے بھر کے راشن کی لسٹ گزری تو وہ حیران ہوا تھا اس میں وہی روایتی چیزیں تھیں جو گھریلو استعمال میں امور خانہ داری کے لئے ضروری تھیں، اس میں حبا اور شفق سے متعلقہ کوئی چیز نہ تھی، وہ چاہتا بھی تو اس طرف توجہ نہیں دے سکتا تھا کہ اس کی دفتری مصروفیات اجازت ہی نہ دیتی تھیں۔

اور اپنی لاپرواہی اور بے حسی میں ان دونوں کو نظر انداز کر چکا تھا، یہ بھول کر کہ انسان سماجی حیوان ہے وہ تنہا ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا، اسے ایک نارمل انسانی حیات بتانے کے لئے دوسروں کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے، ورنہ وہ تنہائی کی تاریکی میں گم ہو کر اشرف المخلوقات کی شناخت کھو دیتے ہیں، وہ اس بات سے واقعی بے خبر تھا۔

☆☆☆

سبین اور عباس کی زندگی اگرچہ پوری طرح مکمل تو نہیں تھی مگر پھر بھی وہ خوش ضرور تھے، سبین اس کا ہر طرح سے خیال رکھتی تھی اور وہ بھی اگرچہ اس کا اتنا خیال تو نہیں رکھ پاتا تھا مگر پھر بھی وہ اسے بہت چاہتا تھا، اس کی پرواہ کرتا تھا، اس کے لئے اپنی پسند کی چیزیں لاتا تھا، اسے سجا بنا دیکھنا چاہتا تھا اور وہ اس کی ہر بات مانتی جاتی تھی کہ اس مسیحا کو ناراض کرنا وہ مول نہیں لے سکتی تھی۔

آج تو یوں بھی دونوں بے انتہا خوش تھے، سبین امید سے تھی، عباس کی خوشی چھلکی پڑ رہی تھی اور سبین بس سر نیچے کیے اک شرمیلی سی مسکان لبوں پہ سجائے اسے دیکھتی تھی، دنیا کے ہر جوڑے کی طرح وہ بھی اپنے آپ کو بہت معزز اور خوش قسمت تصور کرتے تھے کہ ان کے نزدیک شائد وہ پہلے بنی نوع بشر تھے جن پر رب نے اپنی رحمت کی تھی۔

انہوں نے ”مغل ہاؤس“ فون کر کے سب کو بتانے کا پلان بنایا تھا، مگر اس سے پہلے عباس کو بابا کی کال آگئی۔

”بابا! کیسے ہیں آپ؟“ عباس نے مسکرا کر پوچھا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں بیٹا! آپ کیسے ہو اور سبین؟“

”ہم بھی ٹھیک ہیں بابا اور......“ وہ خوشی خوشی آگے بولنے لگا تھا جب بابا نے اسے ٹوک دیا۔

”مجھے تمہیں ایک ضروری بات کی اطلاع کرنی تھی عباس۔“ ان کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

”جی بابا۔“ عباس ان کے انداز سے ٹھٹکا تھا۔

”میں نے علینہ اور شاہ بخت کا نکاح طے کر دیا ہے۔“ انہوں نے ٹھہر ٹھہر کر کہتے ہوئے عباس کے سر پر پہاڑ توڑا تھا۔

”کیا؟ کیا مطلب ہے؟ آپ کیا کہہ رہے ہیں بابا؟“ عباس نے بے یقینی سے کہا تھا۔

”اس جمعہ کو نکاح ہے، تم اور سبین جلد از جلد لاہور آ جاؤ۔“ انہوں نے عباس کی بے یقینی نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات مکمل کی تھی۔

”قطعاً نہیں، آپ اتنا بڑا فیصلہ مجھے بتائے بغیر کیسے لے سکتے ہیں؟ بابا! یہ آپ نے کیا کیا ہے؟ آپ نے مجھ سے پوچھنا تک گوارا نہیں کیا؟“ عباس کو بے انتہا غصہ آیا ہوا تھا، وہ پھٹ

پڑا۔

”بتا تو رہا ہوں تمہیں اور کیا پوچھنا چاہیے تھا مجھے؟“ وہ ذرا ناگواری سے بولے تھے۔

”آپ سب کچھ کر کے مجھے بتا رہے ہیں، یہ اطلاع دینے کی بھی زحمت نہ کی ہوتی بابا۔“ وہ بدستور غصے میں بولا تھا۔

”تمہیں کس بات کا غصہ ہے؟“

”آپ کو اچھی طرح پتا ہے مجھے کس بات کا غصہ ہے، میں اس شادی کے حق میں بالکل نہیں ہوں، کیا امی نے آپ کو بتایا نہیں تھا کہ ان کی مجھ سے بات ہو چکی ہے۔“ اس کا طیش بڑھتا جا رہا تھا۔

”نہیں میں نہیں سمجھتا کہ وہ بات منطقی تھی، جبھی میں نے اس پہ غور کرنا مناسب نہیں سمجھا۔“ انہوں نے پرسکون انداز میں کہا تھا، عباس چند لمحے کے لئے بالکل چپ ہو گیا، اسے لگا اس کی اہمیت زیرو کر دی گئی تھی۔

”وہ میری بہن ہے بابا، آپ اپنے بھتیجے کی خواہش پوری کرنے کے لئے اسے بھینٹ چڑھا رہے ہیں؟ یہ بہت غلط فیصلہ ہے، خدارا ایک دفعہ تو سوچ لیں۔“ عباس کا لہجہ دکھ بھرا تھا۔

”وہ میری بیٹی ہے، تم اس کے باپ بننے کی کوشش مت کرو، میں نے کیا فیصلہ کیا ہے میں بہت اچھے طریقے سے اس کے نتائج و عواقب سے آگاہ ہوں، تم مجھے مت بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا چاہیے تھا اور کیا نہیں۔“ انہوں نے سرد مہری سے کہا۔

”آپ کی بات بالکل درست ہے کہ وہ آپ کی بیٹی ہے اور کیا آپ کو اس بات کا علم ہے کہ وہ راضی ہے یا نہیں؟“ اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا تھا۔

”وہ بچی ہے، اس کا ذہن اتنا باشعور نہیں ہے ابھی کہ اپنا اچھا برا سوچ سکے۔“ وہ مہارت سے عباس کی بات اگنور کر گئے اور لاپرواہی سے بولے۔

”وہ بچی نہیں ہے، یونیورسٹی سے گریجویٹ ہونے جا رہی ہے۔“ وہ تڑپ اٹھا۔

”چار کتابیں پڑھ لینے سے انسان میں عقل نہیں آ جاتی۔“ انہوں نے سر جھٹکا۔

”اچھا یہ فلاسفی آپ کو تب عمل میں لانی چاہیے تھی جب آپ اسے گریجویشن میں داخلہ دلوا رہے تھے۔“ عباس کا انداز ہنوز تھا۔

”بہرحال اس فیصلے میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں۔“ انہوں نے قطعیت سے باور کرایا تھا، چند لمحے تک عباس بالکل چپ رہا۔

”ٹھیک ہے بابا! آپ اپنی مرضی کریں اور چونکہ اس میں میری مرضی شامل نہیں ہے اس لئے میں اس شادی میں شامل نہیں ہوں گا اور چونکہ میں اس کا باپ نہیں ہوں اس لئے میرے ہونے نہ ہونے سے اس شادی پہ کوئی اثر نہیں پڑے گا۔“ عباس نے مضبوط لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا تھا۔

”بے وقوفی کی باتیں مت کرو عباس، تمہیں آنا ہو گا اور یہ میرا حکم ہے۔“ انہوں نے رعب دار انداز میں کہا، اس بار عباس چند لمحے خاموش رہا۔

”مجھے مجبور مت کریں بابا، میں نے آج تک آپ کی کوئی بات نہیں ٹالی، مگر یہ میرے بس سے باہر ہے۔“ اس نے پست لہجے میں کہا، بابا نے کچھ کہے بغیر کال ڈسکنکٹ کر دی، عباس گم صم بیٹھا رہ گیا، اس کی ساری خوشی خاک میں مل گئی تھی۔

☆☆☆

محبت بھی بس عجیب ہی چیز ہے، انسان

سے پتا نہیں کیا کچھ کروا لیتی ہے، جیسے اس نے کیا تھا، کچھ بھی پرے نہیں رکھا تھا، محبت میں سب بھول گیا تھا، مگر سوال تو یہ ہے کہ اگر یہی فلسفہ ہر چیز پہ لاگو کیا جائے تو پھر ناپسندیدہ افراد کو قتل کر دینا چاہیے اور پسندیدہ چیز کو ہر قیمت پر چھین لیا جانا چاہیے اور یہ تو انسانوں کی دنیا کا قانون قطعاً نہیں ہو سکتا۔

"محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔"

یہ فلسفہ کس قدر بے معنی، فضول اور خوفناک ہے، یعنی آپ کو جو پسند آ جائے آپ اس کو ہر جائز ناجائز طریقے سے حاصل کر لیں تو پھر انسانیت تو ظلم و تاریکی کے اندھیروں میں کھو جائے گی اور انسان درندوں کی مانند اپنے مقاصد بلکہ ہوس کو پورا کرنے کے لئے دوسروں کی بوٹیاں نوچ لے تو پھر اسے اشرف المخلوقات کا الزام دینا بیکار ہے وہ کسی گلی میں رلتے کتے سے بھی بدتر ہو جاتا ہے جو ہڈی کے لئے اپنے ہم جنسوں پہ ہی بھونکنا شروع کر دیتا ہے۔

"تو اس فلسفے کو اب بدل جانا چاہیے۔"

شاید یہ کہ:

"محبت اور جنگ میں جو کچھ ہو وہ صرف اور صرف وہی ہو جو جائز ہو۔" نوفل صدیق اس بات اور فلسفے سے نجانے کتنا اتفاق کرتا تھا اور شاید نہیں بھی کرتا تھا، اس کے اندر کوئی کرلایا تھا۔

سنو تم عزم والے ہو
بلا کا ضبط رکھتے ہو
تمہیں کچھ بھی نہیں ہوگا
مگر دیکھو......!
جسے تم چھوڑے جاتے ہو
اسے تو ٹھیک سے شاید
بچھڑنا بھی نہیں آتا

☆☆☆

لاہور شہر میں چھائی رات دم بدم روشن اور دلکش ہوتی جا رہی تھی، اس نے ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی سے باہر جلتی بجھتی روشنیوں کو دیکھا تھا اور پھر ان دو مہینوں میں پہلی بار اسے "اس" کی یاد آئی تھی، بعض لوگ زندگی کے چند مقامات پر اہم لگتے اور پھر وہ کہیں پس منظر میں چلے جاتے ہیں، جیسے "وہ" اس وقت اس کے لئے پس منظر میں چلا گیا تھا، اس نے ہاتھ میں پکڑے سیل کو دیکھا اور پھر اس کا نمبر ملا لیا۔

"ہیلو۔" ایک جانی پہچانی اور کھردری آواز ابھری تھی۔

"کیسے ہو؟" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"میں ٹھیک۔" اس نے بے حد ٹھنڈے لہجے میں کہہ کر اسے اگلی بات کرنے کے قابل ہی نہ چھوڑا تھا، اس نے ایک طویل سانس لیا۔

"میں بھی ٹھیک ہوں۔" اس نے خود ہی اپنا حال بتایا۔

"صحیح۔" اس نے جواباً کہا۔

"کیا ہو رہا ہے آج کل؟" اس نے کہا۔

"کچھ بھی نہیں۔"

"اور باقی سب؟"

"وہ بھی ٹھیک۔"

"ہوں۔"

"فون خیریت سے کیا؟" بے اعتنائی کی انتہا تھی۔

"دل چاہ رہا تھا۔"

"اچھا۔" وہ طنزیہ ہنسا۔

"ہنس کیوں رہے ہو؟" اسے برا لگا۔

"تم بے وقوف کیوں بنا رہے ہو؟" اس کا لہجہ تیکھا تھا۔

"تمہیں ایسا کیوں لگ رہا ہے؟"

"کیونکہ یہی سچ ہے۔"

"فضول باتیں مت کرو۔"

"تم بھی۔"

"میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"وجہ؟"

"میں نہیں بتا سکتا۔"

"کیوں؟"

"مل کے بتاؤں گا۔"

"اور اگر میں نہ ملنا چاہوں تو؟"

"تو تمہیں تمہارے گھر سے اٹھوا لوں گا۔" اس کی برداشت کی حد ختم ہو گئی تھی۔

"آہاں، میں دیکھتا ہوں تم کیا کر سکتے ہو؟" اس نے مذاق اڑایا۔

"میں لاہور میں ہوں۔"

"تو؟"

"تو مطلب؟"

"ہاں اگر تم لاہور میں ہو تو میں کیا کروں؟" اس نے لاپروائی سے شانے جھٹکے۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟ تم مجھے بتاؤ گے؟" وہ اس بار ضبط کھو کر بولا تھا۔

"تم پچھلے دو ماہ سے لاہور میں ہو طلال بن مصعب! اور تمہیں کیا لگتا ہے میں اس سے بے خبر ہوں؟" شاہ بخت کی برداشت کی حد بس اتنی ہی تھی، وہ چند لمحوں کے لئے فریز ہوا تھا۔

"اوہ!" اس نے ایک طویل سانس لیا تھا۔

"تو تم باخبر ہو؟"

"Obviously۔" وہ طنز سے بولا۔

"کیا بہت ناراض ہو؟" طلال نے بے بسی سے پوچھا تھا۔

"کیا نہیں ہونا چاہیے؟"

"وجہ جانے بغیر تو نہیں ہونا چاہیے؟"

"مجھے کسی وجہ کے جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں۔" وہ سر جھٹک کر بولا۔

"ملو گے نہیں۔"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"میری مرضی۔"

"میرے کچھ ذاتی مسائل تھے شاہ بخت جن کی وجہ سے میں رابطہ نہیں کر پایا۔" طلال نے وضاحت دینی چاہی۔

"تو میں نے کب شکایت کی، کہ تم نے رابطہ نہیں کیا، البتہ میں نے ضرور کیا تھا جو کہ تم نے ڈسکنکٹ کر دیا۔" اس نے جتایا۔

"میں اس وقت سخت مشکل میں تھا۔" اس نے فوراً کہا۔

"تو ٹھیک ہے نا، تم اپنے مسائل سلجھاؤ، مجھ پہ اپنا وقت ضائع مت کرو۔" اس نے غصے کی انتہا کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔

طلال نے بے بسی سے فون کو دیکھا، شاہ بخت مغل کی دنیا کی کوئی چیز بدلنے پہ مجبور نہیں کر سکتی تھی، کم از کم اس کا یہ حد سے بڑھا غصہ تو قطعاً نہیں، طلال نے اس کی طرف جانے کا خیال کل پہ ڈال دیا، اس کے اپنے مسائل ہی کم نہ تھے۔

اس نے موبائل پہ ٹیکسٹ چیک کرتے ہوئے ایک ٹیکسٹ کو Reminder کے طور پر سیٹ کیا تھا، اس میں اس جگہ کا پتا تھا جہاں جانا اور اس کی حدود کے اندر داخل ہونا اس کی زندگی موت کا مسئلہ بن چکا تھا، اس نے ایڈریس کو بغور پڑھا اور پھر کچھ سوچنے لگا۔

☆☆☆

سنو!
جفت اور طاق کا
ہم سے نہیں واسطہ کوئی
ہمیں تو جب بھی لگی
بس......!

ضرب لگی
اور
تقسیم ہوئے......!!!

آج جمعہ کی دوپہر تھی، اسید تقریباً صبح سے ہی اپنے بیڈروم میں بند تھا، جمعہ کی اذان کے بعد اس نے حبا کو تیار ہونے میں مدد دینے کے لئے اندر بلایا تھا، کھدر کی سفید شلوار قمیص پہن کر جب وہ باہر آیا تو حبا کی آنکھوں میں ستائش کی چمک لہرائی تھی، وہ ہمیشہ سے زیادہ شاندار لگ رہا تھا۔

"کھانے میں کیا بناؤں؟" اس نے بے ساختہ پوچھا تھا۔

"چائنیز۔" اسید نے کہا۔

حبا نے بے اختیار خوشی سے سر ہلایا تھا، چائنیز تو دونوں کا ہمیشہ سے فیورٹ تھا اور کبھی اچھے وقتوں میں وہ دونوں مل کر چائنیز کھایا کرتے تھے، شاید ہی کوئی ریسٹورنٹ تھا جہاں سے انہوں نے ہوٹلنگ نہ کی ہو۔

وہ جمعہ کی نماز ادا کرنے چلا گیا جبکہ حبا کچن میں آ گئی، بہت لگن اور شوق سے اس نے Egg fried اور چکن منچورین بنایا تھا، پھر خود فریش ہونے چلی گئی، اس نے نہا کر سفید رنگ کا بڑا سا فراک اور چوڑی دار پاجامہ پہنا تھا، بالوں کو پونی ٹیل کی شکل میں باندھا اور جب اسید واپس آیا تو اس نے بڑے اہتمام سے کھانا لگا رکھا تھا، شفق بھی صاف ستھرے کپڑوں میں لاؤنج میں رینگ رہی تھی، حبا نے ایک حسرت بھری نظر سے چاروں طرف دیکھا اور سوچا، کیا یہ ایک مکمل Happy family کا سین نہیں تھا؟

اس نے نم آنکھوں کو رگڑا اسی وقت اسے شفق کی چیخ سنائی دی، اس نے بے ساختہ پلٹ کر دیکھا اور پھر اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی، وہ بھاگتی ہوئی آگے آئی تھی، اس نے شفق کو اٹھایا اور اپنے ساتھ لپٹا لیا، واپس اپنے کمرے کی طرف جاتے اس کے پاؤں میں شکستگی تھی اور آنکھوں میں ڈھیروں آنسو تھے، اس نے شفق کے ہاتھ کو دیکھا، جو سوجا ہوا لگ رہا تھا۔

اپنے دھیان میں لاؤنج میں آنے والا اسید قطعاً شفق کے وجود سے باعلم نہیں تھا، زمین پہ رینگتی شفق کا ننھا منا ہاتھ کب اس کے پیر تلے آیا اسے پتا ہی نہ چلا، شفق کی چیخ پہ تڑپ کر پیچھے ہٹا تھا اور اسی وقت اس نے مڑ کر دیکھا تھا۔

اور اب شفق مسلسل رو رہی تھی بار بار اپنا ہاتھ جھٹک رہی تھی، حبا نے اسے کندھے سے لگا لیا، مگر وہ کسی طور چپ نہ ہو رہی تھی، حبا نے جھلا کر اسے بستر پہ پٹخا اور چلائی تھی۔

"کس بات کو روتی ہو تم؟ کیوں؟ دیکھا نہیں اپنا حال؟" وہ زور سے کہتی خود بھی رونے لگی۔

"انسان نہیں ہے وہ، خدا سمجھتا ہے اپنے آپ کو، ہم جیسے بے حیثیت لوگوں کو یونہی اپنے قدموں تلے کچل دیتا ہے، تم مت رویا کرو، ساری زندگی رونا ہی تو ہے، میں بھی تو روتی ہوں، تم نے کیا کرنا رو کر؟" اب اس نے شفق کو بازوؤں میں لے کر بھینچا اور رونا شروع کر دیا۔

"کوئی حیثیت نہیں، کوئی اوقات نہیں؟ ہمارا کچھ نہیں ہے، کچھ نہیں۔" وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔

ہر روز اک نئی اذیت اک نئی ذلت اس کا مقدر بنا دی جاتی تھی اور آج تو دل پھٹ کر رہ گیا تھا، شفق کا ننھا سا ہاتھ نہیں کچلا گیا بلکہ اس کی پوری ہستی کو کچل دیا گیا تھا۔

"بھلا اس شخص کو کیا فرق پڑے گا میری بیٹی کی تکلیف سے؟" اس نے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ شفق کے ہاتھ پہ بام ملتے ہوئے اذیت

سے سوچا تھا۔

"اسے تو اس کا نام تک پتا نہیں۔" اس نے سسکیاں لیتے ہوئے شفق کا ہاتھ چوما تھا، جو کہ ذرا آرام ملنے پہ اب نیند میں تھی، وہ اسے آہستہ آہستہ تھپکنے لگی۔

صبح سے وہ بنا ناشتہ کیے مصروف تھی، اس شخص کو کیا فرق پڑا تھا؟ وہ باہر ڈائننگ ہال میں "چائنیز" انجوائے کر رہا تھا۔

☆☆☆

لوگ احساس کی روندی ہوئی گلیوں میں
پھینک دیتے ہیں تعلق کو پرانا کر کے

اس نے سوجھی متورم آنکھوں سے اپنے ساتھ لیٹے اس شخص کو دیکھا جو گہری نیند میں گم تھا، بہت دیر تک اس کے نقش دیکھتی رہی، اس کے بند پلکیں مڑی ہوئی تھیں اور وہ بالکل سیدھا سویا تھا، اس کو بے اختیار بابا کی بات یاد آئی تھی۔

"سیدھا سونے والے لوگ مضبوط ارادے کے مالک ہوتے ہیں۔" وہ بھی تو اٹل تھا، اپنے ارادوں میں اور اپنے کاموں میں اور اپنی باتوں میں بھی۔

اس نے آنکھیں بند کر کے سر میں اٹھتے بے تحاشا درد کو دبانا چاہا، مگر چند لمحوں کے لئے رک کے درد کے ظالم تیر پھر سے اسے گھائل کرنے لگے، اس نے اس کا سیدھا ہاتھ تھام لیا، کشادہ ہتھیلی اور گہری اور واضح لکیریں، وہ کچھ دیر تک اس کا ہاتھ دیکھتی رہی، پھر اس نے واپس ہاتھ چھوڑ دیا، درد کی شدت بڑھتی جا رہی تھی۔

وہ سر بھینچ کر پھر سے لیٹ گئی، نیند اس کی کب کی اڑ چکی تھی، وہ چھت کو گھورتی رہی، پھر بے چین ہو کر کروٹ بدل لی، مگر بے تابی بڑھتی جا رہی تھی، اسے ساتھ سوئے شخص کے اطمینان پہ رشک آیا تھا، پتا نہیں وہ اتنی بے سکون کیوں تھی؟

مگر زیادہ دیر نہیں گزری تھی، اس کا ساتھی اس کی بے چینی کو نجانے کیسے بھانپ گیا تھا، اس نے نیم وا آنکھوں سے اس کروٹیں بدلتی، خود میں الجھی اداس لڑکی کو دیکھا اور پھر بازو پھیلا کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

"نیند نہیں آ رہی کیا؟" وہ خوابیدہ لہجے میں پوچھنے لگا۔

"نہیں۔" اس نے بے بسی سے سر اس کے بازو پہ مارا تھا۔

اس نے بنا کچھ کہے اس کا سر اپنے بازو پہ رکھا اور دوسرا بازو اس کے گرد لپیٹ لیا۔

"سو جاؤ میری جان۔" اس نے نرمی سے اس کی پشت کو سہلایا تھا، اس کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو بڑی شدت سے آئے تھے جو وہ بڑی مہارت سے پی گئی۔

ضبط غم آسان نہیں عالی ......!
آگ ہوتے ہیں وہ آنسو جو پیے جاتے ہیں

اندر کا درد بڑھتا ہی جا رہا تھا اور نکاسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔

☆☆☆

"مغل ہاؤس" میں خوب شور تھا، علینہ اور شاہ بخت کا نکاح طے ہونے کے بعد گھر میں جو سنسنی اور جوش کی لہر دوڑی تھی اس کا اظہار ناقابل بیان تھا، علینہ کو جو چپ لگی تھی اسے کسی نے نہیں محسوس کیا، البتہ شاہ بخت کے قہقہے چھت پھاڑ تھے اس کی اپوزیشن میں تو کوئی بھی نہیں تھا، جبھی سب خوش تھے اور رہی علینہ؟ تو اس کی پرواہ پہلے کس کو تھی جو اب ہوتی، اس کے باپ کو تھی اور اب یہ فیصلہ بھی انہی کا تھا۔

ایاز کا فون آیا تو علینہ خاموشی سے اس کا لیکچر سنتی رہی اور جب بولی تو ایاز کو چپ کروا گئی۔

"بھائی! آپ مرد ہونے کے باوجود مجبور ہو

گئے تھے نا، میں تو پھر لڑکی ہوں، اس گھر کے سوا تو میرا کوئی ٹھکانہ بھی نہیں، آپ کی طرح میں گھر چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتی، نہ ہی آپ کی طرح میں طلاق دے سکوں گی، یہ فیصلہ میرے باپ کا ہے اور اب وہ ہی اس کے ذمہ دار ہیں، میں کوئی فیصلہ سنانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔" ایاز بلبلا اٹھا۔

"بابا کا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟ آخر وہ کیوں کر رہے ہیں ایسا؟ کس نے بدلا ہے ان کا دل؟"

"بہتر ہو گا آپ یہ سوال انہی سے کر لیں۔" اس نے سپاٹ انداز میں کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔

وہ جانتی تھی اس کے دونوں بھائی اس رشتے کے سخت خلاف تھے اور وہ خود بھی تو تھی، مگر مسئلہ یہ تھا کہ کوئی بھی قطعی طور پر کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہ تھا، حتمی فیصلہ تو بابا کا ہی ہوا تھا، جو کہ سب کے سامنے بھی آ گیا تھا، علینہ کے اندر کیا تھا کوئی بھی اس میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا۔

نیلم چچی نے اس کا نکاح کا ڈریس اس کو ساتھ لے جا کر منتخب کیا تھا، یہ ایک ریڈ اور بلیک فراک تھا جس کے ساتھ جیولری بھی میچنگ تھی، شاہ بخت نے اپنی شاپنگ وقار کے ساتھ جا کر کی تھی، اس نکاح کی تیاری یوں مکمل ہوئی تھی جیسے وہ سب کب سے صرف اسی کے منتظر بیٹھے تھے، انویٹیشن کارڈز سب کو بھجوائے جا چکے تھے، ہوٹل بک ہو چکا تھا، مینیو ڈیسائیڈ ہو چکا تھا۔

مگر ایک مسئلہ ہنوز حل طلب تھا اور وہ تھا عباس کا انکار، جو کسی صورت ہاں میں بدلنے کو تیار نہ تھا۔

جب شاہ بخت کو پتا چلا تو اسے یاد آیا کہ ان دونوں کے درمیان تو ناراضگی چل رہی تھی، وہ اس کا نمبر ملا کر لان میں چلا آیا۔

"ہیلو۔" فون سبین نے اٹھایا تھا۔

"السلام علیکم بھابھی! کیسی ہیں آپ؟" وہ بہت خوشگوار موڈ میں بول رہا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں بھائی؟"

"میں ٹھیک ٹھاک، یہ عباس کو ذرا فون دیجئے گا۔"

"جی، ٹھیک ہے، یہ لیں کر لیں بات۔" سبین نے فون عباس کو تھمایا۔

"ہیلو۔" عباس نے کہا۔

"سالے، تیرے ہیلو کی ایسی کی تیسی۔" بخت نے اس کی آواز سنتے ہی اس پہ چڑھائی کر دی تھی۔

"کیا بکواس ہے۔" عباس غصیلے لہجے میں چلایا۔

"ہاں بھئی اب ہماری باتیں بکواس ہی لگیں گی، تو نے تماشا کیا لگایا ہوا ہے، اوئے میری شادی ہے سالے اور تو اپنی دفعہ غداری کر رہا ہے، میں نے تیری کتنی مدد کی تھی یاد کر۔" شاہ بخت نے اس کی کرتے ہوئے اسے غیرت دلانا چاہی۔

"گالی مت دو۔" عباس نے ٹوکا۔

"کون سی گالی؟ اچھا...... تجھے سالا کہا، برا لگا؟ اوہ ہو، میں تو بھول ہی گیا تھا کہ تو بڑا غیرت مند ہے۔" اس نے طنز کیا۔

"میرے پاس تمہاری فضول باتیں سننے کا وقت نہیں ہے۔" عباس نے سرد مہری سے کہا۔

"کس بات پہ ناراض ہو؟" بخت نے اس بار سنجیدگی سے کہا تھا۔

"تمہیں اچھی طرح پتا ہے۔" عباس تلملا اٹھا۔

"تم ایک بے وقوف انسان ہو، جب ساری بات ختم ہو چکی تھی، پھر بھی اسی بات کو لئے بیٹھے ہو، بس کرو اور عقل سے سوچو۔" وہ سخت لہجے میں بولا تھا۔

"کیا سوچوں عقل سے؟ مجھے نصیحتیں مت کرو۔"

"میں کوئی نصیحت نہیں کر رہا، تم غلط بات پہ اڑ گئے ہو، میری شادی ہے اور تم نہیں آنا چاہتے؟ آخر ایسی کون سی قیامت ٹوٹ پڑی ہے؟ ایسا کیا گناہ کر دیا میں نے؟ علینہ سے شادی کر رہا ہوں، کیا غلط بات ہے اس میں؟"

"کوئی غلط بات نہیں ہے، تم خوشیاں مناؤ۔"

"اور تم میری خوشی میں شریک نہیں ہو گے؟" اس نے دوٹوک لہجے میں کہا، عباس چپ رہا۔

"کیا جب میں تمہاری خوشی میں شامل ہوا تھا تو اس قدر سوالات کے ساتھ آیا تھا؟ کیا میں نے یہ رویہ رکھا تھا؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"جتا رہے ہو؟" عباس تڑپ کر بولا۔

"جتا نہیں رہا، بتا رہا ہوں، وہ میرا قرض ہے تم پہ عباس، مجھے واپس کرو۔" اس کا انداز بے حد سنجیدہ تھا۔

"یہ کیا بات ہے؟ میں......؟"

"تمہیں آنا ہو گا عباس، ورنہ تم مجھے جانتے ہی ہو۔" بخت نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"کیا مطلب؟ تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟" عباس نے ناگواری سے کہا۔

"دھمکی نہیں، سچ بتا رہا ہوں، دو دن ہیں تمہارے پاس، غور و فکر کر سکتے ہو، اپنے فیصلے سے آگاہ کر دینا۔" اس نے تصحیح کرتے ہوئے کہا تھا۔

"میں اپنے ماں باپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر چکا ہوں، تمہیں کرنا ضروری نہیں سمجھتا۔" وہ دوٹوک انداز میں بولا۔

"میں ان کی نہیں اپنی بات کر رہا ہوں، تم علینہ کے بھائی کی حیثیت سے نہیں، میرے دوست، میرے بھائی کی حیثیت سے شرکت کرو گے، اگر تمہیں یہ تعارف منظور نہیں تو اپنی ناپسندیدگی کا ایک بار اظہار کر دینا، میں اسٹامپ پیپر پہ لکھ کر دے جاؤں گا کہ میرے مرنے پہ بھی تمہیں نہ بلایا جائے۔" شاہ بخت کا انداز سنجیدہ ہی نہیں خطرناک بھی تھا، عباس ششدر سا اس کی بات سنتا رہا، شاہ بخت چند لمحے خاموش ہو کر اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔

"اب میں تمہارے فیصلے کا انتظار کروں گا۔" اس نے ایک طویل سانس لے کر فون رکھ دیا، یہ جانے بغیر کہ اس نے عباس کو کس دوراہے پہ چھوڑا تھا؟ دوسری طرف گھر میں خاصی بحث چل رہی تھی، مہندی کے فنکشن کو لے کر۔

"چھوڑیں بابا، یہ فضول رسمیں مجھے پسند نہیں ہیں خوامخواہ کی فضول خرچی اور تام جھام اور حاصل وصول کیا؟" بخت نے سر جھٹکتے ہوئے نخوت سے کہا تھا۔

سب نے قدرے حیرانی سے اسے دیکھا تھا، عباس کا نکاح تو واقعتاً سادگی سے ہوا تھا مگر وقار اور ایاز کی شادیوں کی تقریبات میں خاصا دکھاوا اور نمائش کی گئی تھی جس میں سب نے ہی دل کھول کر حصہ لیا تھا اور اب اس کا یوں اس طرح اچانک ایک بدلا ہوا رویہ دیکھ کر حیرانی بو بنی تھی۔

"کیا انقلابی خیالات ہیں واہ۔" رمشہ نے تالی بجاتے ہوئے کہا تھا، انداز طنزیہ تھا۔

"میں آپ کے ساتھ اتفاق کرتی ہوں ویسے۔" کومل نے مسکرا کر کہا۔

"ویسے بھی شادی تمہاری ہے یار، تم چاہو تو ابھی خطبہ نکاح پڑھوا دیتے ہیں، گواہ بھی گھر کے ہی شامل ہو جائیں گے اور وہ تمہاری بات بھی پوری ہو جائے گی فضول خرچی سے بچنے والی۔" وقار نے اس کی ٹانگ کھینچی تھی۔

"بھائی! آپ میری پارٹی میں ہیں یا دشمنوں کی؟" وہ جل کر بولا۔

"کیا کریں یار، لوٹوں کا زمانہ ہے۔" وقار نے مظلومیت سے کہا، ایک بے ساختہ قہقہہ پڑا تھا۔

"جیسے تم پسند کرو یار، ہمیں کسی بھی بات پہ کوئی اعتراض نہیں۔" تایا جان نے خوشگوار انداز میں کہا تھا۔

"ویسے آپشن وقار کا بھی برا نہیں۔" نیلم چچی نے بھی اسے تنگ کیا۔

"امی جان!" وہ پیر پٹخ کر بولا۔

"ارے...... چچی امی...... مت تنگ کریں بچے کو...... وہ بڑا ہو گیا ہے۔" وقار نے مذاق اڑایا۔

"ہاں ابھی کل ہی تو بچے نے فیڈر چھوڑا ہے۔" رمشہ نے اپنا غبار نکالا تھا، سب ہی بے ساختہ ہنسے تھے۔

"بھئی کیوں تنگ کر رہے ہو میرے بیٹے کو؟" احمر تایا نے بھی اس کی حمایت کی تو وہ مسکراتا ہوا ان کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔

☆☆☆

بارش قیدی نہیں ہوتی
بارش آزاد ہوتی ہے
چپی دو پہروں میں جلتے پگھلتے ہم
اور کچے گھر
اور صحرا
اور کھیت
اور پیاس
سارے کے سارے قیدی ہوتے ہیں
اور بارش آزاد ہوتی ہے

ہلکی سی سرد ہوا میں بارش کی بوچھاڑ نے رات کے اس پہر ماحول کو عجیب رخ دے دیا تھا، قریباً ایک تہائی رات بیت چکی تھی، وہ برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے کب سے وہاں کھڑی تھی۔

آج چودہ فروری تھی، محبت کا دن، دلوں میں بسنے والوں کا "یوم عشق" جسے دل والوں نے بڑے دل سے منایا تھا، ہر طرف سرخ پھولوں کی بارش نظر آتی تھی، ٹی وی شوز نے اس پاگل پن کو مزید بڑھایا تھا، قطع نظر اس بات سے کہ، یہ تہوار ہمارا تھا یا نہیں، لوگ دوسرے بہت سے دنوں کی مانند اس دن کو بھی خصوصی تیاری کے ساتھ مناتے تھے۔

اور حبا کا عقیدہ بھی بس عجیب ہی تھا، بھلا محبت کو بھی کسی دن کی ضرورت تھی؟ محبت کا لافانی جذبہ تو ہر دن نیا ہوتا جاتا ہے، اس نے سرخ گلاب کے بہت سے پھول توڑ کر اسید کے سائیڈ ٹیبل کے گلدان میں سجائے تھے، یہ الگ بات کہ ایک کانٹا اس کی انگلی کو زخمی کر گیا تھا، بالکل یوں جیسے اسید کی محبت نے اسے پور پور زخم زخم کر دیا تھا۔

اس نے اپنی خالی ہتھیلی کو پھیلایا اور بارش کو محسوس کرنا چاہا تھا مگر ہوا کا رخ بدلا تھا، جبھی اس کی سونی ہتھیلی کتنی ہی دیر خالی رہی پھر کہیں سے بارش کی ایک بوند اس کی ہتھیلی میں آن سمائی، اس نے بڑی احتیاط سے اسے یوں سنبھالا جیسے سیپ میں بند موتی۔

"حبا!" اسید کی آواز بہت قریب سے سنائی دی تھی، وہ ایکدم مڑی اور اسی کوشش میں اس کے ہاتھ سے وہ ننھی سی بوند پھسل گئی، اس نے افسوس سے اپنی ہتھیلی کو دیکھا جہاں صرف اب ہلکی سی گیلاہٹ رہ گئی تھی۔

"پتا نہیں ان ہاتھوں کی لکیروں میں کیا تھا جو ہر چیز کو مٹھی کی ریت بنا دیتا تھا ہر چیز بس پھسلتی جاتی تھی۔" اس نے افسوس سے سوچا تھا۔

"جی!" اس نے اسید کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ نیچے کر لیا۔

"تم جاگ رہی ہو؟" سیاہ شلوار سوٹ میں کندھوں پہ چادر ڈالے، اسید کا لہجہ ناقابل فہم تھا، بلکہ شاید وہ تو پورے کا پورا ہی حبا کے لئے ناقابل فہم تھا۔

"جی! بس جا رہی تھی، بس ویسے ہی ادھر آ گئی۔" وہ گھبرا کر وضاحت دینے لگی۔

"ہوں۔" وہ سر ہلا کے اس کے برابر کھڑا ہو گیا، حبا کو سمجھ نہیں آئی کہ جائے یا رک جائے۔

"ایک بات پوچھوں؟" اسید نے بالکل سیدھ میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی!" حبا نے آہستہ سے کہا، اسے جواب مل چکا تھا کہ اسے رکنا تھا۔

"تم یہاں خوش نہیں ہو؟" اس نے کچھ کھوجتے ہوئے کہا تھا، حبا دھک سے رہ گئی، اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا مگر کچھ دیکھ نہ سکی، اس سے سوال کیا گیا تھا اور اسے جواب دینا تھا، وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے؟" اس بار اسید کا لہجہ کڑا تھا، حبا کو لگا وہ کسی کٹہرے میں آن کھڑی ہو۔

"جی!" اس نے ایک لفظ میں بات ختم کرنا چاہی۔

"کیا جی؟ یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔"

"میں خوش ہوں، کھانے کو روٹی ملتی ہے اور جسم ڈھانپنے کے لئے کپڑے بھی اور زندہ رہنے کے لئے اور کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے؟ میں بہت خوش ہوں، اپنے ہاتھ سے سارے کام کرتی ہوں تاکہ کوئی ناکارہ نہ سمجھے، آپ کا بچا ہوا کھانا کھاتی ہوں، تو خوش ہی ہوئی نا، خوشی بھلا اور کس چیز کو کہتے ہیں؟" وہ گھٹے گھٹے لہجے میں بمشکل اپنی بات پوری کر پائی تھی۔

"میرے لئے کیا کر سکتی ہو؟" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسید نے اگلا سوال کیا تھا، حبا نے بے حد چونک کر اسے دیکھا۔

"جو آپ کہیں۔" اس کا لہجہ مضبوط تھا۔

"سردی کی اس بارش میں بھیگ سکتی ہو؟" اسید نے جیسے چیلنج کیا۔

حبا نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس کے پہلو سے نکل کر کھلے لان میں جا کھڑی ہوئی، تاریک اور سرد رات میں اسید کو صرف اس کا مدھم سا ہیولہ ہی نظر آ رہا تھا، مگر بارش برس رہی تھی اور اس پہ بھی برس رہی تھی، لان کے ہر پیڑ، پودے اور گھاس کی طرح وہ بھی دھل رہی تھی اور اسید یک ٹک اسے دیکھ رہا تھا، چند لمحے گزرے، ہلکی سی بجلی کڑکی، بادل گرجے اور چند پل کے لئے سارے ماحول میں روشنی کی چمک پھیل گئی اور پھر سے وہی اندھیرا اور بارش کی مدھم رم جھم سنائی دینے لگی۔

چند ثانیوں بعد اس نے اسید کو آگے بڑھتے دیکھا، وہ لان میں چلا آیا، بالکل اس کے سامنے آ کر وہ رک گیا، بجلی چمکی، پل بھر کے لئے سارا

سماں روشنی میں نہا گیا اور اسی پل میں ایک عجب بات ہوئی، اسید نے اپنے بازو کھولے اور اسے خود سے قریب کر کے اپنے فراخ سینے میں چھپا لیا اور بازو اس کے گرد لپیٹ دیئے یوں کہ وہ اس کی چادر میں چھپ گئی، حبا جیسے کسی خواب کے زیر اثر اپنے چہرے کو اس کے سینے سے لگے دیکھا جس کے نیچے اس کا دل دھڑک رہا تھا، بڑا قیمتی اور گراں قدر دل، اب وہ دونوں بھیگ رہے تھے۔

☆☆☆

''یار! تم کتنے بدتہذیب انسان ہو؟ کل تمہاری شادی ہے اور تم نے مجھے بتایا تک نہیں؟'' طلال بن مصعب نے اسے شرم دلانا چاہی۔

وہ دونوں پیزا ہٹ میں بیٹھے تھے، شاہ بخت کئی نخروں کے بعد آخر کار مان گیا تھا۔

''تمہارے کام ہی ایسے ہیں میں نے بتانا ضروری نہیں سمجھا۔'' اس نے بے نیازی سے کہا۔

''بہت بدتمیز ہو۔'' طلال بے چارگی سے ہنس پڑا۔

''اس میں بدتمیزی والی کون سی بات ہے؟'' اس نے بھنویں اچکا کر اسے دیکھا۔

''اچھا یار! اسے چھوڑو، یہ بتاؤ آخر یہ سب ایک دم سے ہوا کیسے؟'' وہ تجسس سے پوچھنے لگا۔

''بس کی کریں، ہماری پرسنالٹی ہی ایسی ہے۔'' اس نے کالر کھڑے کیے، طلال ہنس پڑا۔

''اس میں تو کوئی شک نہیں، مگر علینہ کیسے مانی؟''

''کہاں یار! وہ نہیں مانی، یہ پہاڑ سر کرنا ابھی باقی ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا، طلال الجھن میں پڑ گیا۔

''جب وہ مانی نہیں تو پھر شادی کیسے ہو رہی ہے؟''

''یہ پاکستان ہے دوست، یہاں ایسے ہی ہوتا ہے۔'' اس نے لاپرواہی سے کہا۔

''ایسے کیسے مطلب؟'' اس کی سوئی وہیں اڑ گئی۔

''اوہو، چھوڑو اس ٹاپک کو، تم نے مجھے بتایا نہیں تم یہاں کس مقصد کے لئے رکے ہوئے ہو؟'' بخت نے اچانک یاد آنے پہ پوچھا تھا۔

''ہے ایک کام، ہو جائے تو بتا دوں گا۔'' اس نے عام سے انداز میں کہا جیسے بات قطعاً غیر ضروری ہو، اسی وقت اس کے فون کا Reminder بجنے لگا، وہ چونک کر متوجہ ہوا، پھر بے چین ہو گیا۔

''مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے شاہ بخت، میں چلتا ہوں۔'' وہ اٹھنے کے لئے پر تولنے لگا۔

''کیا کوئی ضروری کال ہے؟'' بخت نے اسے Reminder بند کرتے دیکھ کر پوچھا تھا۔

''ہاں، بس ایسا ہی ہے، تم فکر مت کرنا، کل میں پہنچنے والا پہلا شخص ہوں گا۔'' وہ مسکرا کر یقین دہانی کروانے لگا۔

''ضرور جناب!'' وہ خوشدلی سے کہتا کھڑا ہو گیا۔

کچھ لمحوں بعد وہ دونوں وہاں سے نکل گئے، دونوں کی گاڑیوں کا رخ مختلف اطراف میں تھا، شاہ بخت ''مغل ہاؤس'' جا رہا تھا اور طلال ''شاہ لاج'' دونوں کی سوچ مختلف تھی۔

''شاہ بخت'' آنے والے وقت کے خمار میں ہلکے ہلکے گنگناتا ہوا گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا، ''طلال بن مصعب'' آنے والے وقت کے تناؤ میں کشیدہ اعصاب کے ساتھ ڈرائیو کر رہا تھا۔

شاہ بخت کی گاڑی ''مغل ہاؤس'' میں داخل ہوئی تو اسے خوشدلی سے خوش آمدید کہا گیا تھا، جبکہ طلال بن مصعب کی گاڑی ''شاہ لاج'' کے آگے رکی تو گارڈز اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے، کچھ لمحوں بعد گیٹ کھول دیا گیا، وہ گاڑی اندر لیتا گیا، وہ بڑے اعتماد کے ساتھ گاڑی سے نکلا اور ایک ملازمہ کی معیت میں ڈرائنگ روم میں چلا گیا، کچھ دیر بعد اسے چائے لوازمات کے ساتھ سرو کر دی گئی، اس نے سر جھٹک گراں سب چیزوں کو دیکھا۔

''کیا کڑا وقت پڑا ہے۔'' اسے ایک بھولی بسری غزل کا مصرع یاد آیا تھا، اس نے نظر ہٹائی اور دروازے پہ جما دی۔

''اگر میری زندگی اتنی برباد ہے تو تم اتنا خوش کیسے رہ سکتے ہو؟'' اس نے منتقمانہ انداز میں سوچا تھا، چند لمحوں بعد دروازے پہ ہلکی سی دستک کے بعد وہ اندر آ گئی، وہ اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

''ہیلو، کیسی ہیں آپ ستارا؟'' وہ احترام و شائستگی سے دریافت کرنے لگا کہ اس معصوم لڑکی کا کہیں کوئی قصور نہ تھا۔

''میں ٹھیک ہوں، آپ کا تعارف؟'' وہ ناشناسا تھی، نہیں جانتی تھی کہ جب یہ شناسائی میں بدلے گی تو کیا قیامت ڈھائے گی۔

''میں۔'' ''سید طلال بن مصعب صدیق شاہ ہوں'' نوفل بن مصعب صدیق شاہ کا بھائی اور ''سید صدیق احمد شاہ'' کا بیٹا۔'' وہ غرور سے بولا تھا، ایک خوفناک گڑگڑاہٹ کے ساتھ اس کے الفاظ ستارا کی سماعتوں پہ برسے تھے۔

باقی آئندہ ماہ

خالدہ نثار

ناولٹ

گھپ اندھیرا چارسو پھیلا ہوا تھا، آج کی رات کچھ زیادہ ہی سیاہ اور سرد تھی اور اسی تاریکی اور سیاہی کے باعث تمام بشر اور چرند پرند اپنے اپنے ٹھکانوں پر دبکے پڑے تھے مگر ایک وجود ایسا بھی تھا جو اس ہولناک تاریکی اور ٹھٹھرا دینے والی سردی سے بے نیاز ویران پڑے راستوں پر بھاگ رہا تھا اور ایسا اسے اپنی عزت اور جان دونوں کو بچانے کے لئے کرنا پڑ رہا تھا، چاروں اور پھیلے سناٹے میں اس کے بھاگتے قدموں کی آواز کبھی آہستہ اور کبھی تیز ہو جاتی تھی، وہ بھاگ رہی تھی اور سردی اور ٹھنڈ اس کی رگوں میں دوڑتے خون کو منجمد کرنے کے درپے تھی، پرانی سی بوسیدہ شال اور پاؤں میں پہنے سلیپرز، صاف ظاہر کر رہے تھے کہ اسے اچانک اور بنا کسی پیشگی پروگرام کے یوں گھر سے نکلنا پڑا تھا، اس کا سانس خطرناک حد تک پھول چکا تھا اور اکڑی ہوئی ٹانگوں نے مزید آگے بڑھنے سے قطعی انکار کر دیا تھا، ٹاہلی کے پرانے درخت کے پاس رک کر اس نے اپنی سانس ہموار کرنے کی کوشش کی تھی، تاروں کی مدھم روشنی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے چاروں جانب دیکھتی وہ اچانک چونک گئی تھی، اپنے پیچھے کسی کے تیز تیز بولنے کی آواز اور بھاری دھمک سے پڑتے قدم، وہ تھرا کر رہ گئی تھی، اس کا دل خزاں رسیدہ پتے کی مانند لرزنے لگا تھا، اسے اپنا انجام بہت قریب اور واضح نظر آنے لگا تھا، مگر نہیں اسے کسی کا تسلی دیتا، ہمت بندھاتا لہجہ اور آنکھوں سے چھلکتی امید یاد آئی تھی اور اس کے قدموں نے ایک بار پھر سے رفتار پکڑ لی تھی، اسے ہارنا نہیں تھا۔

☆☆☆

صبح کے چار بجے تھے جب انہوں نے بستر چھوڑا تھا، گرم گرم بستر سے نکلتے ہی اک کپکپی سی
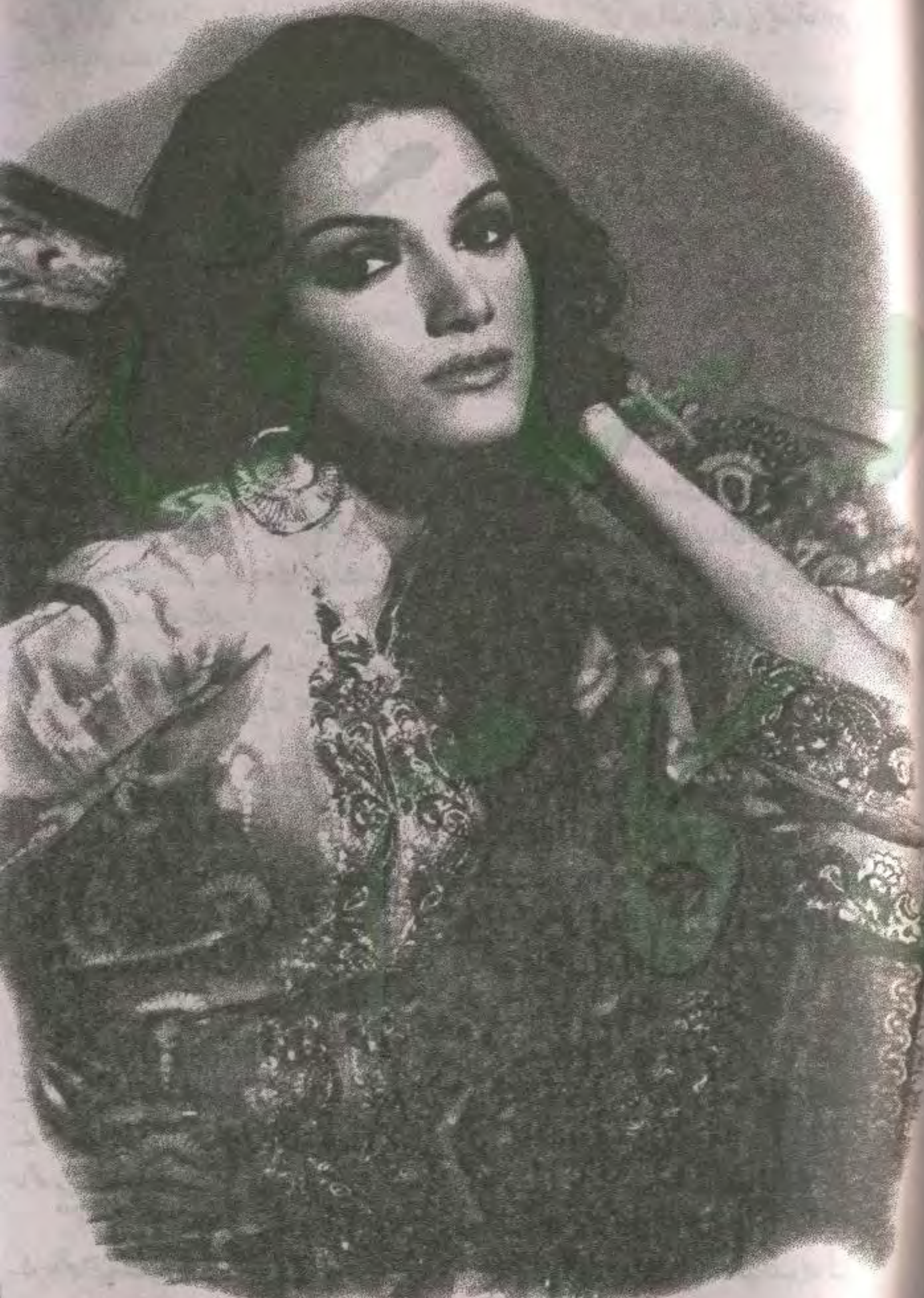
ان کے پورے وجود میں دوڑ گئی تھی انہوں نے بے اختیار جھرجھری لی تھی، پھر اک نظر سوئی ہوئی صفیہ پر ڈال کر وہ واش روم کی جانب بڑھے تھے، گرم پانی سے وضو کرنے کے بعد انہوں نے سفید جرسی پہنی براؤن گرم ٹوپی اور سیاہ چادر اوڑھ کر وہ بیڈ روم کا دروازہ بند کرکے باہر نکل آئے تھے جس وقت انہوں نے مین ڈور کھول کر قدم باہر رکھا تھا، ٹھیک اسی وقت کسی نے سیاہ آہنی گیٹ کو بڑے زور سے بجایا تھا۔

"اس وقت کون ہو سکتا ہے؟" ذرا حیرت سے بڑبڑاتے ہوئے وہ گیٹ کی جانب بڑھے تھے۔

"کون ہو تم؟" سیاہ شال سے چہرا چھپا کر کھڑی تھر تھر کانپتی لڑکی کو انہوں نے انتہائی حیرت سے دیکھتے پوچھا تھا، سوال پر اس نے شال چہرے سے ہٹائی تھی اور وہ حیرت سے اپنی جگہ سن کھڑے رہ گئے تھے۔

"میں ماہین کمال شاہ ہوں۔" اس کے سردی کی شدت سے نیلے پڑتے ہونٹ بمشکل حرکت میں آئے تھے۔

"مگر تم اس وقت یہاں کیسے؟ خیرت تو ہے ناں بیٹا!" وہ آگے ہو کر اسے سہارا دیتے ہوئے پوچھ رہے تھے جو لگتا تھا اب گری کے تب، اور اسے تو لگتا تھا سہارے کی تلاش تھی تبھی ان کے بازو کا آسرا لیتے ہی وہ جھول گئی تھی۔

☆☆☆

"مجھے طلاق چاہیے آج کے آج اور ابھی کے ابھی۔" تن کر کھڑی رخسار نے اپنا مطالبہ اس کے سامنے رکھا تو ایک لمحے کو شاہ ذر کے ساتھ ساتھ رقیہ بیگم بھی ششدر رہ گئیں تھیں۔

"آر یو ان یور سنس؟" سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ اس نے بہت غصے سے پوچھا تھا۔

"ہونہہ تمہارے جیسے انسان کے ساتھ رہ کر کوئی اپنے سنسز میں رہ سکتا ہے؟" طنز سے سر جھٹکتے اس نے تمسخر آمیز انداز میں پوچھا تھا اور شاہ ذر کو اس کا انداز آگ لگا گیا تھا۔

"بکواس بند کرو اپنی تم کیا تکلیف ہے تمہیں یہاں؟ ہر طرح کا عیش و آرام، آزادی، روپیہ پیسہ کس چیز کی کمی ہے جو ہر تیسرے دن یوں ہنگامہ کرنے کھڑی ہو جاتی ہو؟" شاہ ذر کے کچھ بھی بولنے سے پہلے دروازے کے باہر کھڑی رقیہ بیگم تیر کی طرح اندر داخل ہوئی تھی اور آتے ساتھ ہی انہوں نے ڈپٹ کر اس سے پوچھا تھا۔

"آپ......؟ آپ کی ہمت کیسے ہوئی بلا اجازت میرے روم میں آنے کی اور آپ ہوتی کون ہیں میرے معاملات میں دخل دینے اور مجھ سے یوں سوال جواب کرنے والی۔" وہ بہت برے لہجے میں چیخی تھی اور شاہ ذر کا ضبط بس یہاں تک ہی تھا، وہ آگے بڑھا اور کھینچ کر ایک تھپڑ اس کے گال پر دے مارا تھا، وہ اوندھے منہ بیڈ پر جا گری تھی، جبکہ رقیہ بیگم ابھی تک شاک کی سی کیفیت میں کھڑی تھی، انہیں یقین نہیں آرہا تھا ابھی کچھ دیر پہلے انہوں نے جو کچھ سنا وہ ان سے ان کی اسی لاڈلی بھانجی نے کہا ہے جسے وہ بڑے ارمانوں سے بیاہ کر لائیں تھیں، رخسار ان کی پیاری بہن صفیہ کی اکلوتی بیٹی تھی، باپ کی لاڈلی اور تین بھائیوں کی چھوٹی بہن، باپ کے پاس ڈھیروں دولت، اونچا حسب و نسب اور قدرت کی طرف سے فیاضی سے دیا گیا بے تحاشا حسن، اس میں صرف نزاکت نہیں بہت سا غرور و طنطنہ بھی آ گیا تھا، وہ بہت نازک مزاج اور تنک چڑی تھی، کچھ لاڈ پیار اور ہر طرف سے اٹھائے گئے ناز نخرے اور ملنے والی ستائش، مزاج ساتویں آسمان پر نہ پہنچتا تو اور کیا ہوتا، وہ جب تک بھانجی

رہی وہ خود بھی بڑے چاؤ سے اس کے ناز اٹھاتی رہی تھی، خود ان کے دو ہی بچے تھے، شاہ ذر اور لائبہ، بلا کا ہینڈسم، ذہین و فطین اور باپ کے کروڑوں کے بزنس کا اکلوتا وارث شاہ ذر اور سادہ مزاج، ہنس مکھ اور درمیانی شکل و صورت کی لائبہ، دونوں ہی ان کے بہت فرمانبردار رہے تھے، لائبہ کی شادی انہوں نے اس کے ماسٹرز کمپلیٹ ہونے کے فوراً بعد ہی اس کے چچا زاد سے کر دی تھی، جبکہ شاہ ذر کے لئے انہوں نے جب جب سوچا تب تب رخسار چھم سے ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی اور جب انہوں نے شاہ ذر سے رائے مانگی اور اس کے سامنے رخسار کا نام رکھا تو اس کی آنکھوں میں یک لخت در آنے والی چمک انہیں لگا ان کا انتخاب سو فیصد درست ہے انہوں نے بہت چاؤ سے لائبہ کو مانگا تھا اور رشتہ فائنل ہوتے ہی دونوں طرف سے شادی کی تیاری پوری دھوم دھام سے ہونے لگی تھی، شاہ ذر کی شادی میں ہر شخص ہی بے حد خوش تھا سوائے سکندر شاہ کے، جو اپنے بیٹے کی شادی جیسے پر مسرت موقع پر اپنی اکلوتی بہن زہرا بتول کی کمی شدت سے محسوس کر رہے تھے، جس کی شادی کمال شاہ سے ہوئی تھی اور جو پچھلے کتنے ہی سالوں سے ان سے ملنے نہیں آ سکی تھی اور نہ ہی وہ ان سے ملنے جا سکے تھے، خیر رخسار کی شادی ہوئی اور وہ فیروز ولا سے شاہ ہاؤس آ گئی تھی، وہ خوبصورت تھی اور شادی کے بعد تو گویا اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگ گئے تھے، شاہ ذر تو اس کا دیوانہ بنا پھرتا تھا اور یہی بات اسے آسمان سے زمین پر نہ آنے دیتی تھی، دن، ہفتے، مہینے گزرتے رہے اور ان سب پر رخسار فیروز کھلتی چلی گئی تھی وہ مغرور تھی، بنتا تھا، تنک چڑی تھی، در گزر سے کام لیا جا سکتا تھا، نازک مزاج، آرام طلب کوئی بات نہیں مگر وہ موڈی تھی اور بے حد غیر مستقل مزاج، وہ چیزوں سے رویوں سے رشتوں سے یہاں تک کے انسانوں سے بھی بہت جلد اکتا جاتی تھی، اس کے مزاج میں ٹھہرو اور پختگی تو ایک طرف بلا کا بچپنا تھا، اس کا مزاج موسموں کی طرح بدل جاتا تھا، کبھی کبھی وہ بلا کی نرم مزاج اور صلح جو لگنے لگتی اور شاہ ذر اور گھر والوں کا احساس، سب کے ساتھ ہنسی مذاق اور کبھی اتنی روڈ اور بیزار جیسے کسی کے ساتھ نہ کوئی تعلق ہو، نہ واسطہ جب وہ اچھی ہوتی تو بے انتہا اچھی اور جب بری ہوتی تو انتہائی ناقابل برداشت۔

شاہ ذر جیسا سمجھدار اور معاملہ فہم انسان بھی اسے سمجھنے اور سمجھانے سے قاصر تھا، دن یونہی کبھی نرم کبھی گرم سے گزر رہے تھے جب رخسار کی رپورٹ پوزیٹو آئی تھی اور سارے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی، ڈھیروں ڈھیر مٹھائیوں اور پھلوں میووں کے ٹوکروں کے ساتھ فیروز ولا کے مکین مبارکباد دینے آئے تھے، رخسار گردن اٹھائے کسی ملکہ کی طرح بیٹھی تھی اور آج تو شاہ ذر اور صفیہ بیگم بھی خوشی خوشی اس کے ناز اٹھا رہے تھے، پریگنینسی پریڈ کے دوران شاہ ذر کے جس طرح اس کا خیال رکھا تھا کوئی دوسری عورت ہوتی تو خوشی سے زمین پر پاؤں نہ رکھتی، مگر وہ تو رخسار تھی اور رخسار پھر رخسار تھی بگڑے بگڑے تیوروں کے ساتھ وہ شاہ ذر کے ساتھ سیدھے منہ بات بھی نہ کرتی تھی، دراصل وہ ابھی بچے وغیرہ کے جھنجھٹ میں ہی نہیں پڑنا چاہتی تھی، شاہ ذر جتنا اس کا خیال رکھتا، پرواہ کرتا وہ اتنا ہی نخرہ دکھاتی، کبھی کبھی تو رضیہ بیگم کو اس پر شدید قسم کا غصہ چڑھتا اور ان کا دل چاہتا کہ کھینچ کر دو تھپڑ اسے لگائیں اور سارے بگڑے تگڑے تیور منٹوں میں

ٹھکانے آجائیں۔

جنوری کی ایک سرد سی شام رخسار نے دو جڑواں بچوں کو جنم دیا تھا، شاہ زر خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا اور آج تو رقیہ بیگم بھی ساری کدورت بھلائے خوشی خوشی مٹھائیاں بانٹنے میں مصروف تھی، سکندر شاہ بھی پوتے پوتی کو دیکھ کر بے انتہا خوش تھے، انہوں نے بڑے چاؤ سے پوتے کا نام اسامہ شاہ اور پوتی کا نورالعین رکھا تھا۔

☆☆☆

بچوں کے بعد بھی رخسار کے مزاج پر کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، وہ کل بھی ناقابل برداشت مزاج و عادات کی مالک تھی وہ آج بھی ایسی ہی تھی، اب تو شاہ زر نے بھی تنگ آکر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا اور یہی چیز اب اسے کھلنے لگی تھی، پہلے وہ اس کی محبت اور توجہ سے چڑتی تھی، اب اس کی بے نیازی اور لاپروائی پر جان جلاتی رہتی تھی، مگر صرف اپنی نہیں شاہ زر کی بھی، وہ آفس سے آنے کے بعد زیادہ تر وقت اب بچوں کے ساتھ گزارتا تھا اور رخسار کو اس پر بھی اعتراض تھا، دراصل کچھ عورتیں ناشکری ہوتی ہیں اور رخسار انہی میں سے ایک تھی، آئے دن کے ہنگامے، جھگڑے شاہ زر کی زندگی ہی نہیں ذات بھی ڈسٹرب ہو گئی تھی، وہ ساری ساری رات سگریٹ پھونکتے گزار دیتا تھا، اس کی خوش مزاجی گہری سنجیدگی میں تبدیل ہو چکی تھی اور اسے دیکھ کر اب کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ چند سال پہلے والا شاہ زر ہے، کہتے ہیں عورت چاہے تو مرد کو پورا کا پورا بدل سکتی ہے، سچ کہتے ہیں رخسار نے بھی اسے بدل دیا تھا، اسے انسان سے پتھر میں تبدیل کر دیا تھا۔

☆☆☆

"تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا؟" وہ بپھر کر اٹھی تھی۔

"تمہاری اتنی ہمت؟" اس نے شاہ زر کے گریبان پر ہاتھ ڈالا تھا، لہو رنگ آنکھوں سے اسے دیکھتے شاہ زر نے ایک اور تھپڑ اس کے دائیں گال پر دے مارا تھا، وہ ذرا سا لڑکھڑائی تھی اور گریبان اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔

"ہاں مارا بلکہ مجھے یہ تھپڑ بہت پہلے تمہیں مار دینا چاہیے تھا، کیونکہ تم اس قابل تھی، ہوں اور رہوں گی، تم ان عورتوں میں شامل ہو جو واقعی صرف پاؤں کی جوتی بننے کے لائق ہیں اور جنہیں پاؤں میں ہی رہنا چاہیے اور میں نے جوتی کو سر پہ سجانے کی کوشش کی، تمہیں عزت دینے کی کوشش کی یہ جانے بغیر کے عزت پانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی میں غلط تھا، مگر میری غلطی کو میری بزدلی میری کم ہمتی یا میری محبت سمجھنے کی کوشش مت کرنا، یہ میرا احساس تھا جو مجھے اپنے بچوں کا تھا، میں نہیں چاہتا تھا کہ ان کے معصوم ذہن الجھیں، اسی لئے نا چاہتے ہوئے بھی میں تم جیسی عورت کو برداشت کرتا رہا۔" وہ ایک لمحے کو رکا تھا، اس نے بالکل ساکت کھڑی ماں پر اور گال پر ہاتھ رکھے صدمے کی سی کیفیت میں کھڑی بیوی پہ نظر ڈالی تھی۔

"ہر چیز کی شروعات ہوتی ہے تو اختتام بھی ہوتا ہے اور میرا خیال ہے اب اس روز روز کے ڈرامے کا اختتام ہو جانا چاہیے، تو رخسار بیگم میں آج کے آج اور ابھی کے ابھی تمہاری خواہش پوری کرنے کو تیار ہوں، میں شاہ زر سکندر شاہ بقائمی ہوش و حواس......"

"نہیں...... نہیں...... بیٹا......" رقیہ بیگم نے بجلی کی سی تیزی سے اسے کے لبوں پر ہاتھ رکھ کر اسے بولنے سے روکا تھا۔

"خدا کے لئے نہیں بیٹا، یہ پاگل ہے، جذباتی، نادان اور بیوقوف ہے مگر تم تو ہوش سے کام لو، ابھی نہیں کم از کم میرے جیتے جی نہیں ہاں میں مر جاؤں تو پھر جو جی میں آئے کرنا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی تھیں، وہ چند لمحے لب بھینچے انہیں دیکھتا رہا تھا، پھر جھٹکے سے باہر نکل گیا تھا، پیچھے رخسار بکتے جھکتے اپنی چیزیں سمیٹنے میں مصروف ہو گئی تھی، ان کے روکنے اور منع کرنے کے باوجود وہ اپنی ساری چیزیں سمیٹ کر اس اعلان کے ساتھ کہ وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گی جا چکی تھی، ہاں البتہ پانچ سالہ اسامہ اور نورالعین کو لے جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

وہ سال ہو چکے تھے رخسار کو ان کی زندگیوں سے نکلے اور شاہ زر کو اپنے خول میں سمیٹے اس نے خود کو کاروبار اور بچوں تک محدود کر لیا تھا اور اپنے اردگرد ایسی اونچی دیواریں کھڑی کر لی تھی کہ وہ سوائے دکھ سے کڑھنے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں کر سکتی تھیں۔

☆☆☆

اسے جب ہوش آیا تو اس نے خود کو نرم گرم بستر پر لیٹے پایا تھا اور نم آنکھوں میں ڈھیروں فکر مندی لئے سکندر شاہ اس کے سرہانے موجود تھے، اس نے بے ساختہ اٹھنے کی کوشش کی تھی مگر کراہ کر رہ گئی تھی، دھان پان سے اس کے وجود پر کڑاکے کی سردی اپنا اثر دکھا چکی تھی۔

"لیٹی رہو بیٹا۔" سکندر شاہ نے محبت و نرمی سے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا تھا، ان کی شفقت پر اس کی آنکھیں بھر آئی تھی۔

"اونہوں روتے نہیں بیٹا۔" انہوں نے جھک کر اس کے بالوں پر بوسہ دیتے کہا تھا۔

"بھئی رقیہ، ماہین بچے کو ہوش آ گیا ہے آپ ان کے لئے کچھ کھانے وغیرہ کو لے آئیں، میں ابھی آتا ہوں۔" کچھ دیر بعد انہوں نے باہر آتے رقیہ بیگم سے کہا تھا، وہ سر ہلانے لگی تھی، وہ خود باہر کی جانب بڑھ گئے تھے۔

☆☆☆

ماہین کمال شاہ، احمد کمال شاہ، کمال شاہ اور زہرا بتول کے دو ہی جگر گوشے، دونوں ہی لاڈلے دونوں ہی پیارے، گندمی رنگت سیاہ آنکھوں، گھنی پلکوں والی سادہ اور نرم مزاج ماہین جس میں اس کے بابا کی جان تھی تو بلا کے ذہین اور شرارتی احمد اپنی مما کا لاڈلہ تھا، میرا گھر میری جنت کے مصداق ان سب کے لئے بھی ان کا گھر بہشت نما تھا جہاں اگر ماہین کی معصوم ہنسی ہر وقت گونجتی تھی تو احمد کی شرارتیں، بابا جان کی شفقت تھی تو مما جان کی پیار بھری ڈانٹ، وہ اپنے گھر میں اپنی جنت میں خوش تھے مطمئن تھے مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کو ان کا سکون و اطمینان ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا اور وہ کوئی غیر نہیں کمال شاہ کے بہت "اپنے" تھے، کہانی وہی روایتی سی تھی۔

کمال شاہ اور زہرا کی یونیورسٹی میں اتفاقیہ ملاقات، پھر ہر روز کی ملاقاتوں میں بدلی تعارف، واقفیت شناسائی دوستی اور انجام کار دھواں دھار قسم کی محبت، کمال شاہ اپنی بچپن کی منگ کے ساتھ ساتھ حویلی کی روایت بھلائے زہرا کے ساتھ وعدے وعید، عہد و پیمان باندھتے رہے، پھر زہرا کے گھر سکندر شاہ کے دوست کا پرپوزل آیا اور بہت بڑا طوفان بڑی حویلی میں، پہلی بار تھا جب آغا جان کے سامنے ان کا اپنا بیٹا ان کے فیصلے سے انحراف اور اختلاف لئے ان کے سامنے کھڑا تھا، انہیں شدید قسم کا دھچکا لگا تھا، غصہ، دھونس، زبردستی یہاں تک کے لاڈ پیار جذباتی بلیک میلنگ کا سہارا تک لیا

گیا مگر وہ جو ایک زہرا بتول پر اٹک گیا تو ایک انچ بھی ہلنے کو تیار نہیں، نہ آغا جان راضی تھے نہ وہ ہار مان رہا تھا، حویلی کے در و دیوار نے بڑے عجیب دن دیکھے تھے، وہ جب حویلی کے مردوں نے گہری چپ اوڑھ لی تھی اور حویلی کی عورتوں کا سارا دن ساری زیر لب خیر کی دعائیں مانگتے گزرتا تھا، خیر قصہ کب تک چلتا بالآخر کمال شاہ کی خودکشی کی کوشش نے بابا جان کو سرنڈر کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور اسی مجبوری کے تحت وہ زہرا بتول کو بیاہ کر لے تو آئے تھے مگر وہ دل میں اگا نفرت کا پودا نہ اکھاڑ سکے جو رفتہ رفتہ تناور درخت بن چکا تھا، کمال شاہ نے جو لہجوں کی کڑواہٹ اور رویوں کی اجنبیت محسوس کی تو بہت خاموشی سے زہرا کو لے کر الگ گھر بسا لیا، حویلی کے بڑوں کو اس خبر سے بہت گہرا صدمہ لیا دل میں موجود بغض اور عناد گہری نفرت میں تبدیل ہوا سارا قصور زہرا بتول کے حصے میں لکھا جانے لگا، وہ اسے خطا کار سمجھنے اور کہنے لگے یہ جانے بغیر کے کبھی کبھی بٹوارہ چھوٹوں کی نادانیوں کے بجائے بڑوں کی غلطیوں کی وجہ سے بھی ہو جایا کرتا ہے۔

☆☆☆

وقت کا پنچھی اڑان بھرتا رہا اور سال سرکتے رہے وہ دونوں ہی ایک دوسرے کی معیت میں بہت خوش و خرم کتاب زیست پر اپنی کامیابیاں اور کامرانیاں درج کرتے رہے تھے، دن سبک خرامی سے گزر رہے تھے جب ایک دن سکندر شاہ اپنی اکلوتی بہن سے ملنے آئے تھے اور کمال شاہ کے بڑے بھائی ان سے خوامخواہ الجھنے لگے تھے، وہ چونکہ بہن کے سسرال میں تھے اور رشتہ نازک تھا سو برداشت کرتے رہے مگر کب تک، بالآخر ان کے ہاتھ سے ضبط کا دامن چھوٹا تھا اور یہی تو حویلی والے چاہتے تھے، آغا جان نے فیصلہ دے دیا کہ سکندر شاہ آج کے بعد کبھی حویلی نہیں آئیں گے کمال شاہ نے ان کے اس فیصلے پر احتجاج کرنا چاہا تھا، مگر سکندر شاہ نے انہیں روک دیا تھا اور نہ ہی یہاں سے کوئی وہاں جائے گا آج سے ہمارا ان کا ناطہ ختم، دل میں ڈھیروں اختلاف لئے کمال شاہ زہرا بتول کی آنسو بھری آنکھوں کی التجا دیکھ کر بمشکل ضبط کر پائے تھے۔

☆☆☆

''ہم نے احمد کا رشتہ سکینہ کے ساتھ اور ماہین کا زوار کے ساتھ طے کر دیا ہے۔'' آغا جان نے کمال شاہ اور زہرا بتول کو بلا کر اپنا فیصلہ سنایا تھا وہ دونوں سناٹے میں رہ گئے تھے۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے بابا جان، سکینہ احمد سے دس سال بڑی ہے اور زوار ماہین سے پورے نو برس چھوٹا ہے۔'' کمال شاہ نے بمشکل زبان کھولی تھی۔

''تم تو ایسے کہہ رہے ہو کمال شاہ جیسے ہمارے خاندان میں آج سے پہلے کوئی ایسا رشتہ طے نہ ہوا ہو۔'' بڑے بھائی نے طنزیہ نظروں اور تمسخرانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا تھا۔

''ہاں مگر اب زمانہ بدل چکا ہے لالہ۔'' زہرا نے ڈرتے ڈرتے کہا تھا، انہوں نے کوفت سے پہلو بدلا۔

''بس بی بی تم تو نہ ہی بولو تو بہتر ہے یہ ہمارے گھر کے مسئلے ہیں اور رہی بات زمانے کی تو وہ بھلے بدلتا رہے مگر اس حویلی کے رسموں و رواجوں کو نہ کوئی بدل سکا ہے نہ بدل سکے گا۔'' بی جان نے ایک سیکنڈ میں انہیں پرایا کہتے ہوئے جتا دیا تھا کہ وہ آج بھی انہیں کسی گنتی کسی شمار میں نہیں رکھی جاتی۔

''یہ اس گھر کے نہیں میری اولاد کی زندگی اور ان کی خوشیوں کا مسئلہ ہے بی جان اور آغا جان۔'' وہ بہت ٹھہرے ہوئے لہجے میں انہیں جواب دے کر آغا جان کی طرف مڑی تھی۔

''مجھے یہ دونوں ہی رشتے منظور نہیں۔''

اس بار دھونس اور زبردستی کے ساتھ ساتھ دھمکیاں اور ڈراوے بھی دیے جانے لگے تھے دلوں کے ساتھ چہرے بھی بدل گئے تھے اور اپنوں کے رویوں میں در آنے والی اجنبیت اور ناگواری انسان کو اندر سے تو دیا کرتی ہے، زہرا بھی ٹوٹ گئی تھی یا اتنی نفرت سہتے سہتے تھک گئی تھی تبھی بہت خاموشی سے شہر خموشاں میں بسیرا کر لیا تھا، احمد تعلیم کی وجہ سے بیرون ملک مقیم تھا، سو فوراً تو کیا آ ہی نہیں سکتا تھا، ماہین اس موقع پر اس کی کمی شدت سے محسوس کر رہی تھی مگر بابا جان کے سامنے خود کو مضبوط ظاہر کر رہی تھی، تو فون کے اس پار بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے احمد کو بھی سنبھال رہی تھی، زہرا کی وفات نے ان سب کو ہی بہت خاموش اور اداس کر دیا تھا اور تین ماہ بعد جب پچیس سالہ ماہین کا نکاح سولہ سالہ زوار کے ساتھ کرنے کی بات چھیڑی گئی تھی اسی شام کمال شاہ کو پہلا ہارٹ اٹیک ہوا تھا، زہرا کی جدائی اور اپنوں کی بے رخی نے ان کے دل کو بہت کمزور کر دیا تھا، وہ پورا ہفتہ ہاسپٹل رہ کر آئے تھے اور اب کی بار ماہین چاہ کر بھی خود کو مضبوط اور بہادر ظاہر نہیں کر پائی تھی، وہ ان کے سینے سے لگ کر بچوں کی طرح روئی تھی اور ان کے گھر آنے کے دو دن بعد آغا جان ان کے پورشن میں آئے تھے۔

''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ماہین اور زوار کا نکاح اگلے ماہ کے بجائے اسی ہفتے رکھ دیا جائے۔'' وہ فیصلہ سنا کر جا چکے تھے اور کمال شاہ گم صم سے بیٹھے رہ گئے تھے، کہتے ہیں ماں باپ بن کہے اولاد کے غم جان لیتے ہیں ان کی خوشی پہچان لیتے ہیں، یہ کیسے ماں باپ تھے جنہیں ان کے چہرے پر لکھی دکھ کی تحریر نظر نہیں آ رہی تھی۔

انہوں نے بہت سوچ و بچار کی، ہر طرف نظر و ذہن دوڑایا سوائے ایک راہ کے اور کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا، تب انہوں نے ماہین کو بلایا، سمجھایا، وہ کسی صورت انہیں یوں اس حالت میں چھوڑ جانے پر تیار نہیں تھی، مگر ان کا اصرار، بالآخر اسے منانا پڑا، ان کا وفادار ملازم کرم الٰہی اسے پکی سڑک تک بہت خاموشی سے چھوڑ آیا تھا آگے کا راستہ اسے اکیلے ہی طے کرنا تھا۔

نجانے کب اور کیسے حویلی والوں کو خبر ہوئی تھی اور وہ جسے بس میں بیٹھے بمشکل دس منٹ ہی ہوئے تھے دھر لی گئی تھی، وہ واپس لائی گئی تھی اور چھوٹے کمرے میں قید کر دی گئی تھی کمال شاہ تک یہ خبر جنتاں نے پہنچائی تھی۔

''صاحب میں نے آغا جی اور سب کی باتیں چھپ کر سنی ہیں، ان کا ارادہ ماہین بی بی کو ختم کرنے یا پھر زوار صاحب کے بجائے فراز صاحب سے نکاح کرنے کا ہے۔'' اور وہ تھرا کر رہ گئے تھے۔

کاش وہ زہرا اور بچوں کو لے کر یہاں حویلی میں ہی الگ پورشن بنوانے کے یہاں سے کہیں دور بہت دور چلے گئے ہوتے، ان کے دل نے شدت سے خواہش کی تھی انہوں نے جنتاں کو ہدایت کی تھی کے حویلی میں کسی کو بھی یہ بات پتہ نہیں چلنی چاہیے کہ وہ جانتے ہیں کہ ماہین چھوٹے کمرے میں مقید ہے، جنتاں سر ہلاتی واپس چلی گئی تھی وہ رات انہوں نے انگاروں پر لوٹتے گزار دی تھی، ان کے اپنے ہی تھے جو ان کے اور ان کی اولاد کی خوشیوں کے قاتل تھے، دشمن تھے ان کی برداشت سے باہر کی بات تھی یہ۔

تو گویا ان سب کے دل آج بھی کدورت

زدہ تھے، ان کے دلوں سے میل چھٹی نہیں تھی، ان نے کرب سے سوچا تھا۔

ماہین کو انہوں نے بہت مشکلوں سے چھوٹے کمرے سے نکالا تھا، وہ ان سے لپٹ کر شدتوں سے روئی تھی، خود ان کی اپنی آنکھیں بھی بے اختیار ہو کے چھلک رہیں تھیں، مگر وقت کم تھا، اس بار انہوں نے ماہین کو رات کی سیاہی میں حویلی سے نکالا تھا، سفید بند لفافہ اس کے ہاتھ میں تھماتے انہوں نے اس کی پیشانی پر الوداعی بوسہ دیا تھا۔

"جاؤ بیٹا اللہ کے حوالے اور اپنے اس مجبور باپ کو معاف کر دینا وہ تمہارے لئے کچھ کر نہیں سکا۔" خود پر قابو پاتے انہوں نے ضبط کے نجانے کون کون سے کڑے مراحل طے کرتے کہا تھا، وہ بمشکل سسکیاں دباتی ان کے سینے سے الگ ہوئی تھی اور انجان راستوں کی جانب چل پڑی تھی۔

☆☆☆

سکندر شاہ نے آنکھوں کی نمی صاف کرتے شدتوں سے روتی ماہین کا سر سینے سے لگایا تھا اس کے رونے میں شدت آئی تھی۔

"ناں بچے ناں روتے نہیں، اللہ پر بھروسہ رکھو وہ یقیناً بہتر کرنے والا ہے اور پھر تم اب اپنے ماموں کے پاس ہو بال بھی بیکا نہیں کر سکتے وہ تمہارا میں ہوں ناں تمہارے ساتھ۔" ان کی تسلی بھرے انداز پر اس نے بمشکل سر ہلایا تھا جبھی فون کی گھنٹی بج اٹھی تھی۔

وہ دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے اور تھوڑی گھٹنے پر جمائے مغموم سی بیٹھی تھی، آنسو بہت تواتر سے اس کے چہرے کو بھگوتے جا رہے تھے، اسے مما بہت شدت سے یاد آ رہی تھیں اسے احمد بہت شدت سے یاد آ رہا تھا اور بابا جان، اس کے لبوں سے سسکی سی برآمد ہوئی تھی، ابھی کچھ دیر پہلے ہی اس کی ان سے بات ہوئی تھی انہوں نے اسے ڈھیروں ڈھیر تسلیاں اور دلاسے دیئے تھے، وہ ان کی آواز سنتے ہی رونا شروع ہو گئی تھی۔

"تم جانتی ہو ماہین تمہارے آنسو مجھے تکلیف دیتے ہیں۔" انہوں نے کرب آمیز آواز میں کہا تھا اس نے فوراً اپنے آنسو صاف کیے تھے اور رندھے ہوئے گلے کے ساتھ احمد کا پوچھا تھا، احمد کو اس ساری صورتحال سے لاعلم رکھا گیا تھا کیونکہ ان حالات میں اس کا واپس آنا صحیح نہیں تھا، وہ لوگ اسے نقصان پہنچا سکتے تھے۔

"احمد ٹھیک ہے کل کال کی تھی اس نے تمہارا پوچھ رہا تھا میں نے اطمینان دلا دیا تھا کہ ہم دونوں باپ بیٹی مزے میں ہیں۔" اور ایسی ہی کچھ دوسری باتوں کے بعد انہوں نے فون بند کر دیا تھا، فون بند کر کے بھی وہ کتنی ہی دیر آنسو بہاتی رہی تھی۔

☆☆☆

بڑی حویلی والوں کو خبر ہو چکی تھی کہ وہ سکندر شاہ کے گھر میں ہے جبھی بڑی حویلی سے آنے والی کال میں ڈھیروں لعن طعن اور دھمکیوں کے علاوہ یہ اعلان بھی تھا کہ وہ کل شام اپنی ہونے والی بہو کو لینے اور بینڈ باجے کے ساتھ لینے کے لئے سکندر شاہ کے گھر آ رہے ہیں، اس بات نے جہاں سکندر شاہ کو مشتعل کر دیا تھا وہیں ماہین کو بے حد ہراساں، انہوں نے پوری رات جاگ کر اور اس مسئلے کا حل سوچتے گزاری تھی، بالآخر صبح کی اذانوں کے ساتھ ہی وہ ایک فیصلے پر پہنچ چکے تھے شاہ ذر اور ماہین کے نکاح کے فیصلے پر۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سکندر؟" رقیہ بیگم نے انتہائی ششدر سا ہوتے ہوئے ان سے سوال کیا تھا کل رات ہی لاہور سے واپس آیا شاہ ذر بھی انہیں حیران حیران نظروں سے دیکھ رہا

تھا۔

"آپ جانتے ہیں ایسا ممکن نہیں ہے۔"

"کیوں ممکن نہیں ہے؟ سارے حالات تمہارے سامنے ہیں، ان حالات میں اس سے بہتر فیصلہ اور کیا ہو سکتا ہے۔" انہوں نے چائے کا گھونٹ بھرتے اطمینان بھرے لہجے میں کہا تھا رقیہ بیگم پہلو بدل کر رہ گئیں تھیں۔

"ہاں اگر تم اپنی بھانجی کی وجہ سے کہہ رہی ہو تو رقیہ بیگم اس کا واپس آنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔" انہوں نے خالی کپ میز پر رکھتے کہا تھا۔

"آئم سوری بابا جان مگر امی ٹھیک کہہ رہی ہیں یہ ممکن نہیں ہے۔" خاموش بیٹھے شاہ ذر نے بھی سنجیدہ سے لہجے میں انکار کیا تھا۔

"ممکن کیوں نہیں ہے شاہ ذر۔" انہوں نے سابقہ اطمینان بھرے لہجے میں دریافت کیا تھا۔

"کیا ماہین میں کوئی کمی ہے؟"

"ایسی بات نہیں ہے بابا جان۔" وہ ذرا سا جھنجھلایا تھا، وہ اس کا مسئلہ سمجھ نہیں رہے تھے اس کے اندر سے کسی بھی عورت کے ساتھ کی خواہش ختم ہو چکی تھی۔

"تو پھر اگر تم اسامہ اور عینی کی وجہ سے کہہ رہے ہو تو شاہ ذر انہیں ایک اچھی ماں کی ضرورت ہے اور مجھے یقین ہے ماہین ایک اچھی ماں ثابت ہو گی۔" ان کی بات پر اس نے سر جھکا اب وہ انہیں کیسے بتاتا کہ اس کے بچوں کو ماں کی ضرورت ہو سکتی ہے اسے بیوی کی ضرورت نہیں ہے۔

"اور پھر بیٹا تمہیں اسے چاہے میرا حکم سمجھو یا میری التجا تمہیں ماہین سے نکاح کرنا ہی ہو گا۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ماموں جان؟ شاہ ذر لالہ اور میں...... نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ بے یقین نظروں سے انہیں دیکھتی مسلسل نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

"دیکھو ماہین بیٹا، زندگی میں بعض اوقات ایسے نشیب و فراز آ جاتے ہیں کہ انسان کو کٹھن اور مشکل فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔" انہوں نے رسان بھرے لہجے میں اسے سمجھانا شروع کیا تھا اور وہ جس کا سر مسلسل نفی میں ہل رہا تھا اب خاموشی سے انہیں سن رہی تھی۔

"اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے بچے اور پھر شاہ ذر بہت اچھا انسان ہے تمہیں کبھی بھی اس فیصلے پر پچھتاوا نہیں ہو گا۔" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر یقین بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"مگر ماموں جان رخسار آپی، میں ان کی جگہ کیسے لے سکتی ہوں، وہ اپنی جگہ خود چھوڑ کر جا چکی ہے ماہین اور خالی رہ جانے والی جگہیں ایک نہ ایک دن تو پر ہو ہی جایا کرتی ہیں۔"

☆☆☆

کھنچے کھنچے اعصاب کے ساتھ نکاح نامے پر دستخط کرنے کے بعد وہ وہاں موجود چند ایک عزیزوں اور دوستوں سے مبارکبادیں وصول کر رہا تھا جب جیب میں موجود سیل نے گنگنانا شروع کر دیا تھا وہ حبیب وغیرہ سے معذرت کرتا سائیڈ پر چلا گیا تھا۔

"بابا جان!" چند منٹ فون کے ساتھ مصروف رہنے کے بعد وہ ان کی طرف آیا تھا۔

"کیا ہوا؟" وہ اس کے ساتھ آ کھڑے ہوئے تھے۔

"بابا جان! کراچی والی برانچ میں کچھ مسئلہ ہو گیا ہے مجھے ارجنٹ جانا ہو گا۔" اس نے سیل پر نمبر پش کرتے انہیں بتایا تو ان کے ماتھے پر گہری لکیریں پھیل گئی تھیں۔

"عامر یا محسن کو بھیج دو۔" ان کی بات پر اس

نے نفی میں سر ہلایا۔
"نہیں ان کے بس کی بات نہیں بابا اور پھر ایک یا دو روز کی تو بات ہے۔" اس نے اپنے تئیں انہیں تسلی دی تھی، انہوں نے چند لمحے سوچا پھر اثبات میں سر ہلا کر اسے جانے کی اجازت دے دی تھی۔

"عورت ایک بار مرد کے دل سے اتر جائے تو پھر ساری زندگی کوشش کرتی رہے اس کے دل میں نہیں اتر سکتی۔" ماں کی بات پر اس نے چونک کر انہیں دیکھا تھا۔

"وہ بھی اس صورت میں جب اس کی جگہ کوئی دوسری عورت لے چکی ہو یہ ناممکن سے بھی پرے کی چیز ہوتی ہے۔" اب کی بار وہ ٹھٹکی بھی تھی مگر بے نیازی کی پرت خود پر چڑھائے چینل سرچنگ میں مصروف تھی۔

"کیا کمی تھی بھلا۔" اس کی ماں نے تاسف سے ہاتھ مسلتے اسے کن انکھیوں سے دیکھا تھا۔

"عالیشان گھر، محبت کرنے والا شوہر اور پیارے پیارے بچے، مگر تم قدر نہیں کر پائی ناشکری کرتی رہی، اور جو اللہ کی دی نعمتوں کی قدر نہیں کرتا وہ نعمتیں اس سے لے کر کسی اور کو دے دی جاتی ہیں۔" اس نے الجھ کر ماں کو دیکھا تھا۔

"شاہ ذر نے دوسری شادی کر لی ہے رخسار۔" اس کے ہاتھ سے ریموٹ چھوٹ کر نیچے جا گرا تھا۔

☆☆☆

شاہ ذر کراچی دو سے تین دنوں کے لئے گیا تھا مگر اسے ہفتہ لگ گیا تھا اور اس گزشتہ ہفتے میں ماہین نے خود کو کافی حد تک سنبھالنے کے ساتھ ساتھ ایڈجسٹ بھی کر لیا تھا، ویسے بھی وہ خاصی مضبوط اعصاب کی مالک تھی، اسامہ اور عینی کے ساتھ بھی اس کی کافی حد تک دوستی ہو چکی تھی وہ دونوں اس کے ساتھ بے تکلف ہونے کے ساتھ اپنے کئی چھوٹے موٹے کام میں اس سے کروانے لگے تھے، سکندر ماموں اور رقیہ مامی تو تھے ہی اچھے سوائے زیادہ مشکل پیش نہیں آئی تھی، ہاں شاہ ذر کے حوالے سے وہ ابھی بھی کنفیوز تھی، وہ اس کی عادات وغیرہ سے لاعلم ہونے کے ساتھ ساتھ ایج ڈیفرنس اور تکلف کی ان دیکھی دیواریں، اس کے بارے میں کوئی بھی اندازہ نہ لگانے دیتی تھیں۔

سکندر شاہ کا اندازہ تھا کہ بڑی حویلی والے اتنی آسانی سے تو ماہین کے نکاح کو ہضم نہیں کریں گے اور ہنگامہ وغیرہ اٹھایا جائے گا مگر خلاف توقع ان کا ردعمل خاصا حیران کن تھا، ماہین اور شاہ ذر کے نکاح سے باخبر ہونے کے بعد انہوں نے ایک ہی مطالبہ سامنے رکھا تھا کہ ماہین لکھ کر دے دے کہ وہ اپنے باپ کی تمام دولت جائیداد میں سے حصہ نہیں لے گی، (تو انہیں ماہین کمال شاہ نہیں دولت و جائیداد چاہیے تھی) سکندر شاہ کے کہنے پر اس نے ان کے لائے کاغذات پر دستخط کر دیئے تھے، ویسے بھی اسے ان چیزوں کی حرص نہیں تھی اور سکندر شاہ کو بھی بھانجی کی زندگی اور خوشیاں عزیز تھیں۔

☆☆☆

رقیہ بیگم طبیعت صبح سے ہی کچھ بوجھل سی ہو رہی تھی، عجیب سی کسلمندی اور تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی، تبھی وہ اس وقت اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھی، سکندر شاہ ماہین اور بچے باہر موجود تھے اور ان کی باتوں کی ہلکی ہلکی آوازیں اندر تک سنائی دے رہی تھیں، انہوں نے کروٹ بدل کر وال کلاک پر نظر ڈالی تھی جب ان کے سرہانے رکھا ٹیلی فون سیٹ بج اٹھا تھا، انہوں نے ریسور اٹھا کر کان سے لگایا تھا دوسری طرف سے آنے

والی آواز نے انہیں ساکت کر دیا تھا۔

☆☆☆

اسے گھر واپس آئے دو تین گھنٹے ہو چکے تھے، فریش ہو کے کھانا کھایا پھر کافی پیتے پاپا سے گپ شپ لگائی تھی، تھکن محسوس ہو رہی تھی سو جلدی ہی انہیں شب بخیر کہہ کر وہ اپنے روم کی جانب بڑھ گیا تھا، دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی وہ چونک گیا تھا، سامنے ہی ماہین ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی بالوں میں برش کر رہی تھی، لاک لگا کر وہ آہستگی سے بیڈ کی جانب بڑھا تھا، اپنے پیچھے ہونے والی آہٹ سن کر وہ مڑی تھی پھر سرعت سے بیڈ پر دھرا دوپٹہ اٹھا کر اوڑھا تھا، وہ بنا اس کی طرف توجہ دیئے بیڈ پر بیٹھ کر سگریٹ سلگانے لگا تھا اور ہاتھوں کی انگلیاں مروڑتے اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اب کیا کرے، یہاں کھڑی رہے بیٹھ جائے یا باہر چلی جائے، وہ مکمل اجنبی اور بے نیاز بنا بیٹھا تھا اور اسے اپنی پوزیشن آج سے پہلے کبھی اتنا آکورڈ نہیں لگی تھی۔

''ماہین۔'' وہ سر جھکائے کھڑی تھی جب آدھ پیا سگریٹ ایش ٹرے میں مسل کر اس نے اسے پکارا تھا۔

''یہاں آیئے۔'' وہ جھجک کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اس سے ذرا فاصلے پر آ بیٹھی تھی، شاہ ذر نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی تھی۔

''دیکھیں ماہین یہ جو کچھ بھی ہوا جیسے بھی ہوا کم از کم میرے لئے اسے اتنی جلدی ایکسیپٹ کرنا مشکل ہے۔'' بنا کوئی تمہید باندھے اس نے سیدھے سبھاؤ الفاظ چنے تھے وہ بے اختیار سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

''اور نہ ہی اس رشتے سے جڑے تقاضے نبھانا ابھی میرے لئے ممکن ہے، ہو سکتا ہے کچھ وقت گزرے تو میں اس رشتے کو بہتر طریقے سے نبھاہ سکوں مگر فی الحال یہ آساں نہیں ہے، تب تک آپ بھی آزاد ہیں کہ اپنے لئے بہتر سوچنے کے لئے سنجیدگی سے کہتے اس نے اس کے چہرے پر نگاہ کی تھی اور ماہین کمال شاہ نے اپنے آنسو چھپانے کے لئے سرعت سے پلکیں جھکا لی تھیں، تو وہ ایک ان چاہے بوجھ کی طرح اس پر مسلط کی گئی تھی، اس چیز نے اسے ساری رات سونے نہیں دیا تھا۔

صبح اس کی روئی روئی گلابی آنکھوں کو رقیہ بیگم نے غور سے دیکھا تھا اور انہیں ایک اطمینان بھری حرارت اپنے پورے وجود میں دوڑتی محسوس ہوئی تھی، سکون بھری سانس خارج کرتے وہ مسکراتے ہوئے شاہ ذر کو ناشتہ سرو کرنے لگیں تھیں۔

ہم ہی پوچھتے پھیرتے ہیں زمانے بھر سے
جن کی تقدیر بگڑتی ہے وہ کیا کرتے ہیں

اس کی نم آنکھیں ڈوبتے سورج پر تھیں اور سوچیں، نجانے کہاں کہاں بھٹک رہی تھیں، زندگی بعض دفعہ انسان کے سارے اختیارات چھین کر اسے تقدیر کے دروازے پر بھکاری بنا کر کھڑا کر دیتی ہے اور تقدیر کسی مغرور عورت کی طرح دروازہ کھول کر جو اس کی جھولی میں ڈال دے اسے بنا کسی رد و قدر کے قبول کرنا ہوتا ہے، تو زندگی نے اسے بھی ایک ایسے ہی موڑ پر لا کھڑا کیا تھا، وقت کے حاتم نے اس سے بہت کچھ چھین لیا تھا اور وہ کچھ نہیں کر پائی تھیں اور بہت کچھ چھین کر اس نے جو کچھ اسے دان کیا تھا وہ قبول کیے بنا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا، کیونکہ سچ یہی تھا کہ اب یہی گھر اس کا آخری ٹھکانہ تھا۔

☆☆☆

رفتہ رفتہ ہی سہی مگر اس نے سمجھوتے کی راہ پر چلنا شروع کر دیا تھا، اس گھر کو ہی اپنی جائے

عینی نے ایک نظر ڈرائنگ روم پر ڈال کر ہونہہ کہہ کر باہر نکل گئی تھی، ماہین یاسیت سے مسکرا کر رہ گئی تھی۔

ماہین نے شاہ ذر کے کپڑے پریس کر کے ہینگ کیے پھر باہر چلی آئی تھی، شاہ ذر کے کھانے پینے کا اس کے کپڑوں جوتوں کا خیال وہ خود رکھتی تھی اور ایسا کر کے اس جو دلی مسرت ملتی تھی وہ اسے اندر سے سرشار رکھتی تھی، دل کی سرزمین پر محبتوں کے جو پھول کھلنے شروع ہوئے تو محسوسات بھی تبدیل ہونے شروع ہو گئے تھے بس اب تو شاہ ذر کے دل کی سخت ہوئی زمین کو نرم کرنا باقی تھا اور ایسا صرف محبت کے ہتھیار سے ہی ممکن تھا۔

''محبت ایک واحد ایسی شے بنائی ہے قدرت نے جس کے نصیب میں ہار نہیں لکھی گئی ہے کیونکہ محبت کبھی ہارتی نہیں ہے، ہرا دیتی ہے۔'' اسے بہت پہلے کی کہی اپنے باپ کی بات یاد آئی تھی اور اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ ٹھہری تھی۔

اسامہ کو بہت تیز بخار آ رہا تھا شام ہونے والی بارش میں وہ ماہین کے منع کرنے اور ڈانٹنے کے باوجود نہایا تھا اور اب بارش کے ٹھنڈے پانی نے اپنا اثر دکھایا تھا، بخار بہت تیز تھا اور وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا، سکندر ماموں رقیہ مام، شاہ ذر، ماہین سب ہی اس کے اردگرد تھے۔

''آپ لوگوں کو اس نے منع تو کرنا چاہیے تھا، یہ تو بچہ ہے اسے کیا سمجھ، آپ لوگ تو سمجھدار ہیں، ڈاکٹر زوہیب نے آتے ساتھ ہی ڈپٹی آواز میں کہا تھا۔

''بیٹا میں اور تمہارے انکل تو ڈاکٹر بہروز صاحب کی طرف گئے ہوئے تھے اور شاہ ذر آفس میں تھا، ہاں ماہین گھر پہ ہی تھی اسے منع کرنا چاہیے تھا۔'' رقیہ مامی نے آرام سے پہلو بچاتے ہوئے درپردہ سارا الزام اس کے سر ڈالنے کی کوشش کی تھی۔

''میں نے منع کیا تھا مگر اسامہ میری بات سن ہی نہیں رہا تھا۔'' اس نے آہستہ آواز میں صفائی دی تھی۔

''جھوٹ، آپ جھوٹ بول رہی ہیں، آپ نے اسامہ کو ایک بار بھی نہانے سے منع نہیں کیا تھا، آپ اپنے کمرے سے ہی نہیں نکلی تھیں۔'' سات سالہ عینی نے ایک لمحے میں فراٹے سے جھوٹ بولتے اسے سب کے سامنے جھٹلایا تھا، ماہین پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

''عینی؟'' اس نے ششدر ہوتے اسے پکارا تھا۔

''اور پاپا جب آپ اور دادو نہیں ہوتے تو یہ ہمیں ڈراتی ہیں مارتی ہیں اور بری بری باتیں کہتی ہیں، پاپا یہ بہت بری ہیں، کل انہوں نے ہمیں سٹور روم میں بند کر دیا تھا اور کہا تھا کہ پاپا کو بتایا تو بہت ماروں گی۔'' وہ باپ کے پاس کھڑی اس پر الزام لگا رہی تھی، وہ موجود سب لوگ ہی ششدر کھڑے تھے اور اس الزام پر ماہین کے دماغ میں دھماکے سے ہونے لگے تھے۔

☆☆☆

وہ بالکل سپاٹ سا چہرا لئے بیڈ پر بیٹھا تھا، وہ بہت آہستہ قدموں سے چلتی اس کے نزدیک آئی تھی، شاہ ذر نے کٹیلی سی نگاہ اس پر ڈالی تھی اور وہ کٹ کر رہ گئی تھی۔

''یہ سب جھوٹ ہے شاہ ذر۔'' وہ اس کے قدموں میں بیٹھی اسے یقین دلا رہی تھی۔

''بچے جھوٹ نہیں بولتے ماہین کمال شاہ۔'' اس نے یقین نہیں کیا تھا۔

اماں سمجھ کر وہ گھر کے مکینوں کا دل جیتنے کی کوششیں کرنے لگی تھی اور ایسے میں شاہ ذر کی بے رخی، بے اعتنائی وہ باوجود کوشش کے بھی ضبط نہیں کر پائی تھی اور باوجود کوشش کے بھی وہ آنکھوں کو چھلکنے سے روک نہیں پائی تھی، وہ خود کو سمجھاتی، خود سے الجھتی لڑتی اور پھر تھک کر دوبارہ آنسو بہانے بیٹھ جاتی اور ایسے میں دل نے الگ قیامت اٹھا دی تھی اس نے محبت کے نام پر دھڑکنا شروع کر دیا تھا۔

''اسامہ عینی آ جاؤ بیٹا ہوم ورک کر لو۔'' وہ ان کے بیگ کھولے آوازیں دے رہی تھی جو شاہ ذر کو ساتھ بٹھائے زبردستی کارٹون دکھا رہے تھے۔

''جی نہیں ہمیں ہوم ورک پاپا کروائیں گے آپ نے کل بھی میتھ کا سوال غلط کروا دیا تھا، مجھے ٹیچر سے ڈانٹ پڑی۔'' اسامہ نے اس کے ہاتھ سے اپنی نوٹ بک چھینتے ہوئے کہا تھا اور وہ شاہ ذر کے سامنے شرمندہ ہو گئی تھی کچھ شاہ ذر نے بھی عجیب سی نظروں سے دیکھا تھا کیونکہ یہ تو وہ بھی جانتا تھا، اکنامکس میں ماسٹرز کرنے والی ماہین کمال شاہ کو فور کلاس کا میتھ نہ آئے یہ تو ناممکن سی بات ہے۔

''(تو کیا وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں نے جان بوجھ کر اسامہ کو غلط کوئچن کروایا تاکہ اسے ڈانٹ پڑے، لیکن میں نے تو اسے صحیح سوال ہی کروایا تھا پھر اسامہ نے ایسا کیوں کہا؟)'' وہ رات دیر تک خود سے الجھتی رہی تھی۔

''عینی جلدی کرو، پھر میں تمہارے بال بنا دوں۔'' صبح وہاں دونوں کو سکول کے لئے ریڈی کرتے ہوئے ساتھ ساتھ مختلف ہدایات بھی دیتی رہتی تھی، اسامہ میتھ کی نوٹ بک بیگ میں رکھی، اس نے بیگ میں بکس ڈالتے اسامہ سے پوچھا تھا اور اس کے سر ہلانے پر دوبارہ عینی کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔

''عینی اب نکل بھی آؤ بیٹا یو۔'' واش روم کے بند دروازے کو ہلکا سا بجاتے اس نے اسے یاد دلایا تھا۔

''عینی!'' دروازہ جھٹکے سے کھلا تھا اور اس کے باقی کے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے تھے۔

''یو ڈونٹ وری ویٹ می، اوکے اور میں بال پاپا سے بنوا لوں گی۔'' بدتمیزانہ لہجے میں کہتے اس نے اس کے ہاتھ سے برش لیا تھا اور باہر بھاگ گئی تھی، ماہین ہکا بکا کھڑی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

وہ نوراں اور صابرہ کو ساتھ لگائے ڈرائنگ روم کی تفصیلی صفائی کروا رہی تھی، پردے اور کشنز وغیرہ چینج کرنے کے ساتھ اس نے سٹنگ بھی تبدیل کی تھی جو بہت اچھا تاثر چھوڑ رہی تھی، رقیہ مامی بچوں کو ساتھ لئے کمرے میں تھی، سکندر ماموں کہیں باہر گئے ہوئے تھے، شاہ ذر اپنے روم میں فائلز کھولے ان میں الجھا بیٹھا تھا۔

''نوراں یہ والا پیس وہاں کارنر میں رکھو۔'' اس نے کرسٹل کے نازک سے شوپیس نوراں کے ہاتھ میں تھماتے ہدایت کی تھی۔

''جی بی بی۔''

''نوراں!'' عینی نے ڈرائنگ روم کے دروازے سے نوراں کو پکارا تھا، نوراں کے ساتھ ساتھ ماہین نے بھی پلٹ کر دیکھا تھا۔

''پاپا کے لئے چائے بناؤ۔'' شاہ ذر کا حکم سن کر وہ پلٹی تھی جب ماہین نے اسے پکارا تھا۔

''عینی دیکھو میں نے ڈرائنگ روم کی سٹنگ چینج کی ہے، اچھی لگ رہی ہے ناں؟'' مسکراتے ہوئے اس نے پوچھا تھا، بلکہ اسے مخاطب کرنے کی دانستہ کوشش کی تھی۔

"اور آپ کو شرم نہیں آئی معصوم بچوں کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ کرکے آپ کو کوئی بھی مسئلہ تھا آپ مجھ سے کہتی آپ بابا جان سے بات کرتی، کیا میں نے آپکو فورس کیا تھا آپ پر دباؤ ڈالا تھا کہ آپ انہیں دیکھیں انہیں سنبھال لیں یا امی جان اور بابا جان نے ایسا کچھ کہا تھا جو آپ اس طرح کے رویے پر مجبور ہوئی اور ان پر اپنی نفرت نکالتی رہی؟ مجھے بہت افسوس ہوا ہے ماہین میں آپ کو کم از کم ایک ایسی عورت نہیں سمجھتا تھا جو اتنی تنگ دل ہے، آپ نے مجھے بہت مایوس کیا ہے ماہین اور ایک بات یاد رکھیے گا مجھے اس دنیا میں اپنے بچوں سے بڑھ کر کچھ بھی عزیز نہیں ہے۔"

وہ گلاس وال کے سامنے کھڑی تھی اور آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی سیاہ آنکھوں سے گرتے اس کے گندمی چہرے کو بھگوتے جا رہے تھے، وہ کل سے اسی کمرے میں تھی، بنا کھائے پیئے اور ایک بار پھر باہر جھانکے بغیر اور کل سے باہر سے بھی کوئی اس کا پتہ کرنے اندر نہیں آیا تھا، سکندر ماموں جنہوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا مگر ان کی نظریں، ان میں اتنا تاسف، دکھ اور افسوس تھا، وہ چاہنے کے باوجود کچھ بھی نہیں کہہ پائی تھی، رقیہ مامی نے خوب ہی زبان کے تیر برسائے تھے، احسان فراموش بے حس، خود غرض آخر ہے تو بڑی حویلی والوں کا خون اثر تو دکھائے گا اور سب سے بڑھ کر شاہ ذر! اس کے کہے الفاظ، اسے اندر ہی اندر کاٹ رہے تھے، گہری اذیت میں مبتلا کر رہے تھے وہ اسے محبت سے جیتنے چلی تھی یہ تو اسے آج پتہ چلا تھا وہ ابھی تک اسے خود پر اعتبار ہی نہیں دلا سکی تھی۔

☆☆☆

وہ رات کے آدھا گزرنے کے بعد کمرے میں داخل ہوا تو وہ اب بھی وہیں کھڑی تھی اور نمکین پانی اب بھی سابقہ روانی سے اس کی آنکھوں سے بہہ رہا تھا، چوٹ کہیں اندر لگی تھی درد حد سے سوا تھا، وہ چند لمحے اس کی پشت دیکھتا رہا پھر نجانے کیا ہوا، چلتا ہوا اس کے ساتھ کھڑا ہوا تھا، ماہین نے ایک نظر ساتھ کھڑے شخص پر ڈالی تھی پھر اسے نجانے کیا ہوا جو ایک دم سے اس کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی، شاہ ذر کتنی ہی دیر ساکت کھڑا رہ گیا تھا، پھر آہستگی سے اسے خود سے الگ کیا تھا۔

"میں قسم اٹھا کر کہتی ہوں شاہ ذر، عینی نے جو بھی کہا اس میں ایک لفظ بھی سچ نہیں ہے، اس نے جھوٹ بولا ہے اور کیوں بولا ہے میں نہیں جانتی شاہ ذر میرے لئے آپ بہت اہم ہیں شاہ ذر، آپ سے وابستہ ہر چیز بہت اہم ہے پھر ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ میرے لئے اسامہ اور عینی غیر اہم ہوں یا میں ان سے نفرت کرتی ہوں آپ اور آپ سے وابستہ کسی بھی شے، رشتے تعلق سے نفرت کرنا تو ایک طرف میں ایسا سوچنا بھی گناہ سمجھتی ہوں۔" شاہ ذر نے چونک کر اسے دیکھا تھا،

"میں جب یہاں آئی تھی تب بھی اور اب بھی میں یہ بات بہت اچھی طرح جانتی ہوں کہ یہ گھر ہی میرا پہلا اور آخری ٹھکانہ ہے اور میں آپ سب کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے یہاں جگہ دی، عزت دی اور نام دیا، یہ آپ کا احسان ہے اور احسان فراموشی کا سبق مجھے میرے والدین نے کبھی نہیں پڑھایا، میں یہاں اپنی جگہ بنانے اور دل جیتنے آئی تھی دل توڑنے نہیں، میں نے ہمیشہ محبتوں کے سبق پڑھے ہیں اور جس انسان نے ساری زندگی محبتوں کے سبق پڑھے ہوں وہ کسی سے نفرت کیسے کر سکتا ہے شاہ

"اور یہ سب غلط کیا کس نے ہے؟" اس کی ماں نے طنزیہ نظروں سے اس کے خوبصورت چہرے کو دیکھتے پوچھا تھا اور اس کے دل میں بے ساختہ خواہش ابھری تھی کاش اس کی بیٹی بہت خوبصورت نہ ہوتی مگر ایک سمجھدار، ہمدرد اور مخلص عورت ضرور ہوتی۔

"جو گزر گیا ہے اسے مت دوہرائیں جو آنے والا ہے اس کے متعلق سوچیں، پہلی بات اور دوسری بات یہ کے جو کچھ میری وجہ سے غلط ہوا ہے اسے میں خود ہی ٹھیک بھی کرلوں گی یو ڈونٹ وری۔" بے نیازی سے کہتی وہ اٹھ گئی تھی وہ گہری سانس بھر کے رہ گئی تھیں۔

☆☆☆

صبح سے ہی اس کی طبیعت بوجھل ہو رہی تھی سر عجیب بھاری بھاری سا محسوس ہو رہا تھا، تیمور حسن جو کے اس کا بزنس پارٹنر ہی نہیں بہت اچھا دوست بھی تھا، نے اسے گھر جانے اور آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا جو ذرا سی پس و پیش کے بعد اس نے مان بھی لیا تھا، وہ گھر آیا تو خاموشی اور سناٹا اس کے استقبال کو موجود تھے، بچے سکول اور بابا جان اور امی کسی کی عیادت کو گئے ہوئے تھے، نوراں کے بتانے پر سر ہلاتا اپنے روم کی جانب بڑھ گیا تھا، فریش ہو کے وہ بستر پر لیٹا ہی تھا جب ماہین چلی آئی تھی۔

"خیریت آپ آج اتنی جلدی واپس آ گئے؟" دھیمی سی آواز میں اس نے پوچھا تھا۔

"سر میں درد ہے۔" خشک سی آواز میں جواب آیا تھا وہ خاموشی سے پلٹی تھی اور واپس آئی تو چائے کا کپ اور پین کلر کے ساتھ، وہ ٹیبلٹ لے کر چائے پی جب دوبارہ لیٹا آنکھیں موندی تو اس نے بنا کچھ کہے سنے نرمی سے اس کا سر دبانا شروع کر دیا تھا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔" شاہ ذر نے کہا تھا مگر ماہین نے سر دبانا موقوف نہیں کیا تھا وہ خاموشی سے اس کا سر دباتی رہی تھی اور نجانے کیوں شاہ ذر کو اپنے اندر کی تپش ٹھنڈی ہوتی محسوس ہوئی تھی۔

☆☆☆

"ماہین!" وہ بالکنی میں کھڑی تھی جب شاہ ذر نے سنجیدہ سی آواز میں پکارا تھا۔

"جی!" اس نے سرعت سے آنسو پونچھتے کہا تھا وہ اس کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی، مگر وہ دیکھ چکا تھا۔

"آپ رو رہی ہیں، کیوں؟" حیرت کی بات تھی اسے ابھی بھی کیوں کا مطلب چاہیے تھا۔

"بابا یاد آ رہے تھے۔" اس نے سر جھکا کر جواب دیا تھا۔

"تو آپ بات کرلیں ان سے۔" اس کی بھیگی پلکوں کو دیکھتے اس نے مشورہ دیا تھا اور واپس مڑا تھا، اب اس نے پکار لیا تھا وہ رکا تھا، پلٹا نہیں تھا۔

"آپ کو کوئی کام تھا؟"

"مجھے نہیں بابا جان کو تھا وہ آپ کو یاد کر رہے ہیں۔"

دن اب بھی ویسے ہی گزر گئے تھے، روکھے پھیکے، اداس دن ویران شامیں، عذاب راتیں، رقیہ مامی کے طنزیہ فقرے چبھتی نظریں، بچوں کا لیا دیا اور کھنچا کھنچا سا رویہ، ہاں مگر ایک جو امید کی ہلکی سی کرن تھی تو وہ شاہ ذر کے رویے میں در آئی نرمی، جس نے اسے ہمت اور حوصلہ دیا تھا، نئے سرے سے سب کے دل جیتنے کا حوصلہ اور مشکل وقت کو صبر سے گزارنے کی ہمت۔

تیمور حسن نے شاہ ذر اور ماہین کو ڈنر پر

ذر؟ عینی اور اسامہ مجھے اولاد کی طرح عزیز ہیں اور کوئی ماں اپنی اولاد کے ساتھ ایسا رویہ نہیں رکھ سکتی، مجھے نہیں معلوم ایسا کیا ہوا ہے جس کی بنا پر وہ اچانک مجھ سے اتنی نفرت کرنے لگے ہیں مگر یقین مانیے شاہ ذر میں ان کے ساتھ ایسا کرنے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی۔" وہ روتے ہوئے بولتی اسے اپنی بے گناہی کا یقین دلا رہی تھی، وہ خاموش تھا وہ تب بھی خاموش تھا وہ اب بھی خاموش تھا، پھر اسی خاموشی کے ساتھ باہر نکل گیا تھا، ہاں البتہ کچھ دیر بعد اس نے نوراں کے ہاتھ اس کے لئے کھانا ضرور بھجوا دیا تھا۔

اس کے سلام کرنے پر رقیہ مامی نے تو منہ دوسری طرف کر لیا تھا، سکندر شاہ نے مسکراتے ہوئے دعا دی تھی۔

"جاؤ بیٹا دیکھو عینی اور اسامہ جاگ گئے؟" سکندر ماموں نے کہا تو وہ سر ہلاتی ان کے کمرے کی طرف بڑھنے لگی تھی جب رقیہ مامی کی سخت یہی آواز نے اس کے قدم روک دیے تھے۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے کسی کو ان کی فکر کرنے کی، نوراں گئی ہے انہیں لینے۔" وہ کٹ کر رہ گئی تھی۔

"مم...... میں دیکھتی ہوں نوراں نے چائے تیار کر لی۔" آنکھوں میں آئے نمکین پانی کو پیچھے دھکیلتے وہ کچن کی جانب بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

زندگی پتہ نہیں بذات خود ایک مشکل سوال ہے یا کچھ لوگ اسے ہمارے لئے مشکل اور نا سمجھ میں آنے والے سوال میں تبدیل کر دیتے ہیں یہ فیصلہ کرنا ذرا مشکل ہوتا ہے، اس کے لئے بھی تھا، زندگی میں بہت کچھ ان چاہا ہونے کے باوجود ہم برداشت کر لیتے ہیں، ضبط کر جاتے ہیں مگر یہ احساس کے خود ہمارا اپنا وجود ہی ان چاہا ہے نا قابل برداشت اور بہت تکلیف دہ ہوتا ہے اس کے لئے بھی تھا، خود سے وابستہ لوگوں کی آنکھوں میں اپنے لئے ناپسندیدگی دیکھنا آسان نہیں ہوتا اس کے لئے بھی نہیں تھا زندگی اب سے پہلے اتنی مشکل کبھی نہیں لگی تھی۔

شام اپنے پورے جوبن پر تھی اور وہ اسی خوبصورت سی شام کے سائے تلے کھڑی اداس اور مغموم سی نظر آ رہی تھی، اداسی جو اس کی آنکھوں سے جھانکتی تھی اور اس کے وجود سے چھلکتی تھی، وہ گہری سی سانس بھر کے مڑی تھی جب نظر بال سے کھیلتی عینی پر پڑی تھی اور وہ بے اختیار اسے پکار بیٹھی تھی، عینی ایک نظر اس پر ڈال کر دوبارہ سے کھیل میں مشغول ہو گئی تھی۔

"تم نے اپنے پاپا سے اور سب سے جھوٹ کیوں بولا عینی؟" دو قدم آگے آتے اس نے دکھ سے پوچھا تھا۔

"میری مرضی۔" کہہ کر وہ بھاگ گئی تھی۔

"عینی بات تو سنو پلیز۔" وہ اسے روکنے کے لئے اس کے پیچھے بھاگی تھی اور سامنے سے آتے شاہ ذر سے ٹکرا گئی تھی، شاہ ذر نے گہری سی نظر اس پر ڈالی تھی وہ خائف سی ہوتی پلٹ گئی تھی۔

☆☆☆

فون بند کر کے اس نے ایک جتاتی سی نظر ماں پر ڈالی تھی اس کی ماں نے تاسف سے سر ہلایا تھا۔

"تم صحیح نہیں کر رہی۔" اس کے چمکتے چہرے کو دیکھتے اس کی ماں نے کہا تھا۔

"میں جو غلط ہو چکا ہے اسے صحیح کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔" اس نے لاپروائی سے کہتے پانی کا گلاس اٹھایا تھا اور گھونٹ گھونٹ پینے لگی تھی۔

انوائٹ کیا تھا، سکندر ماموں نے اسے جانے کی زبردست طریقے سے تاکید کی تھی۔

"مگر ماموں میرے پاس تو ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں۔" ان کے اصرار پر اسے زبان کھولنا پڑی تھی۔

"تو بیٹا شاہ ذر کے ساتھ جا کر خرید لاؤ۔" انہوں نے جھٹ سے اس کی پریشانی دور کی تھی، رقیہ مامی کی آنکھوں میں واضح ناگواری نظر آئی تھی۔

"شاہ ذر تم فری ہو ناں؟" سکندر ماموں نے پوچھا تھا اس نے کندھے اچکا کر گردن ہلائی تھی۔

"تو ٹھیک ہے پھر ماہین کو لے جاؤ اور ضرورت کی اشیاء دلوا دو۔" بابا جان کے حکم پر اس نے سر ہلایا تھا اور رقیہ مامی کی آنکھوں میں اب ناگواری کی جگہ حیرانی لے چکی تھی۔

☆☆☆

وہ دونوں مشہور ڈائیزر کی آؤٹ لیٹ پر موجود تھے، ڈھیروں رنگ برنگ ملبوسات اس کے سامنے تھے اور اسے پسند کرنے میں دشواری کا سامنا تھا، شاہ ذر دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں گھسائے بے نیاز کھڑا تھا، وہ گلابی رنگ کا لباس خود سے لگائے کھڑی تھی جب اس نے ذرا فاصلے پر کھڑے شاہ ذر کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تھا۔

"بہت اچھا لگ رہا ہے یہ رنگ تم پر۔" یکا یک ملنے والی توجہ اور اس کے الفاظ دونوں ہی اسے اپنی جگہ ششدر کر گئے تھے، سیاہ آنکھوں میں ڈھیروں حیرت بسائے وہ اسے دیکھ رہی تھی جواب خود مختلف لباس اٹھا کر چیک کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ اس سے بھی رائے لی جا رہی تھی مگر اس کی حیرت زیادہ دیر قائم نہیں رہ پائی تھی کسی کی سخت نظروں کی تپش محسوس کر کے وہ مڑی تھی سیاہ لباس پہنے سرخ چہرے کے ساتھ رخسار اسے گھور رہی تھی۔

شام کو سفید لباس اونچی پونی، سیاہ کاجل اور ہلکی سی لپ اسٹک اس کی تیاری مکمل تھی، کانوں میں وائٹ گولڈ کے ٹاپس پہن کر اس نے ناقدانہ نگاہ آئینے پر ڈالی تھی۔

"بہت اچھی لگ رہی ہو۔" جواب آئینے کے بجائے پشت سے آیا تھا، اس نے پلٹ کر دیکھا دونوں بازو سینے پر باندھے کھڑا شخص نگاہوں میں پسندیدگی اور چہرے پر نرمی لئے کھڑا تھا۔

(تو کیا اس کی محبت نے اثر کرنا شروع کر دیا تھا) "یقین نہیں آ رہا کیا؟" دو قدم آگے آتے استفسار کیا گیا تھا۔

"پہلے نہیں تھا اب آ گیا ہے۔" وہ ہولے سے مسکرائی تھی۔

"چلیں۔" اس نے پوچھا تھا وہ سر ہلاتی آگے بڑھی تھی۔

☆☆☆

وہ لان میں کھیلتے اسامہ اور عینی کو دیکھ رہی تھی، چائے کا کپ ہاتھ میں لئے گھونٹ گھونٹ پیتے، وہ شام اور تنہائی دونوں کو انجوائے کر رہی تھی۔

"ماہین!" اسے نیچے سے شاہ ذر کی آواز آئی تھی، وہ پلٹی اور بھاگتے ہوئے سیڑھیاں عبور کی تھیں آج پہلی بار تھا جب شاہ ذر نے اسے پکارا تھا، اس کا نام لیا تھا۔

"جی!" اگلے ہی پل وہ اس کے سامنے کھڑی تھی، وہ اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔

"ایک کپ کافی مل سکتی ہے؟"

"میں ابھی بنا کر لاتی ہوں۔" وہ کچن کی

جانب بڑھی تھی اور کمرے سے نکلتی رقیہ مامی ششدر سی کھڑی تھیں۔

☆☆☆

''مجھے یہ ناشتہ نہیں کرنا۔'' عینی نے پلیٹ پرے کرتے ہوئے منہ بنایا تھا۔

''کیوں بیٹا؟'' شاہ ذر نے حیرت سے اسے دیکھا تھا، فرنچ ٹوسٹ اس کے فیورٹ تھے۔

''یہ ماہین نے بنائے ہیں اور مجھے ان کے ہاتھ کا بنا ناشتہ نہیں کھانا۔'' نروٹھے پن سے کہتے اس نے خفا سی نظر چائے نکالتی ماہین پر ڈالی تھی۔

''مجھے بھی نہیں کھانا۔'' اسامہ کیوں پیچھے رہتا۔

''عینی، اسامہ یہ کیا بدتمیزی ہے، آرام سے ناشتہ کرو۔'' شاہ ذر نے سخت سے لہجے میں ڈپٹا تھا۔

''شاہ ذر کیوں ڈانٹ رہے ہو بچوں کو۔''

''وہ غلط ہیں اس لئے ڈانٹ رہا ہوں امی۔''

''وہ غلط نہیں ہیں شاہ ذر۔'' انہوں نے خفگی سے کہا تھا۔

''وہ غلط ہیں امی اور آپ پلیز ان کی بے جا طرف داری مت کیا کریں، بہت بگڑ گئے ہیں دونوں اور تم دونوں میری بات غور سے سنو، آج کے بعد تم دونوں نے اگر ماہین سے بدتمیزی کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا اور چلو اب سیدھی طرح سے ناشتہ کرو۔'' سخت سے لہجے میں اس نے ان دونوں کو باور کرا کے کہا تھا، وہ چپ چاپ ناشتہ کرنے لگے تھے جبکہ رقیہ بیگم نے بہت غور سے پہلے شاہ ذر کو اور پھر ماہین کو دیکھا تھا۔

☆☆☆

سکندر شاہ کے بہت اچھے دوست انتقال کر گئے تھے، سکندر شاہ اور شاہ ذر دونوں ہی ان کے جنازے میں شرکت کے لئے کراچی گئے ہوئے تھے، بچے سکول میں تھے گھر میں رقیہ اور ماہین ہی تھیں کہ اچانک رقیہ کی طبیعت خراب ہوگئی، ماہین بے طرح گھبرا گئی تھی، اس نے باری باری سکندر شاہ اور شاہ ذر کو نمبر ملایا تھا، دونوں کے ہی فون بند جا رہے تھے، ادھر رقیہ مامی کی حالت لحہ لحہ بگڑتی جا رہی تھی، نوراں کے مشورے پر اس نے ناچار تیمور حسن کو کال ملائی تھی، رقیہ مامی کی طبیعت کا سنتے ہی وہ اگلے دس منٹ میں حاضر تھا، تیمور کی گاڑی میں ہی وہ رقیہ مامی کو ہسپتال لائے تھے، ماہین روتے ہوئے ان کے لئے دعا گو تھی، وہ آنکھیں بن کیے مسلسل خدا سے ان کی صحت و زندگی مانگ رہی تھی۔

''حوصلہ رکھیے ماہین، انشا اللہ آنٹی بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔'' تیمور نے اس کے قریب بینچ پر بیٹھتے ہوئے اسے تسلی دی تھی، وہ سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

رقیہ مامی کو انجائنا کا ہلکا سا اٹیک ہوا تھا، شام تک ڈاکٹرز نے انہیں گھر بھیج دیا تھا، تیمور ہی انہیں واپس گھر لایا تھا۔

''ہماری وجہ سے آپ کو اتنی زحمت اٹھانا پڑی۔'' ماہین کی شرمندہ سی آواز پر تیمور مسکرایا تھا۔

''ایسا بالکل بھی نہیں ہے، آنٹی صرف شاہ ذر کی ہی نہیں میری بھی ماں ہیں۔'' وہ رقیہ مامی کی طرف دیکھ کر بولا تھا جواباً وہ ہولے سے مسکرائی تھیں۔

''اوکے اب میں چلتا ہوں صبح انشا اللہ چکر لگاؤں گا، خدا حافظ۔''

''اللہ حافظ۔'' ماہین نے کہا تھا۔

اس نے سکندر شاہ اور شاہ ذر کو رقیہ مامی کی

طبیعت کے حوالے سے کچھ نہیں بتایا تھا اور اسے ایسا کرنے کو رقیہ مامی نے ہی کہا تھا۔

''وہ دونوں خواہ مخواہ پریشان ہو جائیں گے۔'' وہ صبح انہیں ناشتہ کروا کے نکلی تھی جب تیمور ان کی طبیعت کا پوچھنے چلا آیا تھا۔

''کیسی طبیعت ہے آنٹی۔'' وہ ان کے قریب بیٹھا پوچھ رہا تھا، جواباً وہ اسے اپنی خیریت کا بتانے لگی تھیں، کچھ دیر بعد وہ باہر نکلا تھا۔

''ارے یہ کیا تیمور بھائی میں چائے لا رہی تھی۔''

''سوری بہنا چائے ادھار رہی کیونکہ فی الحال میں خاصا لیٹ ہو چکا ہوں۔'' اس کے بے چارگی سے کہنے پر وہ سر ہلا کر رہ گئی تھی۔

☆☆☆

سکندر شاہ اور شاہ ذر کو کراچی میں تین دن لگ گئے تھے اور تینوں دن تیمور ہر روز صبح و شام ان لوگوں کی خبر گیری کے لئے آتا رہا تھا، ماہین کو وہ بالکل بہنوں کی طرح ٹریٹ کرتا تھا تو ماہین کو بھی اس میں احمد بھائی کا عکس نظر آتا تھا، بچوں کی بھی اس سے خوب بنتی تھی، ابھی بھی وہ دونوں اس کا سر کھا رہے تھے جب ٹیوٹر کے آنے پر انہیں ناچار اٹھنا پڑا تھا، ان کے جانے کے بعد تیمور بھی اٹھنے لگا تھا جب ماہین نے روک لیا تھا۔

''چائے آ رہی ہے بھیا۔'' رقیہ مامی آرام کر رہی تھیں، وہ سر ہلا کر بیٹھ گیا تھا نوراں چائے لے آئی تھی، تیمور کو چائے دینے کے بعد اس نے ماہین کی طرف کپ بڑھایا تھا جب نجانے کیسے کپ اس کے ہاتھ سے چھلکا اور گرم چائے ماہین کا ہاتھ جلا گئی تھی۔

''او...... سی۔'' اس کے لبوں سے بے ساختہ نکلا تھا۔

''ماہین آر یو اوکے؟'' تیمور اپنا کپ رکھ کر قریب چلا آیا تھا، نوراں فوراً برنال لینے بھاگی تھی، تکلیف کی شدت ماہین کی آنکھوں میں آنسو لے آئی تھی۔

''ماہین۔'' تیمور نے ہمت دلاتے لہجے میں پکارا تھا اور جب رقیہ مامی اٹھ کر دروازہ پر آئی تو ماہین کا ہاتھ تیمور کے ہاتھ میں اور تیمور کا ہاتھ ماہین کے کندھے پر تھا۔

الزام رکیک بھی تھا شدید بھی تھا، جو انہوں نے اس پر لگایا تھا، الزام بھی خود لگایا تھا انہوں نے عدالت بھی خود ہی لگائے بیٹھی تھیں، سکندر شاہ سر جھکائے اور شاہ ذر سرخ چہرے کے ساتھ سن رہا تھا اور جس پر الزام لگا تھا وہ سن ہوتے حواس کے ساتھ شاک کے عالم میں کھڑی تھی، وہ اتنی گنگ تھی کے اپنی صفائی میں اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکل رہا تھا، اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس پر اس کے کردار پر اتنا بڑا الزام بھی لگ سکتا ہے اور وہ بھی اس ہستی کی جانب سے جسے وہ ماں کی طرح اپنی ماں کی طرح سمجھتی تھی مگر انہوں نے ثابت کر دیا تھا نہ وہ اس کی ماں ہیں، نہ وہ اسے بیٹی سمجھتی ہیں۔

''کچھ تو شرم کی ہوتی کچھ تو حیا کی ہوتی، ارے احسان فراموش، بے غیرت، بد کردار عورت، ہم تیری عزت ڈھانپتے رہے اور تو ہماری عزت ہی خاک میں ملانے کے در پے ہو گی، وہ تو چلو مرد تھا غیر تھا، تو تو اپنا خون تھا، باپ جیسے ماموں اور شوہر کی عزت رولتے تجھے ذرا خوف نہ آیا مگر کیسے آتا تھی جو گھٹیا خاندان کا خود غرض خون، میں کہتی ہوں شاہ ذر ابھی کے ابھی نکال اسے اس گھر سے، یہ اس قابل نہیں ہے کہ اسے عزت سے گھر میں رکھی جائے۔'' ان کے مطالبے نے اسے زلزلوں کی زد میں لا کھڑا کیا تھا، سفید پڑتے چہرے کے ساتھ وہ شاہ ذر کو

دیکھنے لگی تھی، ایک بار پھر دربدری ایک بار پھر بے سائبانی، آخر اس کی سزا ختم کیوں نہیں ہوتی؟ اسے نہیں معلوم تھا شاہ ذر کیا کہنے والا ہے اس کا فیصلہ کیا ہے مگر شاہ ذر کے منہ سے نکلے چند الفاظ کے ساتھ اس کی زندگی اور موت کا فیصلہ ہونا تھا۔

”تو سن رہا ہے ناں شاہ ذر نکال اسے اس گھر سے۔“ وہ ایک بار پھر چیخی تھیں۔

”بس کر دیں امی، بس اب بس کر دیں۔“ شاہ ذر کے منہ سے نکلے چند الفاظ نے سب کو ساکت کر دیا تھا۔

☆☆☆

”گھر عورت کی خوبصورتی سے یا مرد کی دولت سے نہیں بنتے، گھر عورت کی وفا اور مرد کی محبت سے بنتے ہیں، عورت کے صبر اور مرد کی طرف سے دیے جانے اعتماد اور کیے جانے والے اعتبار سے مضبوط ہوتے ہیں۔“ شاہ ذر کے الفاظ پر وہ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگیں تھیں۔

”یہ عورت جو آپ کے سامنے کھڑی ہے یہ سب کچھ ہو سکتی ہے بے حیا، بے غیرت اور بد کردار نہیں ہے اور یہ بات میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں، مرد کی نظر بہت جلد عورت کو پرکھ لیتی ہے اور میں اپنی بیوی کو بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں۔“ اس کے منہ سے نکلا ہر الفاظ وہاں وجود ہو شخص کو حیران تر کر رہا تھا۔

”اور جہاں تک بات ہے رخسار کی تو امی، وہ بہت پہلے میرے دل سے نکل گئی تھی اور اب تو گھر سے نکلے بھی عرصہ بیت گیا ہے میری زندگی میں ماہین رہے نا رہے مگر رخسار کبھی واپس نہیں آ سکتی اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں اور اسے بھی سمجھا دیں کہ یوں سازشیں کرنے سے، کسی دوسرے پر بہتان لگانے سے نہ وہ اپنی کھوئی جگہ پا سکتی ہے نہ آپ اسے وہ جگہ دلا سکتی ہیں، آپ نے بچوں کو ورغلایا ان کے دل میں ماہین کے خلاف زہر بھرا، میں خاموش رہا، حالانکہ میں بہت پہلے ہی سمجھ گیا تھا مگر میں آپ کے احترام کی وجہ سے اور اس لئے چپ تھا کہ ایک نہ ایک دن آپ کو احساس ہو جائے گا، آپ میرے اور ماہین کے مابین فاصلوں پر خوش ہوتی رہی اور جب آپ کو لگا ہم ایک دوسرے کے قریب آ رہے ہیں آپ نے ماہین پر اتنا بڑا الزام لگا دیا، بہتان باندھا کہ کہیں وہ میرے دل میں اپنی جگہ نہ بنا لے، مگر میں آپ کو بتاؤں امی اس نے میرے دل میں جگہ نہیں بنائی پورا کا پورا دل ہی اپنے نام کر لیا ہے، میرے پورے کے پورے دل پر اس کا قبضہ ہے میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں اور اب کوئی بھی اس محبت کو میرے دل سے کبھی بھی نہیں نکال سکتا۔“

وہ دونوں بازو گھٹنوں کے گرد باندھے بیڈ پر بیٹھی تھی اور آنسو قطار در قطار اس کی آنکھوں سے بہے جا رہے تھے، وہ خاموشی سے اندر داخل ہوا تھا اور آہستگی سے چلتا ہوا بیڈ پر بیٹھا تھا، ایک گہری سی سانس لے کر اس نے خود کو کمپوز کیا تھا۔

”شاہ ذر میں قسم اٹھا کر کہتی ہوں کے مامی جی نے جو الزام مجھ پر لگایا وہ سراسر جھوٹ ہے۔“ اس نے تڑپ کر سر اٹھاتے کہا تھا شاہ ذر نے بہت نرمی سے اس کے لبوں پر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔

”تمہیں کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہے ماہین، مجھے معلوم ہے کہ میری بیوی ایک مضبوط کردار کی وفادار عورت ہے۔“ بہت آہستگی سے اپنی گلابی پوروں سے اس کے آنسو صاف کرتے اس نے یقین دلاتے لہجے میں کہا تھا وہ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی تھی۔

”اور آئی ایم سوری فار ایوری تھنگ۔“ اس کی اگلی بات پر اس کے آنسو ایک بار پھر شدت

اختیار کر گئے تھے۔

”اونہوں، پلیز نہیں تمہیں نہیں پتہ تمہارے آنسو تمہارے بابا کے ساتھ ساتھ مجھے بھی تکلیف دیتے ہیں۔“ وہ حیران نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

”اصل میں ہمیں جن سے محبت ہوتی ہے ان کے آنسو واقعی ہمیں تکلیف دیتے ہیں۔“ اس کی حیرت کچھ اور بڑھی تھی وہ اس کی روئی روئی حیران آنکھوں میں دیکھ کر مسکرایا تھا۔

”آئی لو یو ماہین آئی ریئلی لو یو۔“ بہت محبت سے اس کے گرد بازوؤں کا حصار باندھتے اس نے وہ الفاظ کہے تھے جنہیں سننے کی آرزو نجانے کب سے اس کے من مندر میں چھپی بیٹھی تھی، وہ ایک بار پھر سے رو پڑی تھی مگر اب کے آنسوؤں کا رنگ اور تھا۔

☆☆☆

وہ نجانے کتنی ہی دیر سے یونہی بیٹھیں تھیں اور سوچیں نجانے کہاں کہاں سے آ گے ان پر حملہ آور ہو رہی تھیں دکھ، پچھتاوا شرمندگی، کون سا احساس تھا جو ان کے دل میں سر نہیں اٹھا رہا تھا، انہیں ہمیشہ لگا تھا کہ وہ صحیح ہیں وہ جو کر رہی ہیں وہ درست ہے یہ تو آج انہیں پتہ چلا تھا وہ جو کچھ کر رہی تھیں وہ غلط ہی نہیں تھا وہ گناہ کے زمرے میں بھی آتا تھا، ماہین سے انہیں کوئی ذاتی پرخاش نہیں تھی، وہ تو رخسار کے آنسوؤں اور التجاؤں کے سامنے ہار گئیں تھیں یا پھر دل میں موجود بھانجی کی محبت سے وہ چاہتی تھی کہ ماہین جو رخسار کی جگہ لے چکی ہے وہ جگہ واپس رخسار کو مل جائے اور اس چاہ نے ان سے کیا کیا کروایا تھا، انہوں نے عینی اور اسامہ کو ورغلایا ان نے معصوم ذہنوں میں زہر بھرا، کہ کہیں ماہین وہ اپنی ماں کی جگہ نہ دینے لگیں ان کی ہمیشہ کوشش رہی کہ ماہین کبھی بھی شاہ ذر کے دل میں اپنی جگہ نہ بنا سکے اور اس کے لئے وہ اس انتہا پر بھی چلی گئی کہ ماہین کے کردار پر انگلی اٹھا دی تھی۔

وہ جانتی تھیں ماہین بے قصور ہے مگر وہ چاہتی تھی کے شاہ ذر اسے اپنی زندگی سے نکال دے، مگر وہ غلط تھیں، ان کے اپنے بیٹے نے ہی انہیں آئینہ دکھا دیا تھا اور اس آئینے میں نظر آتی اپنی شبیہ اتنی بھیانک تھی کہ وہ خود ہی نظریں ملا پا رہی تھیں، وہ اتنی بری کیسے ہو سکتیں ہیں؟ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا، وہ غلط تھیں انہیں احساس ہو چکا تھا، بس اب غلطیوں کا مداوا باقی تھا جو انہیں کرنا تھا انہیں معافی مانگنی تھی ان سب سے جن کی وہ مجرم تھیں جن کا انہوں نے دل دکھایا تھا اور انہیں یقین تھا وہ سب انہیں معاف کر دیں گے آخر کو وہ ان کے اپنے تھے۔

☆☆☆

تیتیسویں قسط کا خلاصہ

اسلامی تعلیمات و قرآن کا مطالعہ غور و خوض درس قرآن اٹینڈ کرتی ماریا گزشتہ صدی ربع کے دوران اسلام قبول کرنے والے نومسلموں کے مقالہ جات پڑھتی ساتھ اکثر نومسلم افراد سے ملتی اور ان کے خیالات سنتی ہے۔

اور اس ساری جستجو و تحقیق تلاش کے بعد بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہنچتی ہے، کہ اسلام قبول کر لے سو وہ ماریا جوزف سے عائشہ ادریس تک کا سفر کر لیتی ہے۔

اریبہ مقبول عام ہونے کے بعد ایک انٹرویو میں وہاج سے اپنا رشتہ و تعلقات ظاہر کرتی ہے تو یہ بات وہاج کی فیملی کے لئے تباہی و تنزلی کا شاخسانہ بنتی ہے اور وہاج اریبہ سے مجبوراً استدعا کرتا ہے کہ وہ اپنے الفاظ واپس لے اور اپنے الفاظ کی تردید کر دے۔

شہریار، سعیہ کو چھوڑنے کا فیصلہ سناتا ہے تو سعیہ سارا غرور، طنطنہ انا بھلا کے اپنی محبت کا اقرار کر کے شہریار کو خوشگوار و استعجاب میں مبتلا کر دیتی ہے۔

چوتیسویں اور آخری قسط

اب آپ آگے پڑھیے

"کیسا محسوس ہوتا ہے، اپنی موجودہ زندگی اور گزرے وقت کے شب و روز کو دیکھ کر، کیا اسلام قبول کر چکنے کے بعد تم سمجھتی ہو کہ تم نے جو کیا ٹھیک ہے؟" شام ڈھلے جب فاطمہ اور وہ چھت کو جاتی سیڑھیوں پر بیٹھی تھیں تو فاطمہ نے اچانک پوچھا، عائشہ اس کا سوال سن کر چند ثانیے مسکرائی پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔

"انگلینڈ، امریکہ، یا نیوزی لینڈ کے اس ماحول میں جہاں مادیت کا دور دورہ ہے، عیش پرستی اور تفریح پسندی کو ہی زندگی کی معراج سمجھا جاتا ہے وہاں اسلام قبول کرنا اور اس کی تعلیمات پر عمل کرنا بے حد مشکل کام ہے وہاں یہ فیصلہ کرنے سے پہلے میں ہزار بار سوچتی جیسے عیسائیت اور چرچ کو خیرباد کہتے ہوئے سوچا تھا کہ میرے والدین مجھ سے کیا سلوک کریں گے؟ میری تعلیم کا کیا بنے گا؟ اور میں اپنے حلقہ احباب میں کیسے زندہ ہوں گی۔"

اس نوعیت کے خدشات اور دشواریوں کو میں بھگت چکی تھی سو اب یہ چیزیں مجھے پریشان نہیں کر سکتیں پھر ایک طویل اور گہرے غور و خوض کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ وقتی اور عارضی پریشانی کے مقابلے میں جو اسلام قبول کرنے کے نتیجے میں پیش آ سکتی تھی، مسلمان نہ ہونے کے نتائج ذہنی اور روحانی اعتبار سے زیادہ گمبھیر ہو سکتے ہیں، چنانچہ میں نے خوب دعائیں کیں اس سے مدد اور اعانت طلب کی، وہ جو کہتا ہے کہ "جو لوگ ہمارے راستے کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں ہم ان کو اپنی راہوں کی رہنمائی کر دیا کرتے ہیں۔ (العنکبوت۔69)

"اور واقعی اللہ نے میری دعائیں سن لیں اور حیرت انگیز طور پر مجھے وہ ہمت اور حوصلہ عطا ہوا کہ میں اتنا بڑا فیصلہ کرنے کے قابل ہو گئی۔" اس کی آنکھیں تشکر اور سکون و خوشی کے آنسوؤں سے بھری تھیں۔

"اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی اطاعت نے میرے باطن کو سکون اور تزکیہ نفس سے مالا مال کیا ہے اور اللہ کا احسان ہے کہ اسلام کی تعلیمات پر عمل نے میری زندگی کے ہر پہلو کو مثبت طور پہ تبدیل کیا ہے اور یہ واضح اور انقلابی نوعیت کی تبدیلیاں ہیں، لباس کی تبدیلی اور حجاب نے میرے عام طرز زندگی کو یکسر نیا رنگ دے ڈالا ہے اور نیم برہنگی کے خوف اور سراسیمگی کی کیفیت سے تحفظ حاصل کیا ہے مجھے یقین ہے کہ میں نے مسلمان ہونے کا فیصلہ خوب سوچ سمجھ کر کیا ہے اور انشاء اللہ اس پر عمر بھر ثابت قدم رہوں گی اور مجھے اس کا بھی سکون ہے کہ اس سلسلے میں جو اللہ نے حکم دیئے ہیں میں اس کی پیروی کر رہی ہوں میرے لئے یہ نعمت کم نہیں ہے کہ اسلام کو میں نے قبول نہیں کیا بلکہ اپنے اندر دریافت کیا ہے اور یہ مقررہ وقت پر اللہ کے فضل و کرم سے بغیر کسی دیر کے بہت جلد مجھے نصیب ہو گیا اور اللہ کا شکر ہے میں مسلمان ہوں۔"

"اللہ کا فرمان ہے کہ ہر انسان دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور دین فطرت صرف اسلام ہے سو میں بھی اسلام پر تھی ہاں راستہ بھٹکی روح کے مانند، راستہ ملا تو منزل تک آ پہنچی، راہ میں پڑاؤ ملے تو تھے مگر منزل تو اسلام تھی سو اسلام نصیب ہوا۔"

"تم اسلام قبول کر چکی ہو عائشہ، زندگی کا اچھا برا دیکھ اور جھیل چکی ہو، اب میرا خیال ہے تم ایک کام اور کر لو۔" فاطمہ سنجیدگی سے بولی۔

"تم شادی کر لو کیونکہ اسلام عورت جب جوان عاقلہ بالغہ ہو تو جلد سے جلد اس کے نکاح کا حکم دیتا ہے تاکہ وہ کسی فتنے یا برائی سے محفوظ رہ سکے اور تم چھبیس ستائیس سال کی تو ہو تو ہو سکے یہ کام پہلے انجام دو۔" فاطمہ اب رسان سے بولی تو عائشہ نے کچھ کہے بغیر اسے دیکھا تھا۔

"تمہیں کوئی پسند ہے تب بھی اگر نہیں تو ہم کوشش کریں۔" اب فاطمہ کی ماں نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں، ماں باپ، دوست اور اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا خواب دیکھنے والا مائیکل اسے بہت کچھ یاد آیا، گزشتہ آٹھ دس سالوں میں وہ محبت کے اس ادھ کھلے پھول کی خوشبو کبھی بھلا نہ پائی تھی مگر اب جبکہ وہ صحیح العقیدہ مسلمان تھی تو ایک غیر مذہب کے غیر محرم شخص کے متعلق سوچنا ویسے گناہ تھا مگر پھر بھی ایک انجانے احساس کا بوجھ تھا دل پر جو چہرہ گیلا کیے دے رہا تھا۔

"کیا ہوا بیٹی میری بات بری لگی۔" فاطمہ کی والدہ بے طرح پریشان ہو کر بولیں۔

"نہیں ماں جی بخدا آپ کو غلط کہنے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی، آپ سے تو مجھے سگے رشتوں سے بڑھ کر محبت و خلوص ملا ہے آپ کا حکم ٹالنے کا میں سوچ بھی نہیں سکتی، آپ جہاں مناسب سمجھیں کر دیں شادی۔" اس نے ٹوٹی اردو میں کہا اور آنسو پونچھے، وہ اسے دعائیں دیتی باہر نکلیں اور دو دن بعد ہی وہ اسے ایک شخص کے بارے میں بتا رہی تھیں جو نو مسلم تھا عیسائیت سے تائب ہو کر اس نے کچھ عرصہ قبل اسلام قبول کیا تھا اور وہ بھی فاطمہ کے ابو کی سرپرستی میں تھا انہی کے زیر سایہ اپنے تمام عوامل، مناقب انجام دے رہا تھا، وہ اس کے کردار، ایمان اور خلوص کی قائل تھیں ان کا مشورہ تھا کہ عائشہ اگر مناسب سمجھے تو خود بھی اس شخص سے مل کر اپنی تسلی و تشفی کر سکتی ہے مگر اس نے اپنے تمام اختیارات جب اس فیملی کو سونپ دیے تھے، تو اس کے لئے ان کی اپنی تسلی اور رائے ہی سب سے بڑھ کر معتبر تھی۔

اس کی شادی مشرقی روایات اسلامی اقدار کے حسین امتزاج سے سجی سادگی و دیدہ زیبی کا مظہر تھی اگرچہ اس گھر نے اس ملک کے لوگوں نے اسے بہت خلوص محبت اپنائیت دی تھی، مگر پھر بھی نکاح نامے پر دستخط کرتے ہوئے ایک بار پھر خونی رشتے، عزیز، دوستیاں، تعلقات یاد آئے تو ذہن ماؤف ہونے لگا اور دو نیلی آنکھیں اس کے تصور میں چھلکیں تو لمحہ بھر کو دل ڈوبا آنکھیں بھر آئیں۔

اور اگلے پل خود کو سنبھالتے کپکپاتے ہاتھوں سے اس نے ایجاب و قبول کے مراحل سے گزرتے سائن کر دیے، پھر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے ہچکیوں سے رونے لگی، اس گھر کے سب افراد سے جو رشتہ و تعلق اس کا بن چکا تھا اس ناطے سے رونا کچھ کو سمجھ میں آ رہا تھا اور بہت سے مغربی معاشرے کی پروردہ اس نو مسلم لڑکی کو روتے حیرت سے دیکھ رہے تھے، بھیگی آنکھیں، ڈھیروں دعائیں، خلوص، محبتوں کے ساتھ اسے فاطمہ کے ماں باپ نے ضروری گھریلو سامان جہیز کے ساتھ رخصت کیا تھا اور حق مہر عائشہ نے اپنی مرضی سے لکھوایا تھا کہ اگر وہ شخص استطاعت رکھتا ہے تو اسے کعبتہ اللہ کا حج کروا دے نہیں استطاعت تو اس کے ہمراہ حج ادا کرے، اس کی یہ خواہش بھی سب کے لئے ایک خوشگوار حیرت، رشک کا باعث تھی، ایک چھوٹے صاف ستھرے خوبصورت گھر کے بہت نفاست سے آراستہ کمرے میں اصلی گلابوں سے سجی مسہری کے بیچ عروسی ملبوس میں مشرقی دلہن کا تاثر لئے مہندی کے نقش و نگار سجائے ہاتھوں، بازوؤں، پیروں پر نگاہیں جھکائے بیٹھی تھی جب وہ شخص اندر آیا تھا۔

مہذب شائستہ انداز میں سلام کے بعد اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے وہ بولا تھا۔

"میرا تعلق ایسے معاشرے سے تھا جہاں عورت صرف عیش کی چیز مذہب صرف ضرورت اور زندگی صرف انجوائے منٹ کے طور پر ہوتی ہے، تفرقات نسلی، مذہبی حد سے زیادہ تھے وہاں میں نے محبت کی دو چیزوں سے ایک استقامت دوسری ماریا جوزف۔" عائشہ نے بے طرح چونکتے ہوئے سر اٹھایا چہرے کے آگے ڈھلکے زرتار ڈوپٹے کے پار نظر آنے والا شخص سفید شلوار قمیض میں ملبوس تھا سرخ و سفید رنگت کے ساتھ نفاست سے تراشی متناسب داڑھی بہت سلیقے سے ترشے بال اس کے بولنے کا انداز شائستہ اور دھیما تھا وہ شخص اسے دوبار پہلے بھی دکھائی دیا تھا مگر کہاں، کس جگہ، کس حالت میں، عائشہ نے اپنے حافظے پر زور ڈالا۔

"ماریا جوزف بدلتے نظریات وعقائد کے زیر اثر عیسائیت سے باغی لڑکی تھی میں اسے محبت کرتا تھا شادی کر کے اس کے ساتھ اچھی زندگی گزارنے کا متمنی تھا اور وہ احمق میری محبت پر یقین کیے بغیر مذاہب کو پرکھنے چل پڑی جس مذہب نے اس کی ذہنی روحانی ابتری کو اتنا بڑھایا کہ وہ متعدد بار خودکشی کرنے کی کوشش کرتی رہی اور میں اس کے لئے کوسوں دور بیٹھا زندگی مانگتا۔" وہ عجیب پھیکی ہنسی ہنسا اور عائشہ کو یکدم یاد آیا فیصل آباد کی مصروف شاہراہ کے بیچوں بیچ نماز ادا کرتا شخص، پنجاب یونیورسٹی کے آڈیٹوریم میں اسلام پہ لیکچر دیتا نومسلم یہ وہ ہی شخص تھا جس نے پہلی بار اسے اس احساس سے روشناس کروایا تھا کہ "اللہ ہر جگہ موجود ہے۔"

"اور یہ میری محبت کی انتہا تھی کہ میں مسلمان ہو کے بھی سجدے میں سر جھکاتا تو بجائے توبہ، معافی کی بجائے اپنے رب سے اس لڑکی کی محبت مانگتا جو شاید زندہ بھی نہ تھی اگر تھی تو کسی انجان مذہب پہ، مگر محبت یقین کا دامن چھوڑنے نہ دیتی۔" اس کا لہجہ بھرا گیا۔

"میں مائیکل سے محمد احمد تک کا سفر کر آیا مگر وہ لڑکی میرے ذہن اور دل سے پل بھر کو نہیں نکلی اور ملی نہیں شاید اس لئے کہ میرا دل خالص نہ ہو سکا تھا اور اللہ کو میرا یہ گناہ نہ بھایا، میں سمجھتا ہوں میرے جذبے اگر خالص ہوتے تو اسے میری طرف یا مجھے اس کی طرف ضرور پلٹایا جاتا کیونکہ......" وہ رک گیا تھا بھرائے لہجہ آنکھوں کو نم ہونے کی کوشش سے بچاتا اور عائشہ نے اپنی بہتی آنکھوں کو پونچھتے دیکھا وہ شخص جو اس کی تقدیر میں تھا، جس کا ظاہری حلیہ اتنا بدل چکا تھا کہ وہ پہچان نہ سکی تھی بلکہ اپنے سے جاننے والا کوئی بھی شخص اس حلیے میں دیکھ کر یقین نہ کر سکتا تھا کہ وہ مائیکل ہے اور یقیناً محبت میں صداقت کے علاوہ کوئی ایسی چیز تھی کہ اس شخص میں جو رب کو پسند آئی تبھی ہر بار مرنے کی کوشش پہ پلٹا کر اسے دنیا میں بھیجا گیا اور اسلام تک رسائی دی پھر اس شخص کی زوجیت میں رکھا گیا اور یہ اللہ کا انتخاب تھا جو اسے پسند تھا، جس پہ وہ راضی تھی۔

☆☆☆

تیز لہروں پہ تیرا زور نہ تھا
بادباں تھے ہواؤں کے بس میں
میں تجھے مانگتا رہا لیکن
تو نہیں تھا

دعاؤں کے بس میں
ساحلوں کے تجھے اماں نہ دی
اور تو موج در موج زد میں رہا
تیری چاہت سے تھا پرے شاید
وہ کنارا جو تیری حد میں تھا
اور پھر بار ہا
نہیں معلوم دوسری سمت اپنا رخ کر کے
تو نے کیسے صدا دی تھی؟
تو نے جانے کیسے پکارا تھا
میں نے چپ چپ دور سے دیکھا
میں تیرا آخری کنارا تھا

وہ معصوم تھی یا سادہ اور وہاج حسن خود غرض لالچی یا خبیث انسان تھا، وجہ کچھ بھی ہو بدگمانی جھوٹ، غلط بیانی، ناراضی، لاتعلقی سب اپنی جگہ مگر وہ اسے اتنا ذلیل بھی کر سکتا ہے کہ اپنے ذاتی مفاد کے لئے کسی دوسرے مرد کے پاس بھیجے اور وہ اس مرد کو کیا سمجھ بیٹھی تھی، اسے وہ وقت یاد آیا جب وہاج کے گھر میں کھڑی روتی گڑگڑاتی جب وہ ادھورے لفظوں میں اپنی بے گناہی کا یقین دلا رہی تھی تب اس نے یقین نہ کر کے منگنی کی انگوٹھی واپس لے کر اس کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکال لی تھی، اس وقت جب اس گھر کے علاوہ اس کے پاس دوسرا ٹھکانہ کوئی نہ تھا۔

اور اب وہ شخص اس کے پاس آیا تھا تو ایک لمحہ کے لئے بھی اس کے چہرے پر پچھتاوا ملال یا ندامت نہ تھی وہ صرف اپنے مطلب کے لئے گڑگڑا رہا تھا اور یہ چیز اریبہ کو اس سے نفرت شدید ترین نفرت کرنے پر مجبور کر رہی تھی، وہ اس سے رابطے کر رہا تھا بار بار ملنے آ رہا تھا مگر اب وہ کسی قیمت پر اس کو دیکھنے یا سننے پر تیار نہ تھی، وہاج حسن نامی کسی شخص سے وہ کبھی واقف تھی وہ یہ بات بھول جانا چاہتی تھی، اس نے معافی تلافی کی کوششوں اور بار بار رابطوں پہ اپنے سیکرٹری کو سخت اور حکمیہ انداز میں وہاج حسن نامی کسی شخص کے آنے کا کالز اسے ریسیو کرنے کی صورت میں وارننگ دی تھی اور خود وہاج حسن سے بھی کہا تھا۔

"مجھے شرمندگی، دکھ اور اپنے انتہائی نقصانات کا پچھتاوا مار ڈالتا ہے جب مجھے یہ خیال آتا ہے کہ میرا تم سے کبھی کوئی رشتہ تھا اور تم سے وابستہ احساسات کو لیتی ہوں تو میرا خون کھول اٹھتا ہے تم نے مجھے بدکردار سمجھ کر حقیقتاً بدکردار بنا دیا، بن جانے پر مجبور کر دیا، اب جو چاہے تم سمجھو، جو چاہے میں کروں، یہ دو الگ ہیڈک ہیں جن کا آپس میں کوئی کنکشن نہیں، رہے تم، تو تم پر میں تھوکتی ہوں۔" سخت سپاٹ انداز میں کہتے ہوئے اریبہ نے واقعی اس کے چہرے پر تھوک دیا اس پل کیا تھا اس کی آنکھوں میں انگارے دہک رہے تھے اور اس وقت کتنے لوگ آس پاس تھے سعود غوری، شہریار، سعیہ، حیدر صاحب، شائستہ بیگم وہ سب اچانک اور کیوں آئے تھے وہاج حسن کو پتا نہ چل سکا، وہ تو سکتے کے عالم میں تھا۔

"عزت، کردار، خوشی سب تم نے چھین لیا مجھ سے، پیسے کے لئے، محلہ میں رہنا عذاب ہو گیا تھا میرا

خاندان گلی محلے والے سب مجھے بدکردار سمجھنے لگے تھے میں بے گناہ ہو کر بھی کسی کو اپنی بے گناہی کا یقین نہیں دلا پا رہی تھی، ایک پل میں تم نے میرا سب کچھ برباد کر دیا تھا، امیری نے گھمنڈ اور دولت کے غرور مزید دولت ہتھیانے کی ہوس میں، تم نے مجھے جہنم میں دھکیل دیا، تم نے صرف اپنے لئے سوچا اپنی ذات اپنی غرض کو دیکھا، محبت، رشتہ، احساس سب بھلا کر اپنا دین، مذہب تم نے صرف پیسے کو بنا لیا تھا اور میں کوئی بھی احساس زیاں کیے بغیر تمہارے پیچھے خوار ہوتی رہی، کیا ہو تم؟" اس کا چہرہ، لہجہ سب کتنا عجیب تھا پہچان یا احساس کی ہلکی سی رمق نہ تھی اس کے کسی انداز میں وہاج حسن اسے بنا پلکیں جھپکائے کمرے کے وسط میں کھڑا ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔

"گارڈ دھکے دے کر باہر نکال دو اس کو اور آئندہ کسی اجنبی کو اندر نہ آنے دینا۔" وہ پلٹی اور وہاں سے چلی گئی، شاید اسی طرح کے ہجوم میں اسی طرح کے لوگوں میں کبھی اس نے بھی اریبہ کو دھکے دے کر نکلوایا تھا اور یہ خیال آتے ہی وہاج حسن نے ایک جھرجھری لی تھی، اپنے اردگرد موجود لوگوں کو دیکھنے کی کوشش کی تھی مگر دیکھ نہیں سکا، کسی نے اسے بازو سے پکڑا اور ٹھڈا مارایا ہر دھکیلا، وہاں موجود کسی ذی نفس نے اس سلوک پر گارڈ کو ڈانٹا نہ اریبہ کو کچھ کہا شاید سب اسے اسی کا مستحق سمجھ رہے تھے، وہ جا رہا تھا مگر مڑ مڑ کر دیکھ رہا تھا جیسے اسے یقین ہو اریبہ ابھی کہیں سے نکلے گی اور اس سے اپنے سلوک کی معافی مانگے گی، مگر نہیں یہ اس کا وہم تھا اریبہ اس کی شکل دیکھنے یا آواز سننے کی روادار نہ تھی، وہ سفاکی کی حد تک اجنبی اور حقارت زدہ انداز اپنا کے گئی تھی، وہ ہمدردانہ، اپنائیت بھرے جملے بولنے والی ہنسی خوشی محبتوں بھری زندگی اس کے ساتھ گزارنے کے خواب رکھنے والی اریبہ اشفاق یہ وہ نہیں تھی اور یہ یقین خود کو دلاتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا تھا۔

وہاج حسن سمجھ رہا تھا کہ اس نے جو بھی اریبہ کے ساتھ کیا اس کے برعکس وہ اپنے دل میں دیوتا بنائے اس کی داسی بنی رہے گی، پتا نہیں مرد ذات کو ہمیشہ یہ غلط فہمی کیوں ہوئی ہے کہ عورت سے ظالمانہ و حقیرانہ سلوک کرنے کے باوجود عورت اسی کی مالا جپتی رہتی ہے صرف اس ایک خوش فہمی میں وہ اس پر کالک ملے جاتا ہے اور سب کچھ گنوا کر تہی دامن ہو جانے والی عورت کیا اتنی دیالو ہو سکتی ہے، بالکل نہیں جواب جب پلکوں کی دہلیز پہ تمنائیں جگا کے آنکھوں کو خون رلانے لگیں، پرندے خواہشوں کے محبتوں کے پیڑ پہ بسیرا کرنے سے پہلے ہجرت کر لیں تو حیات پتھر ہو جاتی ہیں، سماعتیں مفلوج اور ذہن پاگل پن کی انتہا کو چھو کر پلٹتا ہے تو کیسے سخی بنا جائے اریبہ بھی انسان تھی خدا تو نہیں، سو وہ انسان ہو کر انسان کو کیسے معاف کرتی، سو جتنی سفاک سنگدل اور بے بہرہ ہو سکتی تھی وہ ہو لی مگر اوپری منزل پہ جا کے اپنے اٹالین طرز کے ٹیرس سے جب اس نے نیچے جھانکا تو میلے کچیلے کپڑوں، بے ترتیب حلیے الجھے بال بڑھی شیو کے ساتھ سڑک کے بیچ کھڑے پھوٹ پھوٹ کر روتے وہاج حسن کو دیکھ کر اسے کچھ ہونے لگا، یہ وہ وہاج حسن تھا جو انتہائی کسمپرسی کے عالم میں ہر وقت نک سک سے درست خوشبوؤں سے بسا بہت وجیہہ اور ہینڈسم لگا کرتا تھا، وہ مرد جس سے اریبہ اشفاق نے ٹوٹ کر محبت کی تھی، اپنے خواب وعدے قسمیں مستقبل کے سپنے سب اس ایک شخص سے منسوب کر کے اس نے نقصانات اٹھائے اتنے نقصان کہ شرافت، نیکی، آبرو سب گئے اور نہیں گئی تو اس کے دل سے اس ایک شخص کی محبت وہ اب بھی اسے اذیت میں دیکھ کر دکھ محسوس کر رہی تھی، اس کے دل میں اب بھی اسے اذیت میں دیکھ کر دکھ محسوس کر رہی تھی اس

کے دل میں اب بھی یہی مرد بستا تھا، وہ مرد جس کی کامیابی ترقی کے لئے کبھی وہ بہت دعائیں مانگا کرتی تھی وہ مرد جس کو اس نے اپنا سب کچھ سمجھ رکھا تھا اس مرد کے لئے پچھلے بہت عرصہ سے وہ پچھتاوے، دکھ اور بے یقینی کے احساسات جھیلتی رہی پھر یہ احساسات نفرت، غصہ، انتقام کے جذبے میں ڈھلتے عفریت بنتے گئے اور آج یہ عفریت وہاج حسن کو کھا گیا اور وہ یہی تو چاہتی تھی کہ جس طرح وہاج حسن اس کی زندگی تباہ خوشیاں ملیامیٹ کر گیا، وہ بھی اسے تباہ و برباد کر دے اور آج اس وقت جب یہ سب ہو گیا تھا وہ عزت، ساکھ، کاروباری مرتبہ، جاہ و حشمت، قسمت سب گنوا بیٹھا ہر برج پہ مات کھا گیا، تو یہ چیز اسے رلا رہی تھی اور اسے ابھی ابھی احساس ہوا تھا کہ لاکھ جدوجہد کے بعد بھی وہ ویسی نہیں بن پائی تھی جیسی اسے بننا چاہیے تھا، اس نے اپنے دل کے بدلتے احساسات کے ساتھ سمجھوتہ کیا تھا، بے بسی کے شدید ترین احساس نے اسے کہا تھا کہ وہ شقی القلب ہو جائے مگر نہیں ہو پائی تھی، وہ اس شخص سے وابستہ کچھ نہیں بھولی تھی محبت، دوستی، وعدے، دعوے، زندگی، خواب، خوشی اسے یاد تھا یہ وہ شخص تھا جو محبت کا اعتبار دے کر شک کی چھلنی میں اسے چھان چکا تھا، اسے سنگسار کیا تھا اس بندے نے اور وہ خالی دل، خالی ذہن، خالی دماغ، خالی زندگی لئے شہ ماتوں کو اٹھائے لہولہان اسی طرح روتی کرلاتی اس کی زندگی سے نکلی تھی آج وہ یوں جا رہا تھا تو اریبہ اشفاق کو سارے منظر بھیگتے محسوس ہو رہے تھے وہ برف کی سل کی طرح بے حس و حرکت دم سادھے آنکھیں جھپکائے بغیر دیکھ رہی تھی وہاں جہاں کھڑے وہاج حسن نے سر اٹھا کر آخری بار اپنے پیچھے بند ہو جانے والے گیٹ کو دیکھا تھا اور اریبہ نے اسے پکارا مگر حلق سے آواز نہیں نکل پائی بس آنکھوں سے آنسو نکلے۔

وہاج حسن نے لحہ بھر جانے کیا سوچ کر اچانک پلٹتے ہوئے اوپر نگاہ کی کیا تھا اس نگاہ میں شاید کچھ نہیں اور شاید بہت کچھ۔

گلہریوں کا اسی پیڑ پہ بسیرا تھا
شکاریوں نے جسے ہر طرف سے گھیرا تھا
نہ پھل کوئی نہ کڑی دھوپ میں ملا سایہ
کبھی میری تھی زمیں شجر میرا تھا

"زندگی صرف انہی لمحوں سے عبارت ہے جن میں تم میرے پاس ہوتی ہو۔"

"تمہارا دیا عزم حوصلہ میرے شکستہ اعصاب کو وہ مضبوطی بخشتا ہے جسے دنیا کی کوئی طاقت ہرا نہیں سکتی۔" کوئی خوشبو سا لہجہ فضا میں بکھرا تھا اور اریبہ اشفاق کے دل میں درد اٹھا بہت سی یادیں، بہت سی باتیں بہت سے منظر اس کے سامنے سے گزرنے لگے۔

☆☆☆

"انکل اور آنٹی کی خواہش تھی کہ میں تم سے ایک بار مل لوں دیکھ لوں اور ہم اپنے ماضی کے گوشے ایک دوسرے پہ آشکار کر دیں لیکن مجھے ان پہ بہت بھروسہ ہے سو میں نے انکار کر دیا ویسے بھی جو ماضی تھا وہ گزر گیا ہمارے رشتے، تعلقات، محبتیں، نفرتیں حتیٰ کہ مذہب تک بدل چکا ہے ہم اس وقت مسلمان ہیں ہماری نئی اور اسلامی زندگی کا آغاز ہے سو حقیقت یہی ہے گزشتہ سب خواب تھا جسے تمہیں یا مجھے بھول جانا بہتر ہوگا۔" وہ بے حد سنجیدہ تھا عائشہ اب بھی کچھ نہ بولی بس اسے بولتے دیکھتی رہی زرتار دوپٹے کی

اوٹ سے۔

"میں نے پورے دل سے تمہیں اپنایا ہے میں ایک مسلمان ہوں اور کبھی بھی تمہیں دھوکا دینے کی کوشش نہیں کرونگا تمہارے حقوق محبت ازدواجی کہیں کوتاہی نہیں ہوگی مگر کہیں تمہیں یہ التفات دھند میں لپٹا نظر آئے تو معاف کر دینا کہ دل پہ اختیار اپنے بس میں نہیں ہوتا۔" وہ خاموش ہوا تو عائشہ کا چہرہ سارا بھیگ چکا تھا وہ اپنے نرم ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھوں پہ رکھتے ہوئے یکدم چہرہ قدرے جھکا گئی اور اس کی سسکیاں کمرے کی خاموش فضا میں گرنجنے لگیں تو احمد نے پریشانی، اضطراب اور تشویش میں گھرتے ہوئے اس کا چہرہ اوپر اٹھا کے آنچل تھوڑا پیچھے کھسکایا۔

اور اس سے اگلے پل جیسے بجلی کا کرنٹ لگا تھا، وہ چونکا پھر ساکت ہوا، وہ بدلی تھی مشرقی حلیہ ولباس زیورات مگر اتنی نہیں کہ وہ اسے پہچان نہ پاتا اس کی آنکھیں پوری کھلی تھیں، وہ بے حد تحیر و بے یقینی سے یک ٹک اپنے سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھتا رہا، جو خواب تھی تو حقیقت کے مانند لگتی تھی اور اب حقیقت کا روپ دھار چکی تھی تو کسی خواب کا پرتو نظر آ رہی تھی۔

ماریا جوزف سے عائشہ، عائشہ سے عائشہ احمد تک سفر طے کرنے والی وہ لڑکی اس کی دعائیں محبتیں اس کا چاہنا، پانا، عطائے الٰہی نصیب کیا تھا؟ محمد احمد کی نیلگوں آنکھوں میں نمی اترنے لگی، وہ اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لئے دیکھے جا رہا تھا اور عائشہ کی نیلی آنکھوں سے آنسو قطرہ قطرہ بہتے چہرہ بھگو رہے تھے۔

"تم مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہو، کچھ جاننا چاہتے ہو میرا Past میرا ماضی تو پوچھ لو اور مجھے ایک بھرپور اعتبار اور یقین دے دو جو گزری تمام باتوں اور حقیقتوں سے ماورا ہو۔"

"نہیں عائشہ تم میری بہترین دوست رہ چکی ہو مجھے تمہارے متعلق جانچ پڑتال کرنے یا ماضی کے گوشوارے دیکھنے کی ضرورت نہیں اور اس سے کچھ حاصل بھی نہیں۔"

"میں نے بہت بار یاد کیا تھا تمہیں خاموشی سے پکارا تھا ہر مصیبت ہر خوشی ہر ناکامی اور ہر موڑ پر مجھے تم یاد آئے اور میں سمجھتی تھی کہ مجھے تمہاری بددعا لگی ہے اسی لئے میں بھٹکتی پھر رہی ہوں، اسی لئے منزل سے دور ہوں۔"

"نہیں عائشہ تمہارے لئے نیک خواہشات تھیں میرے پاس بس، استقامت کامیابی، خیر خواہی اور تمہیں پانے کی تمنا اور یہ سچ ہے کہ تم اگر اپنی ختم ہوتی سانسوں سے لڑ کر اس دنیا میں واپس آتی رہی ہو تو خدا کی مرضی اور میری دعا کے سبب کہ میں نے اگر گزرے دس برسوں میں شدت سے کچھ مانگا تو صرف تمہیں۔" عائشہ نے چند ثانیے اسے بھیگی نگاہوں سے دیکھا تھا پھر اپنا سر آہستگی سے اس کے سینے پر رکھ دیا اور احمد نے اس کے گرد اپنے بازوؤں کا حصار باندھ دیا تھا اور اس کی آنکھوں کے آنسو لبوں سے چننے لگا۔

وہ چہرہ، وہ آنکھیں وہ لب و رخسار جنہیں دیکھنے کبھی چھونے کی خواہش تھی آج اس وقت اس کے سامنے تھے، وہ لڑکی جسے اس نے برسوں چاہا مانگا تھا شرعی و قانونی طور پر اس کی دسترس میں تھی، اسے لگ رہا تھا زمین و آسماں کائنات کی ہر شے اس کی خوشی پر شاداں و فرحاں ہے۔

☆☆☆

چاندنی گنگنانے لگی کس لئے؟
تارے آنگن میں آنے لگے کس لئے؟
کس لئے رنگ مہندی کا کھلنے لگا؟
پھول ہم کو ستانے لگے کس لئے؟
بس تمہارے لئے بس تمہارے لئے

حج کی تیاری و روانگی کے دوران پندرہ دن تھے اور یہ دن وہ پوری دلجمعی سے دعائیں یاد کرنے درس قرآن لینے اور نماز کی پابندی کرنے میں گزار رہی تھی کچھ جاننے والے احباب جوان کی دعوتوں پر مصر تھے اور وہ دونوں یہ سلسلہ حج سے واپسی تک ملتوی کرنا چاہتے تھے مگر پھر بھی جب بعد اصرار نہیں مدعو کیا گیا تو شادی کی یہ خیر مقدمی دعوتیں نمٹانے کے ساتھ لاہور کے تاریخی ویوز بھی دیکھ ڈالے وقت نکال کے میوزیم، شالامار باغ، مقبرہ نور جہاں و جہانگیر، مقبرہ انارکلی ریس کورس، فورٹرس سٹیڈیم، شاہی قلعہ، بادشاہی مسجد، شیش محل، مینار پاکستان یہ سب دیکھتے ہوئے وہ مسلمان ماہرین فن تعمیرات کے نادر و نایاب ترکیبات خطاطی عربی و ایرانی مصری تہذیب کے نقوش اور اعلیٰ اقدار کے حامل نمونوں کے دل سے قائل ہوئے بلاشبہ فن تعمیرات میں مسلم آرکیٹکچروں کے ہم پلہ کوئی نہیں اور مغل حکمرانوں نے بھی اپنے دور حکومت کے دوران بنائے گئے مقابر و مساجد، یا قلعوں و باغات میں جس شوق و لگن سے یادگار ڈیزائن بنائے وہ بھی قابل دید ہیں خصوصاً مساجد کی اوپری گولائی چھتوں کے بیچ خوبصورت عربی آیات کی عکاسی ایک دل موہ لینے والا فن ہے، جو مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم لوگوں کو بھی متاثر کرتا ہے۔

"مساجد کے میناروں کو دیکھ کر ایسا نہیں لگتا کہ یہ مینار کلیساؤں کے مینار دیکھ کر بنائے گئے ہیں کیونکہ اسلامک ہسٹری پڑھتے ہوئے شروع کی مساجد میں مینار کا نشان نہیں ملتا۔" عائشہ نے احمد کو دیکھ کر کہا تو فاطمہ نے اس کے خیال کو درست نہیں قرار دیا، اس کے مطابق "عرب تعمیرات میں پہلے سے ہی مینار بنتے تھے البتہ مسجد میں مینار اور گنبد کا اضافہ یوں ہوا کہ مینار کی وجہ سے مسجد دور سے نظر آئے اور گنبد سے مسجد کے خطیب کی آواز و نماز کی آواز ایک گونج اور خوبصورتی سے پوری مسجد میں پھیلتی تھی۔"

"مساجد کی تزئین کے لئے قرآنی آیات کا مختلف طریقوں سے خوبصورت استعمال اور جیومیٹرک ڈیزائن کے ساتھ ثقافت و مہارت کی عکاسی بھی ہے۔" عائشہ نے کہا۔

"بالکل اور بادشاہی مسجد کے مینار 8-53 میٹر (176.3 فٹ لمبے) ہیں، مسجد حسن ثانی اور مسجد الخضر اور بادشاہی مسجد کے مینار دنیا کے لمبے ترین میناروں میں شمار ہوتے ہیں جبکہ سب سے لمبا مینار مسجد حسن ثانی، کاسابلانکا (مراکش) کا سمجھا جاتا ہے، جو 210 میٹر 689 فٹ ہے۔" فاطمہ نے مزید بتایا پھر آگے بڑھتے ہوئے بولی۔

"شاہجہان نے اپنے دور حکومت میں دہلی، آگرہ، اجمیر اور لاہور میں بڑی مساجد تعمیر کرائیں جن میں دہلی کی جامع مسجد اور لاہور کی بادشاہی مسجد کا طرز تعمیر تقریباً ایک جیسا ہے۔"

دوران تفریح و سیر فاطمہ نے اسے لاہور کی مشہور فوڈ اسٹریٹس بھی دکھائیں۔

"یہاں کے پھل اور کھانے اتنے عمدہ ہیں کہ تم سمجھو گی جنت میں آ گئیں اور...... اور پاکستان کے علاوہ تمہیں یہ ٹیسٹ پوری دنیا میں کہیں نہیں ملے گا۔"

اور پھر جب حلوہ پوری، کچوری، تلی ہوئی مچھلی، مرغ روسٹ، حلیم نہاری، بریانی، شامی کباب، کوفتے، تکے، سیخ کباب ہر روز کچھ نہ کچھ کھاتے پیتے احمد اور عائشہ واقعی اسلامی لوگوں کے لذت طعام و نفاست کے قائل ہوئے۔

"کھانے بے شک بہت کھائے ہیں مگر پاکستان والا ذائقہ، خوشبو اور رنگت واقعی کہیں ملی نہ دیکھی اور یہ حقیقت ہے کہ جس قوم کا مزاج کھانے میں ایسا لذیز واعلیٰ ہے اس کا مذہب بھی جہاں بھر سے اونچا ہے۔" عائشہ نے سڑک پر تیزی سے بھاگتی دوڑتی گاڑیوں کو دیکھتے ہوئے کہا، دوران شاپنگ جیولری سے لے کر ہر بڑی سے بڑی چھوٹی سے چھوٹی چیز میں اسے اسلامی تہذیب وثقافت کا رنگ نمایاں نظر آیا، اس نے کچھ اشیاء ضرورتاً اور کچھ محض شوق سے خریدیں، کچھ چیزیں فاطمہ نے اپنی طرف سے دلوائیں، اس سے اگلے دن انہیں اپنا پاسپورٹ ٹکٹ وغیرہ اور ضروری میڈیکل کلیئر کرا کے اسلام آباد پہنچنا تھا جہاں سے ان کی جدہ کے لئے روانگی تھی، سو آخری لمحہ تک وہ اپنے تمام ملنے جلنے، بالخصوص فاطمہ کے گھر والوں کے ہمراہ رہے اور اپنے اس دینی فریضہ وقلبی شوق کی قبولیت وادائیگی کے درست انداز میں قرار پانے کے لئے دعا گو رہے۔

☆☆☆

اب کے بہار جتنے پھول کھلائے
تیری راہ میں بکھیر دیں
اب کے آسماں پر ستارے دکھیں جس قدر
تیری مانگ میں اتار دیں
بھیگی راتوں کی ساری شبنم
کر دیں تیرے نام
ٹھنڈی صبحوں کی سرد ٹھنڈک
گلابی سردیوں کی دھوپ
لکھ دیں تیرے نام
فضاؤں میں ان گنت پھولوں سے پھیلی
صندلیں خوشبوئیں
تیری دھڑکنوں کو چھیڑ دیں
ساتھ پھول رنگ خوشبو کا
تیرے رخ کو روپ نیا، نکھار نیا
اک نئی طرح کا سنگار دے
تجھے سونپ دیں رتوں کے سب سرے
تجھے دے دیں ساون کے دن بھرے
آنکھوں میں جتنے خواب اتریں
چہرے پر جتنی ہنسی کھلے

لبوں پہ جتنی باتیں مچلیں نام تیرے کریں
خوشی سے برستی بارشوں کا تجھے نکھار دیں
تجھے دل دیں دل کا اعتبار دیں
جو مہلت دے زندگی
تو جاں سے بڑھ کر پیار دیں

"مجھے سمیٹ لو، اپنی پناہ میں چھپا لو میں زندگی ہوں تمہاری، مجھے پورے دل سے جیو، اپنی دھڑکنوں، سانسوں احساس کی گرفت میں یوں بسا لو کہ بچھڑنے کے سب اندیشے مٹ جائیں، کھو جانے کا کوئی ڈر نہ رہے، میں تمہارے پیار، تمہارے اختیار کے دائروں میں ہوں، باندھ لو مجھے اپنے آپ سے اور اپنے ہی اختیار میں رہنے دو، تمہارے بعد، تمہارے بغیر، تمہارے بنا زندگی کچھ نہیں کچھ بھی نہیں۔" لمحے کہہ رہے تھے لمحے سن رہے تھے، ان کے لبوں پہ خاموشی تھی مگر سانسوں کے زیروبم میں اظہار کے سارے پل گنگنا رہے تھے، اعتراف کے سارے الفاظ خاموش لمحوں کے پلو سے سرگوشیاں باندھ رہے تھے، محبت کی گہرائیوں سے اٹے سمندر طغیانیوں کی زد پہ تھے اور ان طغیانیوں میں ڈوبتے ابھرتے وجود، محبت فاتح عالم کا کلمہ پڑھ رہے تھے۔

"تم محبت کا احساس ہو، تمہاری آہٹوں نے مجھے زندگی بخشی ہے تمہارے لمس مسیحا نے محبت سے چھو کر مجھے زندہ کیا ہے، میں تمہیں کیسے گنوا سکتی ہوں شہری۔" اس کی سرگوشیوں میں شدت تھی وبے قرار بھیگی نگاہ سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"میں بھی ان لمحوں میں جینا چاہتا ہوں، جب میرا عکس تمہاری آنکھوں میں ابھرے تمہارے چہرہ میرے سامنے اور تم پورے دل، وجود سمیت میری بانہوں میں ہو، میرے لئے یہی لمحے زندگی ہیں، تمہارے اقرار کے لفظ خوشبو لٹائیں اور آنکھوں کے جگنو جگر جگر چمکتے رہیں، رنگ بکھرے اور دلکشی بڑھتی رہے، تب سب کچھ کتنا حسین اور دل پذیر لگتا ہے۔" شہریار نے اس کے گداز لرزتے لبوں کو چوما۔

جنوں تھا اک جس میں منظر ساکت تھے، ساعتیں تھم چکی تھیں اک گہرے خواب کے عالم میں روحیں ناچ رہی تھیں۔

بہت کچھ کہنے کی خواہش، بہت کچھ سننے کی چاہ تھی مگر لبوں پہ کوئی الفاظ نہ تھے وقت کہانیاں چھیڑ رہا تھا وہ عنواں دے رہے تھے چمکتا چاند چہرہ جو مضبوط مردانہ ہاتھوں کے پیالے میں تھما تھا اور جھکتی پلکوں کی لرزش کچھ اور بڑھ رہی تھی، شہریار اسے مبہوت محویت زدہ دیکھتا جا رہا تھا جو ان لمحات میں اور بھی قریب دل وجاں اور بھی خوبصورت تھی۔

"تم میری خواہشوں میں ہو تمہاری تمام کمیاں، کجیاں کمزوریاں مجھے قبول ہیں، تمہارا چھوٹی چھوٹی باتوں پر روٹھنا، پریشان ہونا، لڑنا ہر بات کو دل پہ لے لینا تم ہر کیفیت میں دل کو چھوتی ہو اور مجھے خوشی ہے کہ کچھ دیر سے سہی تمہارے دل کو میں نے بھی چھو لیا اور اسی لمس نے محبت کے کتنے نقش تم پہ منکشف کر کے اردگرد چمکا دیا۔"

اس کے لہجہ میں چاشنی نظروں میں خاص تاثر تھا جو کہہ رہا تھا "مجھے ہمیشہ کے لئے اپنے دل میں رکھ لو" مدہم لہجہ میں کہتا اس کو توجہ واستحقاق سے دیکھتا وہ بولا اور ان ساری باتوں ہر نگاہ کے مفہوم وہ سمجھتی تھی

جو کہے گئے تھے جو نہیں کہے گئے وہ بھی۔
"اپنی چیزوں پہ استحقاق جتایا جاتا ہے معلوم ہے نا تمہیں۔" مدھم سرگوشی میں ایک خاص بات سعیہ نے ریشمی پلکوں کی جھالریں اٹھا کے دیکھا اس کی آنکھیں، چہرہ، انداز، دوستانہ اپنائیت، شوق و محویت کی انتہا پہ تھے اس کے وجود میں اک ہلچل مچی تھی، اک شور اٹھا تھا وہ دانستہ چہرے کا رخ پھیر گئی تو شہریار مسکرا دیا تھا۔
"کیا اب بھی تمہارے اندر کوئی الجھن ہے، تم اب بھی کسی بات کو لے کر خائف ہو مجھ سے، کیا میرے پیار، اعتبار، شدتوں میں کمی ہے کوئی، بولو سویٹی، بولو ڈیئر تم کیا ابھی تک یقین کے مرحلے طے نہیں کر پا رہی ہو، کیا تمہیں اب بھی کوئی شک ہے۔" اس کا بیقرار استفسارانہ لہجہ سعیہ کو سمجھ نہ آیا وہ کیسے اس کی غلط فہمی کا ازالہ کر کے اس کے جذبات کو پذیرائی بخشے کہ وہ خائف نہ ہو۔
تقریباً نائنٹی پرسنٹ لڑکیاں آسانی سے نہیں کھلتیں بھلے رشتہ و تعلق شرعی و قانونی ہو وہ بھی ایسی تھی مگر شہریار کو ناراض کرنا بھی اسے کسی صورت گوارا نہ تھا سو خود کو سنبھالتی وہ بڑے سجاؤ سے بولی۔
"تو یہ فاصلے کیوں؟" شہریار کی خاموش نگاہیں بولیں اور انگشت شہادت نے بہت آہستگی سے شنگرفی لبوں کی نرمی و ملائمت کو چھوا تو وہ کچھ اور دہک اٹھی۔
"میں نے کہا تھا ناں تم سے، تم میرے دل کی دنیا میں قدم رکھو گی تو ہر گام پر محبت تمہاری منتظر ہوگی، مجھے یقین تھا سو نو میری محبت تمہیں جیت لے گی اور ایک دن ایسا ضرور آنا تھا کہ تم خود کو دنیا کی خوش قسمت لڑکی محسوس کرو گی اور اپنا آپ مجھے سونپتے ہوئے فخر محسوس ہوگا تمہیں آج وہ دن آ گیا ہے سویٹی کہ محبت عروس جان مہکانے لگی ہے وحی کی طرح خاموشی سے تمہارے دل میں اتر کر تمہیں تسخیر کر چکی ہے۔" لہجے والفاظ میں ایک خاص طرح کا ٹھہراؤ اور شدت لئے وہ بولا تو اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔
"کیا ہوا سویٹی، یہ غمناکی کیوں؟"
"جس لڑکی کو کوئی اتنا چاہتا ہو اس کے ساتھ کی اتنی تمنا رکھتا ہو اسے کیا ہو سکتا ہے، شہری اور میں تو دل کے ساحلوں پر کھلتے پھولوں کی مہک سے خود کو مشکبو ہوئے پا رہی ہوں، اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہوں محبت کو اپنے وجود پہ بکھرتے ابھرتے اور سنورے پا رہی ہوں اور یہ احساس کتنا دلآویز، خوبصورت اور دلنشین ہے شاید بتا نہ پاؤں۔"
وہ اپنے بے حد قریب کھڑے شہریار کے سینے پہ سر رکھتے ہوئے بولی، تو ایک بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ وہ اسے بازوؤں کے گھیرے میں لئے اپنے جہازی سائز بیڈ کی جانب بڑھنے لگا۔
زندگی کی پناہوں میں ان کے لئے آگے ہر موڑ پر خوشیاں رقصاں تھیں، خوشبوئیں مہک رہی تھیں، پھول کھلے تھے، وصل رت بہت سی دلکشی و خوبصورتی لئے سرشاری سے ان کے استقبال کو باہیں پھیلائے مسکرا رہی تھی، گہری ہوتی شب کی سیاہ چادر پہ چمکتے ستارے ان کے والہانہ پہ مسرور تھے، محبت اپنے سارے زر ان پہ لٹا رہی تھی۔

چاندنی رات کے ہاتھوں پہ سوار اتری ہے
کوئی خوشبو میری دہلیز کے پار اتری ہے
اس میں کچھ رنگ بھی ہیں خواب بھی مہکار بھی ہے

جھلملاتی ہوئی خواہش بھی ہے انکار بھی ہے
اسی خوشبو میں کئی درد بھی افسانے بھی
اسی خوشبو نے بنائے کئی دیوانے بھی
میرے آنچل پہ امیدوں کی قطار اتری ہے
کوئی خوشبو میری دہلیز کے پار اتری ہے
اسی خوشبو سے کسی یاد کے در کھلتے ہیں
میرے پیروں سے جو لپٹے تو سفر کھلتے ہیں
یہی خوشبو جو مجھے گھر سے اٹھا لائی تھی
اب کسی طور نہیں پلٹ کر جانے دیتی
میری دہلیز بلاتی ہے مجھے لوٹ آؤ
یہی خوشبو مجھے واپس نہیں آنے دیتی
رنج اور درد میں ڈوبی بہار اتری ہے
کوئی خوشبو میری دہلیز کے پار اتری ہے

☆☆☆

"محبت بہت پیارا لفظ ہے، جانتی ہو ریا مجھے اس لفظ میں تمہارا عکس ملتا ہے تو زندگی کی صعوبتیں بھی سکون دینے لگتی ہیں۔"
"ہر موسم، ہر دن، ہر لمحہ تم اک خوشنما احساس بن کر مجھے سحر زدہ کرتی ہو۔"
"تم وہ ستارہ ہو صبح امید کا جو دھند میں چاند کھوئے کہ غبار میں راستہ مگر تمہاری روشنی میرے ساتھ ہی رہے گی۔" کسی کے نرم لہجے میں خوشبو تھی۔
"تمہاری محبت میری زندگی کا حسن ہے اور اسی حسن سے مجھے اپنی صبحیں نکھارنی ہیں۔" اس کو کوئی بتا رہا تھا۔
وہ یک ٹک دیکھے جا رہی تھی اس مغرور شخص کو جس کے لئے اس نے سوچا تھا کہ وہ دروازے سے نکلتے ہوئے پلٹے تو اس کی نگاہیں ٹیرس پر جا ٹھہریں۔
اور وہ دیکھے تو سہی کہ اونچائی پر کھڑے ہو کر نچلی سطح کے احساس محرومی کے مارے شخص کا درد تکلیف کیسا مزا دیتا ہے، وہ جو مات دیتا آیا تھا اسے شہ مات کھانا کیسا لگتا ہے، جیت کے تعاقب میں بھاگنے والے کو وہ بری طرح شکست سے دوچار ہوتے دیکھنے کی آرزومند تھی مگر اسے یہ سب اتنا آسان نہیں لگا کہ یہ شطرنج کے مہرے نہیں ایک جیتے جاگتے انسان کا معاملہ تھا وہ انسان جو کبھی اس کے ساتھ چھینا جھپٹی کر کے ایک پلیٹ میں کھانا ایک گلاس میں پانی پیتا اور اس کے ساتھ پہروں بیٹھا خواب دریچوں کے خوشنما منظر بنتا، جس کی آنکھوں میں اسے ساری دنیا دکھتی، وہ جو زندگی کو ہر لمحہ ہمت اور حوصلہ سے جینے کا شائق تھا، جو اسے بامروت اور چہرہ شناس لگا کرتا تھا، جس کا تصور اس کے چاروں طرف پھول کھلا دیتا تھا خوشی کے، جو اس کا مزاج آشنا تھا، وہ پاس ہوتا تو کائنات جھومنے لہرانے مسکرانے لگتی اور پھر ایک دن اسی سے وہ سیکھی تھی کہ وعدہ خلافی، بے حسی، رنگ بدلنا اور سرد مہری جیسی اعلیٰ صفات کیسی ہوتی

ہیں، اسی نے بتایا تھا کہ دھوکہ کس طرح دینا چاہیے، کس طرح اپنے ہی الفاظ سے مکر جانا چاہیے، کس طرح سے اپنی غلطیوں کا الزام دوسروں کے سر ڈالنا چاہیے، کس طرح سے خوابوں، محبتوں، امیدوں کو توڑ چاہیے، اس شخص سے وابستہ کیا کچھ تھا کہ جسے وہ چاہ کر بھی اپنی زندگی سے نہیں نکال سکتی تھی اور یہ سچ ہے کہ زندگی میں سب کچھ اسی طرح سے نہیں ہوتا جس طرح ہم چاہ رہے ہوتے ہیں اور ہو جائے تو بعض اوقات ویسی خوشی نہیں ہوتی جیسی ہونی چاہیے۔

''تو کیا میں نے کچھ غلط کر دیا؟''

اس نے سوچا اور سامنے دیکھا جہاں اپنے بازو سے چہرہ پونچھتے ہوئے وہاج حسن نے رخ موڑا اور زندگی کی بساط پہ سب کچھ ہار کر شکستہ تھکے ہارے بوجھل قدم اٹھاتا نکلنے لگا اس کی زندگی سے، اریبہ کو یکدم ساری فضا پانی ہوتی محسوس ہوئی اس کی دھڑکنیں ڈوبنے لگیں۔

''کچھ بھی ہو یہ میری اولیں محبت کا نوخیز روپ ہے اسے یوں اپنی زندگی سے نہیں جانے دوں گی مجھے اسے روکنا ہے۔'' لمحے کے ہزارویں حصہ میں وہ فیصلہ کر کے سرعت سے سیڑھیاں پھلانگتی نیچے آئی اور ننگے پیر، ننگے سر باہر آئی۔

''وہاج!'' گلی کا موڑ مڑتے اس نے سڑک کراس کرتے نڈھال، کمزور، نقاہت زدہ اعصاب والے شخص کو پکارا، وہ مڑا اور وہیں رک گئی، آنسو قطرہ قطرہ اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

تو چل اے موسم گریہ
پھر اب کی بار بھی ہم ہی
تیری انگلی پکڑتے ہیں
تجھے گھر لے چلتے ہیں
وہاں ہر چیز ویسی ہے
کوئی منظر نہیں بدلا
تیرا کمرہ بھی ویسے ہی پڑا ہے
جس طرح تو نے اسے دیکھا تھا
اسے چھوڑا تھا
تیرے بستر کے پہلو میں رکھی اس میز پر
اب بھی رکھا ہے مگ وہ کافی کا
کہ جس کے خشک اور ٹوٹے کناروں پر
ابھی تک وسوسوں اور خواہشوں کے
جھاگ کے دھبے نمایاں ہیں
تیرے چپل بھی رکھے ہیں
کہ جن کے بے ثمر تلووں سے
وہ سب خواب لپٹے ہیں
جو اتنا روندے جانے پر بھی

اب تک سانس لیتے ہیں
تیرے کپڑے جو غم کی بارشوں میں
دھل کر آئے تھے
میری الماریوں کے ہینگروں میں
اب بھی لٹکے ہیں
دلاسوں کا وہ گیلا تولیہ
اور ہچکیوں کا وہ ادھ کھلا صابن
چمکتے واش بیسن میں پڑے ہیں
اور گرم ٹھنڈے پانی کی وہ دونوں
نل اب تک رواں ہیں
تو جنہیں اس دن
کسی جلدی میں کھلا چھوڑ آیا تھا
دریچے کی طرف دیوار پر لٹکی گھڑی
اب بھی ہمیشہ کی طرح
آدھا منٹ پیچھے ہی رہتی ہے
کیلنڈر پر رکی تاریخ نے
پلکیں نہیں جھپکیں
اور اس کے ساتھ آویزاں
وہ اک منظر، وہ اک تصویر جس میں تو
میرے شانے پر سر رکھے
میرے پہلو میں بیٹھا ہے
میری گردن اور اس کے گیسوؤں کے پاس
اک تتلی خوشی سے اڑتی پھرتی ہے
کچھ ایسا سحر چھایا ہے
دل رکتا ہوا چلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے
مگر اے موسم گریہ!
اس ساعت نہ جانے کس طرف سے
تو چلا آیا، ہمارے بیچ سے تو
اس طرح سے گزرا
کہ جیسے دو مخالف راستوں کو
کاٹتی سرحد، کہ جس کے ہر طرف
بس دوریوں کی گرد اڑتی ہے

اسی ایک گرد کی تہہ میں
تجھے دروازے کی بیل پر جمی
''شاید'' نظر آئے
تمنا سے بھری آنکھیں
ہر دم مسکراتی تھیں
اب ان آنکھوں کے کونوں میں
نمی شاید نظر آئے

وہ لمحہ بہ لمحہ آگے چلتی وہاج حسن کے بالکل سامنے آ کھڑی ہوئی، وہ سارے الفاظ، وہ ساری وضاحتیں، وہ معافی تلافی اس کے لب لرز رہے تھے، وہ اس سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی کہ اچانک اس کی نگاہ سامنے گئی ایک تیز رفتار بڑا ٹرالر اسی سیدھ میں آ رہا تھا جہاں وہ کھڑے تھے، چند قدم کا فاصلہ تھا جب اسے ہوش آیا، اس نے وہاج حسن کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچنا چاہا مگر زندگی اپنے قدم اور سانس پورے کر چکی تھی، چند لمحے پہلے جہاں زندگی کھڑی تھی وہاں اب خون میں لت پت بے جان وجود پڑا تھا، وہ شخص جو شاید اسے دنیا میں سب سے پیارا تھا، جسے ہمت حوصلہ سے جینے کا وہ درس دیا کرتی تھی اسی کی بے حس اور کٹھور فطرت اسے بے جان کر گئی، وہ روتے چلاتے اس کو جھنجھوڑ رہی تھی اس کا لہو چہرہ چوم رہی تھی مگر زندگی خاموش تھی۔

میری ذات کے ریگستان میں
شہر دل کا طواف کرتے وقت
اپنی ایڑی رگڑ رگڑ کر
تم نے کتنی بار کہا تھا
زم زم یہاں سے پھوٹو نا
لو پھر زم زم پھوٹ رہا ہے
لیکن تم اب کہیں نہیں ہو
مجمع پانی لوٹ رہا ہے

☆☆☆

ابو البشر حضرت آدمؑ اور جدہ انسانی اماں حوا جب دنیا میں تشریف لائے تو وہ فلک پر ملائکہ کا مرکز یا قبلہ دیکھتے اور یہ منظر ان کے اذہان و قلوب میں ایک خوشگوار یاد کے طور پر تازہ تھا جسے ''بیت المعمور'' کہتے ہیں، دنیا میں ایک ایسا ہی مرکز عقیدت و محبت ان کی دلی تمنا اور دعا تھی، ان کی پر خلوص دعاؤں پر رب کریم نے متوجہ ہو کر ان کو ایک مرکز عطا فرمایا دیا یعنی کعبہ مکہ مکرمہ، پتھروں سے تعمیر کردہ وہ پہلی عبادت گاہ جو طوفان نوحؑ تک رہی، امتداد زمانہ سے ان پتھروں پر مٹی کی تہہ جم گئی اور وہ جگہ ایک ٹیلہ کی طرح نظر آتی تھی، حضرت ابراہیمؑ نے بحکم خدا وہ جگہ ڈھونڈ نکالی اور حضرت اسمٰعیلؑ کے ساتھ قدیم بنیادوں پر تعمیر کی اور آج تک مسجد حرام انہی بنیادوں پر استوار ہے (اور تا قیامت رہے گی انشاء اللہ)۔

خشک، بنجر، بے آباد پہاڑ کھجوروں کے جھنڈ، اونٹ، وہ شہر جس کے لئے حضرت ابراہیمؑ نے رب کائنات سے دعا کی تھی کہ ''اس شہر کو امن کی جگہ بنا دے اور یہاں کے باسیوں کو ہر طرح کا رزق مہیا کر، وہ اس اس شہر میں تھی یہاں کسی بھی قسم کی ہریالی نہیں تھی مگر کسی بھی چیز کو ''شمار'' کرنا ممکن نہ تھا، قسم قسم کے تازہ پھل ہے بے بہا آب زم زم ہے تو بے حساب، رزق ہے تو ان گنت اللہ تعالیٰ کا ایک وصف (الرزاق) بے پناہ طاقت وقوت اور لامحدود اختیارات کا احساس دلاتا ہے، اگر کوئی پوچھتا۔

خانہ کعبہ پر پہلی نظر کیسی پڑی اور کیا مانگا اس کا جسم اور روح ساتھ نہیں دے رہا تھا دل و دماغ پر عجب سا سرور چھا رہا تھا جو اسے زندگی میں پہلے کبھی محسوس نہ ہوا تھا، ایک کیف تو رہی نور اسے اپنی اوقات بدلی بدلی محسوس ہو رہی تھی، بالکل ایسے جیسے کسی فقیر کو کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے اٹھا کر شہنشاہ کے پر شکوہ اور پر ہیبت دربار تک رسائی ہو جائے یہاں تو معاملہ کچھ اور تھا وہ خستہ تن تھی میل کچیل سے گزرے دنوں سے گزری مگر اپنے رب کی مہمان تھی، وہ جگہ جہاں براہ راست اللہ کے جاہ و جلال اور نور کا مشاہدہ ہوتا ہے، دن رات رحمتوں کا نزول ہوتا ہے، قدم کہیں ڈالتی تو پڑتا کہیں، اپنی بے وقعتی اور حقیر ہونے کا احساس اس پہ اللہ کی اتنی نوازش اور مہربانی ایسا سماں کہ اس کی میزبانی کرنے والا سب کا خالق اور رب ہے جو کیسی کیسی رحمتوں اور نعمتوں کا نزول کر رہا تھا اس کا ادراک اس کی آنکھیں بھگو رہا تھا، وہ خود پہ اپنی تقدیر پہ نازاں و شاکر تھی۔

کتنی عجیب بات تھی کہ لاکھوں افراد کا بہاؤ تھا طواف کعبہ کے دوران اور کسی قسم کا شور برپا نہیں تھا ایک دلربا خاموشی تھی جو جسم و روح کے ہر گوشے پر اثر انداز ہو رہی تھی وہ بھی اسی خاموشی سے اور ذہنی و قلبی کیفیات کے پر اثر لمحات میں طواف کعبہ کے بعد دو رکعت نفل ادا کر کے اپنے رب کے حضور حاضر تھی اسے وہ وقت یاد آ رہا تھا جب اس کے والدین، فرینڈز اور معاشرے کے دیگر لوگوں نے قطع تعلق کر کے لعن طعن کر کے چھوڑ دیا تھا اس کو اور آج اس وقت وہ چاہ رہی تھی کہیں سے ان سب کو پکڑ کر لے آئے اور دکھا دے کہ اس کے رب نے اسے تنہا نہیں چھوڑا ذلت و رسوائی نہیں دی دنیا کے سامنے تماشہ نہیں بننے دیا بلکہ اسے ہدایت و استقامت عطا فرمائی اور انعام و کرام کی انتہا کر دی کہ وہ اس کے گھر میں بطور مہمان مدعو ہے وہ بیت اللہ میں حاضر شعائر اسلام کی ادائیگی کر رہی ہے جو عمر بھر میں ایک بار نصیب ہوتی ہے اور پوری زندگی کو زینت بخشتی ہے، وہ دکھانا چاہتی تھی انہیں کہ دیکھو ''یہاں میں ہوں، وہاں اللہ کے لطف و کرم اور انوارات و تجلیات سے قلب و نظر معطر، منور اور روشن ہیں، مجھے کمال انسانی کی امتیازی حیثیت اور عروج انسانی کی معراج حاصل ہے۔'' وہ روتے ہوئے اپنے مقام و حیثیت پہ تحیر زدہ و مشکور ہو کے بارگاہ ایزدی میں حاضر تھی اور کہہ رہی تھی۔

''اے اللہ! بلندیوں اور برکتوں والے مالک، میں تجھ پر ایمان رکھتی ہوں، میرا ظاہر و باطن تجھے سجدہ کرتا ہے میں تیری نعمتوں کا اقرار کرتی ہوں، میں بہت متقی، یا پرہیز گار نہیں، مگر تجھ سے چاہتی ہوں کہ مجھے عادات میں استقلال اور ارادہ میں نیکی عطا کر میرے دل کو عیبوں سے پاک کر دے اور زبان کو سچائی سکھا، اے اللہ! ہم میاں بیوی اسلام میں آئے ہیں ہمارے لئے ہمارے دین کو سنوار دے کہ اس میں ہمارا بھلا ہے اور ہماری دنیا کو بہتر بنا دے کہ اس میں ہمارا گزر ہے، اے اللہ ہمیں ایک دوسرے کے لئے باعث خیر و برکت اور وجہ عافیت بنا دے ہمارے دلوں میں الفت بھر دے ہم کو کھلے اور چھپے شر سے بچانا، اے اللہ! تو نے ہمیں اندھیروں سے نکال کر روشنی دکھائی، ہماری حالتوں کو ذہنی و روحانی طور پر

درست کر کے ہمیں نور اسلام سے منور کیا، الٰہی اب ہمیں ہمیشہ سلامتی کی راہ پہ چلانا اور ہمارے دلوں کو پرہیزگاری دینا، ہم پہ اپنی رحمت رکھنا اور اپنی نعمتوں کا شکر گزار بنانا اور ہمارے گناہ معاف کرنا ہمیں بخشش عطا کرنا بے شک اس کی اعلیٰ و احسن طاقت تجھی کو ہے، اے اللہ! بے شک تو نیتوں اور ارادوں سے واقف ہے ہمارے اپنے راہ میں سفر و شوق قبول کر اور ہمارے اس ٹوٹے پھوٹے عمل کو قبول فرما جو ہم نے خلوص نیت اور خلوص دل سے بطور فریضہ حج ادا کرنے کا کیا اگر اس میں کہیں کوئی کمی بیشی کوتاہی یا ناسمجھی ہو جائے تو درگزر کرنا تو سب سے بڑھ کر غفور الرحیم ہے اور ہم تیری رحمت و بخشش کے امیدوار ہیں پس ہمیں عطا کر وہ سب جو ہمارے لئے بہتر ہے جو ہمارے لئے بہتر نہیں اس سے بچا اور جو رنج و غم یا تنگی ہو اگر تیری رضا کے موافق ہے تو ہمیں اس پہ صبر کی توفیق دینا کہ بے شک ایسا تو ہی کر سکتا ہے۔"

"الٰہی! اسلام اور مسلمانوں کو دنیا و دین کے حوالہ سے جو تنگی، مصائب اور مشکلات درپیش ہیں ان کو دور کر دے اور ہر انسان کو جو مسلمان ہے دین کا سچا داعی مخلص بنا دے ان کی ذہنی حالتیں سنوار دے ان سے تفریق بازی، فرقہ پرستی حسد و بغض دور کر کے آپس میں شیر و شکر کر دے تا کہ یہ دشمنان اسلام کا کلی طور پر مقابلہ کر سکیں اور کامیابی سے سرفراز ہوں، اے اللہ! مسلمانوں کے دل اسلام و استقامت اور اخوت و اتحاد پہ مضبوط بنا دے اور اسے ملت اسلامی بنا دے جس کا خواب ہمارے رسول عربی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھا یا اللہ قبول فرما، رحم فرما، درگزر کر، یا رب العالمین آمین ثم آمین۔" اس نے چہرے پہ ہاتھ پھیرا۔

الصلوٰۃ عصر کے بعد اس نے دیکھا "حجر اسود" کو بوسہ دینے کی شائق خواتین صبر و تحمل کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کے دھکم پیل کر رہی تھیں، اسے دکھ ہوا کہ کیا ایسی خواتین کو معلوم نہیں حجر اسود کو بوسہ دینا فرض نہیں، سنت ہے اور آپ نے یہ سنت مختلف طریقوں سے ادا کی تھی دور سے استلام بھی کیا تھا نزدیک سے بوسہ بھی دیا تھا، وہ غار ثور بھی گئی، نہایت بلند، پر پیچ اور مشکل چڑھائی، جبل ثور پر وہ غار موجود ہے جو قیامت تک کے لئے تاریخ کا حصہ بن چکی ہے الٹی کشتی کے مشابہ اس غار کا دہانہ انتہائی تنگ تھا اس میں لیٹ کر ہی داخل ہوا جا سکتا تھا، غار کی اندرونی لمبائی تقریباً سوا میٹر اور اندر سے ساڑھے تین مربع جگہ ہے مدینہ منورہ ہجرت سے پہلے آپ نے یار غار حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہمراہ تین دن تین راتیں اس غار میں قیام کیا تھا، اگلی منزل غار حرا تھی جو مکہ شہر سے منیٰ کی طرف جاتے ہوئے بائیں جانب ہے اس غار کا طول چار گز اور عرض پونے دو گز ہے یہ وہ زمینی مقام ہے جہاں پر آسمان سے دنیا کے لئے ہدایت و رحمت کا چشمہ پھوٹا قرآن نازل ہو، حق کی تلاش میں سرگرداں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبوت سے قبل یہیں عبادت کے لئے آتے تھے، اس کے بعد روضہ اقدس پر حاضری دی، حرمین الشریفین کی طرح یہاں کا انتظام بھی قابل رشک تھا صفائی کا بین الاقوامی معیار تھا دوسرے برادر اسلامی ممالک کے زائرین و خواتین جنہیں دیکھ کر خوشی اور اپنائیت کا احساس ہوا یہ اسلامی اخوت تھی کہ سب ایک ہی مقصد ایک ہی تڑپ لے کر مسکراہٹوں کے تبادلے اور السلام وعلیکم کے الفاظ و جذبات ایک دوسرے تک پہنچا رہے تھے، سعودی عرب کی حکومت نے تحفہ کے طور پر آب زم زم کی بوتلیں سب کو پیش کی تھیں دوران حج تو ہر جگہ جی بھر کر اس تحفے سے لطف اندوز ہوئے، حج کے پورے پینتیس دنوں میں مکہ مکرمہ میں دوران قیام وہ لوگ ہر اسلامی و تاریخی جگہ دیکھنے گئے حجر معلق، جنت المعلیٰ، جبل احد، جائے ولادت حضورؐ، جبل رحمت، آب

زم زم کا کنواں پھر مدینہ میں مسجد نبویؐ کے ساتھ جنت البقیع کا منظر، ابواز کا مقام علاوہ ازیں حضرت آدمؑ کا نقش پا، مقام ابراہیم، جبل احد پر وہ مقام جہاں پر آقائے دو جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھڑے ہو کر جنگ کا معائنہ فرمایا، اس جگہ آج بھی ایک بے مثال خوشبو ہے، وہ کنواں جہاں سے تقریباً سو انبیاء کرام نے غسل کیا، مرقد عائشہؓ مرقد خدیجہؓ، مزار حلیمہ سعدیہ، مزار حضرت آمنہ لیکن روضہ اقدس پہ حاضری کے دوران جوش و خروش، خوشی اور احساس ممنونیت پذیرائی سے زیادہ تھا اس نے وہ پاکستانی بھی دیکھے جو جوش و خروش سے نعتیں پڑھتے روضہ رسولؐ پہ دوبارہ حاضری کی دعا مانگتے اور ادھر آ کر نماز سے فارغ ہوتے ہی کھانے پینے اور خوش گپیوں میں مشغول ہو جاتے اور کھا کر صفائی ستھرائی کا دھیان کیے بغیر کچرا وہیں پھینک دیتے، وہ ایسے تھے جیسے پکنک منا رہے ہیں، جبکہ یہاں اور حرم شریف کے باتھ روموں اور طہارت خانوں کا بھی وہ حال تھا کہ لاکھوں لوگوں کے استعمال میں رہنے کے باوجود، اتنے صاف لگتا ابھی کسی کے استعمال میں نہیں آئے اور خوشبو سے معطر، جبکہ صحن نبویؐ میں یہ زائرین جس بے توجہی کا مظاہرہ کر رہے تھے شرمندگی کا باعث تھا، چونکہ اس کا گروپ پاکستانی تھا تو ہوٹل میں بھی ایک روم چند لوگ مل کر شیئر کرتے تو اونچی آواز میں ٹی وی لگا لیتے رات گئے تک بنا دوسروں کے آرام کا خیال کیے اسی لئے ہوٹلز میں کھانا ملنے پر ذرا سی تاخیر پر مرد حضرات غصے کا شکار ہو کے گالی گلوچ پہ اتر آتے، اسموکنگ کرتے گپیں ہانکتے دوران نماز بھی موبائل سنتے اور خواتین لان و چکن کے اتنے باریک کپڑے کا لباس پہنے دوپٹے گلے میں لٹکائے پھرتیں جیسے پکنک یا شاپنگ پہ ہوں، لائٹ کلرز جن کے نیچے قمیضیں بھی نہیں تھیں ادب احترام اور اخلاقیات سے لگتا تھا ان کا اس مقدس و متبرک جگہ آ کر بھی واسطہ نہیں ایسے ہی بدتہذیبی اور بدنظمی میں بھی یہ لوگ اپنی مثال آپ تھے، جبکہ عرب ممالک اور دیگر مسلم ممالک سے آنے والی خواتین اپنے لباسوں کے اوپر عبایا، کوٹ، اسکارف اور رومال اس خوبصورتی سے لئے ہوتی کہ ذرا سی بے پردگی کا احساس نہ ہوتا اور وہ اس ماحول کے ہم آہنگ دکھائی دیتیں، اسی طرح حرم پاک اور مسجد نبویؐ میں نماز کے لئے پاکستانی خواتین کو حد درجہ پوزیسو ہوتے دیکھا جو اپنی ہم وطن خواتین کو بھی جگہ نہیں دے رہی تھیں، وہ پاکستان میں آ کر یہاں اسلام سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئی تھی مگر مسلمانوں کا عملی رویہ اسے متاسف کر رہا تھا۔

"کیا ان لوگوں کو نہیں معلوم کہ ہم سب ان ہستیوں کے حضور اور اس کے دربار کھڑے ہیں جو کمزوروں، دھتکاروں کو گلے لگاتے ہیں، یہ کیا معلوم کہ ایسوں کی نماز صبح بھی قبول ہو گا کہ نہیں، یہاں وسیع القلب ہستیاں ہوں اس جگہ کھڑے ہو کر رحمتیں اور برکتیں نازل ہوتے پا کر بھی اخلاق اور نظم و ضبط کا مظاہرہ کرنا، خلوص و عقیدت کے بجائے مسلمانیت کے کردار کو داغدار کرنا کیا یہ مسلمان ہیں۔"

بہت سوچا تھا اس نے پھر آخری لمحات میں جب عرب ٹی وی کے ایک قومی چینل نے انہیں مدعو کیا اور ایسے پروگرام کے لئے ان کا مقالہ ریکارڈ کرنے کی خواہش ظاہر کی جو دور حاضر میں دائرہ اسلام میں آنے والے نومسلم افراد و خواتین کے خیالات بتاتا تھا کہ وہ اسلام کی طرف کیا دیکھ کر، کیا پا کر راغب ہوئے اور کیا چیز اسلامی معاشرے میں اچھی کیا برعکس محسوس ہوئی، تو محمد احمد اور عائشہ ان دونوں نے اپنے اپنے خیالات و محسوسات ایک فکر انگیز اور تاثر خیز مقالے کی صورت میں تحریر کر کے پیش کیے۔

پہلے محمد احمد کا پروگرام ریکارڈ ہوا تین گھنٹے کا طویل پروگرام جس میں اس نے قبول اسلام سے قبل

اپنی زندگی کا مختصراً تعارف کروایا پھر مختلف مذاہب کو پڑھا اور اسلام تک کیسے پہنچا یہ داستان اپنی جگہ بے حد اہمیت کی حامل تھی، خوبصورت عبایا و حجاب میں ملبوس عائشہ نے بھی اپنے تعارف کے بعد اسلام کی طرف آنے کا ذکر کرتے ہوئے اپنے تاثرات دیئے۔

”اگر آپ کو میرے قبول اسلام کی داستان سے دلچسپی ہے تو اتنا جان لیجئے کہ اسلام کو میں نے قبول نہیں کیا بلکہ اپنے اندر دریافت کیا ہے اور مجھے اس امر کا بھی اعتماد ہے کہ میں نے بہت سے مذاہب کا مطالعہ کیا اور ہر جگہ بہت سی کمیاں، ابہام پا کر میرے شعور نے انہیں مسترد کیا میرے قبول اسلام کے ضمن وصف ہیں عقیدہ توحید، اسلام کا نظریہ، یوم حساب اور بغیر کسی واسطہ کے براہ راست اللہ کا قرب حاصل کرنا یہ ٹھیک ہے کہ پہلے پہل میں اسلام کے تہذیب و ثقافت اور ظاہری پہلوؤں سے متاثر ہوئی، مگر پھر عبادت کی سادگی و یک رنگی جس میں رنگ و نسل سے بالاتر ہو کر ہر مسلمان اخوت و بھائی چارگی کے جذبے میں ایک طرف ایک صف میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے ہیں اس پہلو نے متاثر کیا اور پھر صدیاں گزرنے کے بعد بھی قرآن کا غیر محرف ثابت ہونا، میں نے عیسائیت کی مختلف شاخوں اور فرقوں کے متعلق بچپن سے ہی غور و فکر شروع کر دیا تھا جبکہ یہودیت، ہندومت، جین مت، بدھ مت Presbyterin, withess mormons, methodist, jehovahs جیسے مذاہب کا بھی ضروری مطالعہ کیا، مگر میرا وجدان جو کچھ طلب کرتا تھا مجھے کہیں نہ ملا، دورہ پاکستان میں یونیورسٹی کے چند مسلم طلبا سے ملی تو ان کی صاف گوئی، مطمئن طبیعت اور آپس میں والہانہ پن نے مجھے متاثر کیا، اللہ پہ ایمان رکھنے والوں کے درمیان ایک مضبوط تعلق کی موجودگی نے مجھے اسلام کے متعلق لٹریچر اور آثار و شواہد سے متعارف ہونے پر اکسایا اور میں نے سوشیالوجی اور ایک انسان کے رویے میں ہونے والے عمل کا گہری بصیرت سے مطالعہ کیا قرآنی آیات کا تفصیلی اور بہ غور مطالعہ کیا تو دل نے خود بخود قرآن کی الہامی و مستند حیثیت کو قبول کیا یہ حقیقت ہے کہ اسلام ایک عملی مذہب ہے اور زندگی کے ہر پہلو کے متعلق ایک ضابطہ اور خاص قانون پیش کرتا ہے، سخت سے سخت حالات میں انسان کو پریشانی اور مایوسی سے محفوظ رکھتا ہے، اسلام میں دیے جانے والے عورتوں کے حقوق اور ان کے ساتھ مساوات کے واضح اصول و شناخت سے سخت متاثر ہوئی جو اسلام نے خواتین کو عطا کی تھی اسلامی نظام زندگی کو اچھی طرح کر میں مغرب کی خودساختہ اصطلاح ”بنیاد پرستی“ سے وابستہ تصورات کے کھوکھلے پن سے بخوبی آگاہ ہو گئی اور اپنے سابقہ تصورات کے یکسر غلط ہونے پر سخت ششدر رہ گئی۔

میں نے کھلے ذہن کے منطق اور سچائی کا سامنا کر کے ان کی قوت کو تسلیم کر لیا اور ایسے مذہب پر فخریہ ایمان لائی جو بہت سے منفی تصورات کا حامل سمجھا جاتا ہے۔

اور میرا یقین ہے کہ جو بے شمار لوگ اسلام کی طرف لپکے چلے آ رہے ہیں انہیں اس امر کا احساس ہو گیا ہے کہ موجودہ مغربی طرز زندگی نہ تو اخلاقی قدروں کی پرورش کرتی ہے نہ یہ کسی باوقار اور صاف ستھرے اسلوب حیات کو پروان چڑھاتی ہے جبکہ اس کے برعکس اسلام کی صورت میں وہ ایسی صداقت سے بہرہ ور ہوتے ہیں جو انہیں بلند ترین اخلاقی معیارات عطا کرتی ہے اور ان کو معیارات حاصل کرنے کا وہ مطمع نظر دیتی ہے جو حقیقت پسندی پر مبنی ہے فطری اور باوقار بھی ہے خاص اور اہم ترین بات یہ ہے کہ اسلام مغرب کی تنگ نظری سے بہت بلند و بالا ہے اور انسانوں کو مادیت اور نسل پرستی سے

خالص انسانی شرف کی بنا پر مخاطب کرتا ہے، اسلامی تعلیمات سے آشنائی کے بعد اس کی عزت میرے دل میں بہت بڑھ گئی اور میں نے اپنا جو اسلامی تشخص قائم کیا اس پر مجھے فخر ہے اور میں خوش ہوں کہ میں ان خاص انعام یافتگان (اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت کا انعام حاصل کرنے والوں) میں سے ایک ہوں جنہوں نے خود یہ روشنی قبول کی۔

لیکن اس سب کے ساتھ میں ایک بات بھی کہنا چاہوں گی کہ اسے مشورہ سمجھیں یا نصیحت مگر فی الفور ہم سب مسلمانوں کو اسلام کے متعلق اپنا عملی رویہ درست کرنا ہے کیونکہ نو مسلموں کے مقابلہ میں پیدائشی مسلمان آپس میں کہیں اکٹھے ہوں یا ملک سے باہر ہوں تو وہ صرف اپنے وطن کے نہیں اسلام کے بھی سفیر ہوتے ہیں مگر ان کا رویہ عدم برداشت، غصہ آمیز اور عدم صفائی پہ مبنی ہوتا ہے جو سراسر غلط ہے کاش ان لوگوں کو اندازہ ہو کہ وہ نسلی اور پیدائشی مسلمان ہو کے بھی اپنے طرز عمل، رہن سہن اور غصہ ور مزاج کی وجہ سے اپنے اور غیر مسلم دنیا کے درمیان ایسی دیوار کھڑی کی ہے جو دعوت و تبلیغ کے راستے کی بہت بڑی رکاوٹ بن گئی ہے اور محض کچھ مسلمانوں کا رویہ پورے عالم اسلام کا غلط تشخص اجاگر کر چکا ہے۔

جو لوگ نعرہ لگاتے ہیں ”اسلام بمقابلہ مغرب“ وہ بھی یورپ میں اسلام کی راہ کھوٹی کر رہے ہیں اور بلا امتیاز سارے مغرب کو اسلام کا دشمن ثابت کرتے ہیں اور یہ کتنا دردناک منظر ہے کہ نو مسلم کہیں ”ہم مسلمانوں کو دیکھ کر نہیں، اسلام دیکھ کر مسلمان ہوئے“

ذرا سوچیں!

ہمارا کردار و عمل بطور مسلمان کتنا مختلف ہے، آپؐ کے پاکیزہ اور مثالی کردار ہے کہ جس سے ان گنت لوگ مسلمان ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صبر، دیانتداری اور شدید ترین مخالفت میں آپ کی انصاف پسندی اور متوازن رویہ مخالفین کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا اور آہ، ہم مسلمانوں کا رویہ کہ ہم سرزمین حجاز و نجد میں پہنچ کر بھی اپنے ہی ہم وطنوں کو نماز کے لئے جگہ نہیں دیتے، خواتین حجاب و لباس کا درست اہتمام کرنے سے غافل رہتی ہیں۔

اور اپنے پڑوسیوں عام ملنے جلنے والوں سے کیسا سلوک ہے؟ کوئی معمولی سے اختلاف کا اظہار کر دے تو ہم برگشتہ ہو کر اس سے تعلق توڑ لیتے ہیں، مخالفت کے جواب میں تیز مخالفت کا مظاہرہ کرتے ہیں ہم بھول جاتے ہیں کہ پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہمیں کیا سکھاتا ہے قرآن کیا بتاتا ہے۔

افسوس کہ اس افسوسناک حرکت (حق چھپانے والی) یورپ کے میڈیا نے نہیں بلکہ خود مسلمانوں نے انجام دی ہے کہ کاش وہ اس کا احساس کریں اور اسلام کے بارے میں منفی سوچ، مغرب کی تنگ نظری اور متعصب رویہ سے نپٹنے کا طریقہ تو یہ ہے کہ ہم اسلام کے بارے میں سنجیدگی اور اخلاص کا رویہ اختیار کریں، انہیں عملی طور پر اسلام کا چلتا پھرتا، زندہ نمونہ بن کر دکھائیں اور ہماری یہ تعمیری روش یورپ، امریکہ اور دیگر مغربی غلط فہمیوں کو دور کرنے کے ساتھ اسلامی تبلیغ کا موثر ذریعہ بھی بن جائے گی اور یہ کام رفاہی اور اخلاقی حوالے سے ہر مسلمان کو کرنا چاہیے۔

اور ہر وقت قرآن و پیغمبر اسلام کی اس غیر معمولی تاکید کو سامنے رکھیں۔

ترجمہ: ”یعنی لوگوں کو اللہ کے راستے کی طرف لاؤ، حکمت اور اچھے طریقے کے ساتھ۔“ (سورہ

النحل آیت 25)

حضور اکرم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

''ہر مسلمان کے لئے ایک سرحد ہے اور وہ اسلام و نماز ہے۔'' ہمیں اس کی تفسیر و ترویج کا عملی نمونہ پیش کرنا ہے بطور ایک سچے اور مخلص مسلمان ہمیں یاد رکھنا ہے کہ۔

میری زندگی کا مقصد تیرے دین کی سرفرازی
میں اسی لئے مسلمان میں اسی لئے نمازی

اختتام

السلام وعلیکم دعائیں!

گزشتہ تین سال سے مستقل چلنے والا ناول ''وہ ستارہ صبح امید کا'' اختتام کو پہنچا، آپ کا میرا ساتھ کیسا رہا اس تحریر کو جس مقصد کے تحت لکھا جو بتانا، سمجھانا، دکھانا چاہا کس حد تک پورا ہوا؟ میں صرف اتنا کہوں گی کہ الحمدللہ ہم مسلمان ہیں اور ہمیں اپنے عمل سے ثابت کرنا ہوگا کہ قرآن مجید کی عظیم الشان آیات کی موجودگی میں انسان رہنمائی لے کر بہترین زندگی بسر کر سکتا ہے لیکن اس کے لئے مسلمانوں کو متحد اور منظم ہونا ہوگا، فرقوں سے بالاتر ہونا پڑے گا پرانی عداوتیں تاریخ میں دفن کر کے تمام تر توجہ ایک سنہری مستقبل کی تعمیر پر صرف کرنا ہوگی کہ یہی اللہ کی رضا و منشاء ہے۔

دوسری بات بھی کسی رشتے، تعلق یا محبت میں ریا، مفاد کا ہلکا سا شائبہ تک نہ رکھیں ورنہ آپ سب پا کر بھی خالی ہاتھ رہ جائیں گے، ''شک'' ایسی چیز ہے جو صرف مشکوک فرد کو ہی نہیں ساتھ آپ کو بھی لے ڈوبتا ہے محض شک کی بناء پر کسی کو رد کر کے تنہا نہ چھوڑیں۔

پہلی قسط لکھتے وقت میں نے ایک بات کہی تھی وہی دہراؤں گی کہ۔

آپ زندگی کی محبت بنیں زمانے کو خود بخود بن جائیں گے۔

آپ کی آراء میرے لئے بہت قیمتی ہے آپ کی محبتوں اور توجہ کے لئے ممنون ہوں کہ مجھے پڑھتے اور برداشت کرتے ہیں، دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

فوزیہ غزل

کنول ریاض

"بی بی جی...... السلام علیکم!" اندر داخل ہوتی رضیہ نے بھرپور انداز میں سلام کیا تو ٹی وی پہ ٹاک شو دیکھتی مسز افراسیاب نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"وعلیکم السلام رضیہ...... آج اتنی دیر؟" ریموٹ سے آواز دھیمی کرتے انہوں نے رضیہ کی طرف رخ موڑا۔

"وہ دراصل بی بی جی میری چھوٹی بیٹی بیمار ہے بس صبح سے میری گود میں لیٹنے کی ضد کر رہی تھی، بڑی مشکل سے دوا دے کر سلایا ہے اور اب آپ کے سامنے ہوں۔"

رضیہ نے اپنے دیر سے آنے کی وضاحت دی اور کپڑا اٹھا کر جھاڑ پونچھ کرنے لگی آج رہ معمول سے گھنٹہ بھر لیٹ ہوگئی تھی اور اب جتنی جلدی ممکن ہوتا اسے کام نمٹا کر اگلے گھر بھی جانا تھا، مسز افراسیاب کے بعد ڈاکٹر صاحب کے گھر اور پھر وہاں سے شیخ صاحب کے گھر کپڑے، برتن دھوتے اور جھاڑو پوچا کرتے اسے دوپہر کے ڈھائی تین بج جاتے تھے اس کے بعد وہ گھر جا پاتی اور پھر گھر کے کام بچوں کی دیکھ بھال اور ہانڈی چولہا رات گئے تک اس کو مصروف رکھتے، یوں صبح پہلی اذان کے ساتھ اٹھنے والی رضیہ کو عشاء کے بعد بستر پہ نصیب ہوتا لیکن وہ پھر بھی مطمئن تھی کہ ایک آسودہ حال نہ سہی لیکن کم از کم وہ اور اس کے بچے پرسکون زندگی گزار رہے تھے تیزی سے ہاتھ چلاتے اس نے معمول سے پندرہ بیس منٹ پہلے کام نمٹایا اور اجازت لے کر ڈاکٹر صاحب کے گھر روانہ ہوئی، وہاں سے بھی اسے جلد از جلد فارغ ہونا تھا تا کہ زیادہ نہ سہی لیکن دس پندرہ منٹ کی دیر کے ساتھ وہ شیخ صاحب کے ہاں پہنچ جائے کیونکہ بیگم شیخ بڑی سخت مزاج تھیں ان کے لئے دو چار منٹ کی دیر بھی ناقابل برداشت ہوتی، اپنے گھر اور اپنی ذات کے سوا انہیں دوسرے کسی شخص سے غرض نہ تھی۔

اپنے سامنے انہیں کوئی دوسرا نظر ہی نہ آتا تھا ذرا سا ان کے مزاج کے خلاف کچھ ہوتا تو وہ بدلحاظی کے تمام ریکارڈ توڑتی سامنے والے پہ چڑھ دوڑتیں، اسے میں رضیہ جیسی معمولی ملازمہ کی ان کی نظر میں کیا اہمیت تھی بھلا، ان کی زبان کی تلخی سے رضیہ کی جان جاتی تھی، جبھی اس کی پوری کوشش ہوتی کہ وہ انہیں شکایت کا موقع نہ دے لیکن شاید آج مسز شیخ کی ڈانٹ اس کے مقدر میں تھی ڈاکٹر صاحب کے ہاں مہمان آئے ہوئے تھے اور کام معمول سے بڑھ کر تھا اور جب رضیہ کام نمٹا کر بیگم شیخ کے ہاں پہنچی تو انہوں نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

"یہ وقت ہے تمہارے آنے کا؟" رضیہ کے سلام کو نظر انداز کرتے انہوں نے سوال کیا۔

"وہ بیگم صاحبہ ڈاکٹر صاحب کے ہاں مہمان آئے ہوئے تھے بس اسی لئے۔" رضیہ نے دھیمی آواز میں وضاحت دی لیکن اس کی توقع کے مطابق اس وضاحت کو درخوا عتنا نہ سمجھا گیا تھا۔

"ڈاکٹر صاحب کے ہاں اگر مہمان آئے تھے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہاں ہی ڈیرے جما لئے جائیں، اگر ان کے ہاں جانا اتنا ہی ضروری تھا تو میرے گھر کا کام ختم کر کے چلی جاتیں۔"

ان کی بات پر رضیہ نے بے بسی سے انہیں دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہ بولی، اسے معلوم تھا کہ وہ کچھ بھی کہہ لے، بیگم شیخ پر کوئی اثر نہیں ہوگا وہ جب تک اپنی بھڑاس نکال نہیں لیں گی ان کو سکون نہیں آئے گا۔

"اب منہ میں گھگھیاں کیوں ڈال کر بیٹھ گئی ہو ڈاکٹر صاحب اگر کام کے پیسے دیتے ہیں تو ہم بھی مفت میں کام نہیں کرواتے پیسے الگ سے لے جاتی ہو اور کھانا پینا، کپڑا لتا الگ سے لیکن تم کام والیوں کی تو عادت ہے جہاں کہیں اچھا پکتا دیکھا وہیں جم کر بیٹھ گئیں، ارے اگر چاولوں کا اتنا ہی دل کر رہا تھا تو مجھ سے کہا ہوتا، دو دن سے فریج میں رکھے تھے میرے بچے تو نہیں کھاتے شوق سے وہ تو بس شیخ صاحب کی وجہ سے پکانے پڑتے ہیں اب ہفتہ بھر فریج میں سڑیں گے۔" نخوت سے کہتے انہوں نے رضیہ کے لائے ہوئے شاپر کو نشانہ بنایا جس میں ڈونگے میں پڑے چاول صاف نظر آ رہے تھے۔

"ارے نہیں نہیں بیگم صاحبہ یہ تو ڈاکٹرنی صاحبہ نے زبردستی ڈال دیئے ورنہ میں نے تو بہت منع کیا تھا جی کہ ابھی آپ کے مہمانوں نے کھانا کھانا ہے کہیں چاول کم نہ پڑ جائیں لیکن وہ نہیں مانیں اور دم سے اتارتے ہی ڈونگہ بھر کے ساتھ کر دیا۔" رضیہ نے اپنی طرف سے ان کا دل صاف کرنا چاہا لیکن آج تو الٹی آنتیں گلے پڑ رہی تھیں۔

"بس بس زیادہ چاپلوسی کرنے کی ضرورت نہیں ہے میں کیا جانتی نہیں ہوں؟ ارے تمہیں کیا معلوم باسی چاول اوون میں رکھ کر گرم کر دیئے ہوں گے اور اگر معلوم بھی ہوگا تو ہمیں تھوڑی بتاؤ گی، پر بی بی ہمارے پاس تو اتنا جگرا نہیں کہ تازہ کھانا اٹھا کر اروں غیروں میں بانٹ دیں۔"

بیگم شیخ ایک بار پھر سے شروع ہو چکیں تھیں لہٰذا رضیہ نے عافیت اسی میں جانی کہ منہ کان لپیٹے اپنا کام نمٹائے اور گھر کی راہ لے سو اس نے یہی کیا لیکن بیگم کی بڑبڑاہٹیں اس کے جانے کے بعد بھی ختم نہ ہوئی تھیں۔

☆☆☆

رضیہ کے حالات شروع سے ایسے نہیں تھے اس کا شوہر محمد علی سرکاری محکمے میں ملازم تھا رضیہ جب بیاہ کر آئی تو کافی آسودہ حالی تھی گھر میں، ساس سسر عرصہ پہلے وفات پا چکے تھے محمد علی اکلوتا تھا اور کسی دور پار کی پھپھی نے اس کا رشتہ کروایا تھا یوں رضیہ اپنی راج دہانی کی اکیلی ملکہ تھی شادی کے کچھ عرصہ بعد اللہ نے اسے بیٹے کی نعمت سے نوازا اور پھر اوپر تلے دو بیٹوں اور ایک بیٹی کی چہکاروں سے ان کا آنگن گونجنے لگا، ایسے میں اگر محمد علی اپنی ساری تنخواہ رضیہ کے ہاتھ پر لا کر رکھ دیتا تھا تو وہیں رضیہ اپنی کفایت شعاری سے نہ صرف اچھا گزارا کر رہی تھی بلکہ ساتھ ہی ساتھ تھوڑی بہت بچت بھی کر لیتی تھی، لیکن پھر وہ حادثہ ہو گیا جس نے رضیہ اور محمد علی کی خوبصورت زندگانی کو آنسوؤں میں ڈبو دیا، دفتر میں واپسی پر ایک حادثے میں محمد علی اپنی ٹانگ گنوا بیٹھا اور نوکری سے الگ ہاتھ دھونا پڑے، محکمے نے اسے مناسب رقم دے کر فارغ کر دیا علاج معالجے کے بعد بمشکل اتنی رقم بچی جس سے محمد علی نے گھر میں ہی ایک چھوٹی سی دوکان کھول لی اور تھوڑی بہت پینشن کا آسرا بھی تھا، لیکن بچوں کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان کے اخراجات بھی بڑے اور دن بدن بڑھتی مہنگائی نے بلا آخر رضیہ کو گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا اور اسی طرح دو تین گھروں میں کام کاج کر کے رضیہ اتنا کما لیتی تھی کہ اپنی اور بچوں کی بنیادی ضروریات پوری کر سکے۔

محمد علی کی پینشن اور دوکان کی کمائی کا بڑا حصہ بجلی گیس کے بلوں اور محمد علی کے دوا دارو کی مد میں چلا جاتا ایسے میں ان گھروں سے ملنے والا کھانا اور کپڑے جوتے بھی رضیہ کو بڑا سہارا دیتے تھے اور ان ہی کی وجہ سے وہ اپنے بچوں کو پڑھا سکنے میں کامیاب ہو رہی تھی، کپڑے جوتوں سے بچ آنے والی رقم وہ بچوں کی کتابوں، فیسوں پر خرچ کر لیتی تھی، یوں بچوں کا خوش آئند مستقبل

ان دونوں میاں بیوی کو حالات کی تنگی بخوشی جھیلنے پر اکساتا رہتا، رضیہ موسموں کی سختی اور کام کا اضافی بوجھ تو باآسانی سہہ لیتی تھی لیکن لوگوں کے رویے اکثر ایسے خون کے آنسو رلاتے، مسز افراسیاب اور ڈاکٹر صاحبہ کی بیگم تو کافی حد تک خدا خوفی رکھتی تھیں اور رضیہ سے اچھا برتاؤ کرتیں لیکن بیگم شیخ تو کبھی کبھار ہر حد پار کر جاتیں کئی بار رضیہ نے کام چھوڑنے کا سوچا لیکن پھر دیکھے بھالے لوگ ہونے کی وجہ سے ان کا رویہ پی جاتی اور خود کو سمجھا بجھا کر راضی کر لیتی کہ اگر گھر کے اخراجات پورے کرنے تھے تو ان سرد و گرم رویوں کو سہنا ہی تھا۔

☆☆☆

"رضیہ جلدی سے یہ برتن نکالو اور صاف کر کے باہر کھانے کی میز پہ لگاؤ۔"

مسز شیخ نے دوپٹے کے پلو سے ہاتھ سکھاتی رضیہ کو مخاطب کیا وہ ابھی ابھی برتن دھو کر فارغ ہوئی تھی اور اب مسز شیخ نے دعوت کے لئے خاص برتن الماری سے نکالنے کے لئے کہا تھا۔

"جی بیگم صاحبہ۔" رضیہ سر اثبات میں ہلاتی کچن کیبنٹ کی طرف بڑھ گئی، مسز شیخ کی چھوٹی بہن جرمنی سے آ رہی تھی اور یہ سارا اہتمام اس کی آمد کی بدولت تھا، رضیہ کی بیٹی کی طبیعت ابھی تک ناساز تھی جبھی رضیہ آج اسے اپنے ساتھ لے آئی تھی جو دوائی کے زیر اثر سو رہی تھی کچن کے ایک کونے میں موٹا کپڑا پھیلا کر رضیہ نے اسے لٹایا ہوا تھا لیکن پھر بھی مسز شیخ کے تیور بگڑے ہوئے تھے، رضیہ ان کے مزاج کی گرمی سے واقف تھی سو جلدی جلدی کام سمیٹنے میں مصروف تھی تاکہ بیٹی کو گھر لے جا سکے اور گرم بستر میں سلائے پہلے ہی بچی کا بخار ٹھیک نہیں ہو رہا تھا اگر یخ فرش کی ٹھنڈک بھی اس کے جسم میں داخل ہو جاتی تو بخار بگڑتے دیر نہ لگتی۔

"رضیہ منرل واٹر کی بوتلیں بھی رکھ لینا۔" مسز شیخ نے گلاس میز پر رکھتی رضیہ سے کہا اسی لمحے باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی۔

"میرا خیال ہے وہ لوگ آ گئے ہیں تم یہ اورنج جوس کا جگ اور گلاس لاؤنج میں ہی لے آؤ۔" مسز شیخ نے باہر جاتے سے اسے ہدایت کی، تو رضیہ سر ہلاتی کچن کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

مہمانوں کے تازہ دم ہونے کے بعد کھانے کا دور شروع ہو گیا رضیہ نے مسز شیخ کے ساتھ کھانا میز پر چنا اور اب ڈائننگ ہال کے ایک کونے میں بیٹھ رہی کہ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو مسز شیخ کو زحمت نہ کرنا پڑے کھانے کے دوران باتوں کا سلسلہ بھی جاری تھا ایسے میں جرمنی کی دلچسپ باتیں سنتی رضیہ کو علم ہی نہ ہو سکا کہ کب اس کی بیٹی مدیحہ اٹھ کر اندر آ گئی تھی۔

"امی مجھے بھی چاول کھانے ہیں۔"

صبح سے خالی پیٹ بچی کی بھوک کھانا دیکھ کر چمک اٹھی تھی جبھی ماں کو مخاطب کرتے وہ ڈائننگ ٹیبل کے پاس جا کھڑی ہوئی اور پھر رضیہ کا انتظار کیے بغیر ہاتھ بڑھا کر ڈش میں لگا چمچ اٹھانے لگی تھی جب مسز شیخ کے دھکے سے لڑکھڑا کر پیچھے گر پڑی۔

مسز شیخ کی اس حرکت سے رضیہ ساکت رہ گئی اس میں اتنی ہمت بھی نہ رہی تھی کہ نیچے گری اپنی پانچ سالہ بیٹی کو اٹھا کر چپ کروائے جو اپنا سر تھامے مسلسل رو رہی تھی۔

"دفع ہو پرے، ندیدی گندگی سے بھری پوٹ، نجانے کتنے جراثیم چمٹائے بیٹھی ہے اور اب ہمیں بھی بیمار کرنے کا ارادہ ہے۔" مسز شیخ کے الفاظ نے رضیہ کے وجود کے پرخچے اڑا دیئے وہ ابھی کچھ کہہ بھی نہ پائی تھی کہ ان کی بہن بول پڑیں۔

"آئے ہائے...... آپا...... پاکستانیوں کا اب تک وہی حال یہ کمی کمین تو منہ کو ہی آ جاتے ہیں۔"

ان کی گفتگو کے دوران ہی ان بہن صاحبہ کی سات سالہ بیٹی نے ناک بھوں چڑھاتے ناگواری سے رضیہ کی بیٹی کو دیکھا اور چمچ پلیٹ میں پٹخ کر اٹھ کھڑی ہوئی، رضیہ اور اس کی بیٹی کے رنگ اڑے کپڑے اسے ناگوار گزرتے تھے شاید۔

"او نو ماما کتنے گندے لوگ ہیں یہ آنٹی نے پتا نہیں کیوں انہیں سر چڑھا رکھا ہے میں تو اب یہ کھانا نہیں کھانے والی مجھے کچھ اور لا کے دیں۔"

مسز شیخ کے دھکے نے وہ کام نہ کیا تھا جو ان سب کے الفاظ نے کیا رضیہ تڑپ کر آگے بڑھی اور تیزی سے زمین پر گر کر روتی مدیحہ کو اٹھا کر گلے سے لگا لیا۔

"بس بیگم صاحبہ بہت ہو گیا آپ مجھے کچھ بھی کہہ لیتیں لیکن اس معصوم بچی کے ساتھ یہ ظلم؟ آپ تو خود اولاد والی ہیں دل نہیں کانپا آپ کا اس کو دھکا دیتے وقت میں بچوں کو اور کچھ سکھا سکی یا نہیں لیکن صبر و قناعت سکھانے کی بھرپور کوشش کرتی ہوں یہ بچی پچھلے پانچ دن سے بخار میں پھنک رہی تھی اور ایسے میں دو چار نوالے بمشکل لے پاتی جبھی اب چاول دیکھ کر دل چاہا تو خود کو روک نہ پائی آپ انکار کر دیتیں تو یہ ضد کیے بغیر میرے پاس آ جاتی لیکن یوں......؟" روانی سے بہتے آنسوؤں کو صاف کرتے رضیہ نے اک پل کو اپنی بیٹی کے گال پہ بوسہ دیا اور پھر اسے کندھے سے لگا لیا۔

"خود کو پاک صاف سمجھنے والوں اور میری بچی کو گندگی کی پوٹ کہنے والوں، اس کی ماں تم لوگوں کے گھر کے گند صاف کر کے بھی اتنی ہمت رکھتی ہے کہ نہا دھو کر دن میں دو تین سجدے رب کے حضور کر لیتی ہے اور نماز پڑھنے والے بندے کو اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ جب تک جسمانی صفائی نہ ہو نماز قبول نہیں میں خود بھی نماز پڑھتی ہوں اور بچوں کو بھی اس کی عادت ڈالنے کی کوشش کرتی ہوں جبھی انہیں صاف ستھرا رکھتی ہوں اس کے جسم پر پڑے کپڑے پیوند شدہ ضرور ہیں لیکن صاف ستھرے ہیں۔"

"ارے گندگی کی پوٹ ہم لوگ نہیں بلکہ جراثیم سے بھاگنے والے خود تم ہی لوگ ہو یہ تو ہم "گندے لوگوں" کی بدولت تم لوگ صاف ستھرے ہو ورنہ تو جن جراثیموں کے تم لوگ بھاگتے پھرتے ہو انہیں پھیلانے والے بھی خود ہی ہو اور تم لوگوں میں ہم جتنا حوصلہ کہاں ہم لوگ تو ہمارا تمہارا سب کا گند سمیٹ لیتے ہیں اور تمہارا بھرم رہ جاتا ہے ورنہ تم لوگوں میں اتنی ہمت کہاں کہ خود اپنا ہی گند صاف کر لو۔" رضیہ نے تلخی سے کہا اور اپنی بیٹی کو متاع حیات کی طرح سینے سے لگائے باہر کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

"آئے ہائے رضیہ، بات تو سنو۔" مسز شیخ تڑپ کر اس کے پیچھے لپکیں، انہیں معلوم تھا کہ گندی رضیہ کا گزارا مسز شیخ کے بغیر ہو سکتا ہے لیکن خود مسز شیخ کا گزارا ان گندے مندے لوگوں کے بغیر ممکن نہ تھا آخر کو دوسروں کا گند سمیٹنے کا حوصلہ ہر کسی میں کہاں اور خود پہ صفائی ستھرائی کا لیبل لگانے والی مسز شیخ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اپنے صاف ستھرے گھر کو کوڑے کرکٹ کے ڈھیر میں منتقل ہوتے دیکھ سکیں۔

☆☆☆

سلگتے خواب روشنی آنکھیں

مصباح نوشین

گلاس وال کے شیشے پر گرتے بارش کے شبنمی قطرے سیاہ رات میں پڑتی روشنی میں ہیرے کی مانند چمک رہے تھے وہ کافی کا مگ اٹھا کر گلاس وال کے سامنے آ کھڑی ہوئی نیچے تارکول کی سیاہ سڑک اور رات آہستہ آہستہ بھیگ رہی تھی ساتھ ہی ارمانوں سے سلگتا ہوا اس کا دل بھی وہ شش وپنج کی کیفیت میں گھری فیصلے کی پل صراط پہ کھڑی تھی، لمحہ بہ لمحہ اس کا دل سکڑ کر پھیل رہا تھا وہ جو بھی فیصلہ کرتی دونوں صورتوں میں موت واضح دکھائی دے رہی تھی۔

بارش باہر آہستہ آہستہ تھم رہی تھی، اس نے کافی کا خالی مگ سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور دروازے کی طرف بڑھی، سیاہ شلوار سوٹ میں براؤن شال کے ساتھ وہ لندن کی جما دینے والی سردی میں باہر نکل آئی تھی، اس کے اندر بھڑکتی آگ پر خون جما دینے والی یخ ہوا کا تھپڑا پھوار بن کے برسا تھا اس نے آنکھیں بند کرتے اس ہوا کی نرماہٹ کو اپنے وجود پر محسوس کیا اور ایک گہری سانس لی بارش اب مکمل طور پر تھم چکی تھی وہ سیاہ تارکول کی بھیگی سڑک پر آگے بڑھ آئی سیاہ تارکول پر پڑتے باریک اسٹریپس والے سینڈل میں مقید اس کے سفید پیروں کی انگلیاں ہولے ہولے سردی کی وجہ سے سن پڑتے سرخ ہو رہی تھیں مگر وہ اس سب سے بے نیاز آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی، وہ یقیناً ہوش میں نہیں تھی کیونکہ کوئی بھی ذی ہوش لندن کی بارش میں یوں بغیر کسی احتیاط کے نہیں چل سکتا تھا، مگر اسے مطلق پرواہ نہیں تھی، اس کے اندر سے صرف ایک احساس باقی رہ گیا تھا باقی سب احساسات مر گئے تھے، وہ فیصلے کی رات تھی جو اس پہ عذاب بن کے اتری تھی۔

☆☆☆

وہ دن اس کی زندگی میں سہانا پن لے کر آیا

مکمل ناول

تھا مگر وہی دن اس کی قسمت بھی سیاہ کر گیا تھا ریڈ قمیض سفید ٹراوزر میں ریڈ اسکارف گلے میں اپنے بلو ڈرائی کیے بالوں میں ہاتھ پھیرتی وہ ریسپشنٹ کے پاس بینک منیجر کے آفس کا پتہ پوچھنے آئی تھی، ریسپشنٹ نے اسے دیکھتے ہی ایک خیر مقدمی مسکراہٹ چہرے پر سجالی، وہ ایک جانی مانی شخصیت تھی اور اکثر ہی ان کے بینک میں آتی رہتی تھی۔

"ہائے میم...... گڈ آفٹر نون۔" اس کے نزدیک آنے پر ریسپشنٹ نے خوش دلی سے خوشبوئیں بکھیرتے اس کے وجود سے متاثر ہوتے کہا تھا امبر محمود نے منہ میں ہی بڑبڑا کے ہائے بولا۔

"بینک منیجر چھٹی سے لوٹ آئے کیا؟" اپنے ریبون گلاسز کو آنکھوں سے اٹھا کر بالوں پر رکھتے اس نے پورے آفس کا طائرانہ جائزہ لیتے سوال کیا۔

"یس میم۔" ریسپشنٹ فوراً ہی مؤدب ہوئی۔

"یہاں سے رائٹ کوریڈور میں دوسرا آفس ان کا ہی ہے آپ جائیں میں انہیں انفارم کر دیتی ہوں۔" ریسپشنٹ کی آدھی ادھوری بات سنتی وہ کوریڈور میں واپس مڑ گئی ریسپشنٹ نے کندھے اچکا کر جلدی سے انٹرکام کا ریسور اٹھایا۔

"یس کم ان۔" فائلوں میں مصروف سے انداز میں سر دیے اس نے دروازے پر ناک کرنے والے کو اندر آنے کی اجازت دی امبر محمود ہائی ہیل کی ٹک ٹک کرتے اندر داخل ہوئی تبھی ارمان اسد نے سر اٹھا کر دیکھا تھا اور امبر محمود کو اس سے اس کی بھوری آنکھوں میں پوری کائنات دھڑکتی محسوس ہوئی تھی۔

"ٹیک یور آسیٹ پلیز۔" چند لمحوں کے بعد ارمان اسد نے اس کی حیرت کو نظر انداز کرتے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا امبر ایک گہری سانس بھر کے خود کو کمپوز کرتے اس کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"یس میم! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔" بے حد شستہ لب و لہجے میں اس کے استفسار پر امبر نے اپنی جان فنا ہوتی محسوس کی تھی اتنا خوبصورت لب و لہجہ آج سے پہلے اس کی سماعتوں سے گزرا کہاں تھا، وہ مسحور ہوئے بنا رہ نہ سکی۔

"آپ کے بینک نے میرا اکاؤنٹ فریز کر دیا بغیر کوئی نوٹس بھیجے، بینک کے ایم ڈی کا کہنا ہے کہ ایسا آپ نے کیا ہے، وجہ پوچھ سکتی ہوں؟" اگلے ہی لمحے خود کو سنبھالتے اس نے اپنے ازلی اعتماد سے فارمل گفتگو شروع کر دی تھی۔

"اٹس اوکے میم! آپ تھوڑا ویٹ کریں میں ابھی چیک کر لیتا ہوں۔" اس نے فوراً ہی سامنے رکھے لیپ ٹاپ پر کچھ سرچ کرنا شروع کر دیا تھا، چند ہی لمحوں میں اس کے سامنے پوری ڈی ٹیل آ گئی تھی، امبر محمود، اس شہر کے سب سے نامور بزنس مین محمود ربانی کی اکلوتی بیٹی جس کے پرسنل اکاؤنٹ کی تعداد کم از کم انہی کے بینک میں تین سے زیادہ تھی، ارمان اسد نے ایک نظر اسے دیکھا وہ چیونگم چباتے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"آپ چائے لیں گی یا کافی۔" لیپ ٹاپ کی اسکرین سے نظر اٹھا کر اس نے جلدی سے پوچھا تھا، ایک نامور بزنس مین اور ان کے بینک کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھنے والے شخص کی بیٹی اس کے سامنے بیٹھی تھی اور وہ اسے لائٹلی تو ہر گز نہیں لے سکتا تھا، سو آداب میزبانی تو بنتی تھی۔

"کافی۔" خلاف توقع اس نے فوراً ہی اپنی پسند اس پر واضح کر دی تھی اس نے انٹرکام پر کافی کا آڈر دیا اور دوبارہ سے لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گیا پانچ منٹ بعد پیون کافی لے کر اندر آ گیا تھا اور اس نے بھی مطلوبہ ساری ڈی ٹیل لیپ ٹاپ سے ہائر کر لی تھی۔

"آپ کا اکاؤنٹ ہم نے کلوزنگ کے دوران کچھ عرصے کے لئے فریز کیا ہے میم۔" کافی کا کپ اٹھا کر اس کا سپ لیتے اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"وجہ۔" یک لفظی استفسار کرتے اس نے ارمان اسد کو گہری نگاہوں سے دیکھا۔

"ہماری آفیشلی کچھ مجبوریاں تھیں میم ہم ایک ہی شخص کے تین سے زیادہ اکاؤنٹ نہیں کھول سکتے تھے جبکہ آپ کے پیرنٹس کے اکاؤنٹ بھی ہمارے پاس ہی ہیں۔"

"کلوزنگ تو جون کے مہینے میں ہوتی ہے پھر آپ نے دسمبر میں میرا اکاؤنٹ کیوں کلوز کیا؟" ارمان اسد اس کی معلومات پر دل ہی دل میں متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکا تھا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں میم، مگر ہم کچھ اکاؤنٹس کو ری سیٹ کر رہے تھے جس کے لئے ہمیں دسمبر میں کلوزنگ کا کام کرنا پڑا آپ تو جانتی ہیں کہ ہمارا بینک اس شہر کی سب سے بڑی برانچ کا ہیڈ آفس بھی ہے سو اس طرح تھوڑی بہت گڑبڑ ہماری تمام تر کوششوں اور ہارڈ ورک کے باوجود بھی ہو جاتی ہے اور یقین کریں ہمیں خود بھی بہت دکھ ہوتا ہے جب ہمارے کسٹمرز کو کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو......؟" ارمان اسد نے اس کے خوبصورت چہرے پر نگاہ جماتے پوری سچائی سے کہا تھا امبر اس کی وضاحت پر سر ہلا کے رہ گئی۔

"کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ آپ میرے باقی دو اکاؤنٹس فریز کر کے اس ایک کو ایکٹو کر دیں گے۔"

"جی ہو تو سکتا ہے مگر آپ اگر برا نہ مانیں تو مجھے اس کی وجہ بتا سکتی ہیں؟" ارمان اسد کو تجسس ہوا تبھی پوچھے بنا رہ نہ سکا تھا اس کے سوال پر وہ دھیمے سے مسکرائی سفید آبدار موتی، گلابی ہونٹوں کی باڑ کے پیچھے جھلملا رہے تھے، اس کی مسکراہٹ اس سے زیادہ حسین تھی ارمان اسد کو اعتراف کرنا پڑا تھا۔

"ایکچوئیلی میں ایک این جی او کو اسپورٹ کر رہی ہوں اور اس این جی او کو منتھلی ڈپازٹ میرے اسی اکاؤنٹ سے ٹرانسفر ہوتا تھا جو آپ نے فریز کر دیا سو اسی لئے مجھے تھوڑی پرابلم ہو رہی تھی ان فیکٹ مجھے تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا مگر انہیں ضرور مشکل پیش آ رہی ہے۔" ارمان اسد اس برگر فیملی کی جذبہ خیر سگالی اور غریبوں کی محبت میں چور لڑکی کو دیکھ کر متاثر ہو کر رہ گیا۔

"خدا حسن دے تو نزاکت آ ہی جایا کرتی ہے۔" اس نے کلس کر سوچا۔

"کس این جی او سے آپ کا منسلک ہیں میم۔" ارمان اسد کی ساری دلچسپی لمحوں میں عود کر آئی تھی۔

"الخوشی فاؤنڈیشن، ان کا کام غریب اور نادار بچیوں کو فری تعلیمی سہولیات مہیا کرنے کے علاوہ منتھلی راشن بھیجنا ہے اور اس کے علاوہ وہ ان ماں باپ کی مدد بھی کرتے ہیں جن کی بیٹیاں صرف جہیز نہ ہونے کی وجہ سے ان کی دہلیز پہ بیٹھی بوڑھی ہو جاتی ہیں۔" اس کے لہجے میں محسوس کیے جانے والا دکھ تھا ارمان اسد متاثر نظر آنے لگا۔

”یہ تو ہر دوسرے گھر کی کہانی ہے میم۔“ اس کے لہجے میں بھی تاسف گھل گیا۔

”لیکن اگر ہم عہد کریں تو یہ کہانی ہر گھر سے مٹ سکتی ہے خوشحالی سکون اور خوشی کے پھول ہر گھر میں مہکتے آئیں گے۔“ بیگ اٹھا کے کاندھے پر رکھتے اس نے ارمان اسد پر آخری نگاہ ڈالی۔

”میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں میم، سچ تو یہ ہے کہ میں آپ سے مل کر بہت متاثر ہوا ہوں۔“ سیٹ سے اٹھ کر اس نے اسے الوداع کہتے اپنے دل کی بات بتائی تھی وہ صرف مسکرا دی۔

☆☆☆

اس نے ابھی ابھی شاور لیا تھا آفس سے آنے کے بعد تھکان ہی اتنی ہو جاتی تھی کہ جب تک وہ نہا نہ لیتا تھکان اترنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی سارا دن آفس میں سر کھپانے کے بعد ٹریفک کا اژدھام عبور کر کے آنا سارا سال ہی جوئے شیر لانے کے مترادف رہتا تھا، اس نے تولیے سے اپنے گیلے بال رگڑ کر آنکھوں میں دوڑتے سرخ ڈوروں کو آئینے میں دیکھا اور یکا یک مسکرا دیا، امبر محمود کی خود پہ جمی نگاہیں پل کے پل میں اس کے ذہن کے پردے پر نمودار ہو کر اسے مسکرانے پر مجبور کر گئی تھیں، شدید خواہش کے باوجود بھی وہ اس سے پوچھ نہیں پایا تھا کہ وہ اسے دیکھ کے چونکی کیوں تھی۔

”کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ اکیلے اکیلے کس بات پر مسکرایا جا رہا ہے؟“ ارمان نے چونک کر دیکھا اشنہ دروازے میں کھڑی اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی اور لہجہ طنز کی گہری کاٹ لئے ہوا تھا۔

”اب کیا میرے مسکرانے پر بھی پابندی ہے؟“ ارمان کو اس کی بے جا مداخلت ایک آنکھ نہیں بھائی تھی تبھی ترخ اٹھا تھا، اشنہ اس کی منگیتر اور تایا زاد تھی جتنی محبت کرتی تھی اس سے بڑھ کے شک۔

”میں نے کب ایسا کہا، مگر ایک بات ہے تو جب سے بڑی برانچ میں ٹرانسفر ہو کے گیا ہے ناں مجھے بھولتے جا رہے ہو۔“ شکوہ زبان پہ آتے بس لمحہ لگا تھا ارمان اسے دیکھتے مسکرایا اور اشنہ کی تو گویا دل کی دنیا ہی لٹ گئی اندرون شہر میں رہنے والے اس گھر کے بھی مکین سبزی منڈی میں کھولی دکان پر ہی کام کرتے تھے ارمان واحد تھا جو ایم بی اے کر کے بینک کی نوکری تک پہنچا تھا اور یہاں تک پہنچنے کے لئے اس نے کیا کیا نہیں کیا ہوگا اس کا اندازہ لگانا کسی بھی معاشرے میں بسنے والے انسان کے لئے مشکل ہرگز نہیں ہے۔

”مذاق اڑاتا ہے میری محبت کا، تیرے پیچھے خوار جو رہتی ہوں۔“ اشنہ جھوٹ موٹ اس کی مسکراہٹ سے خائف ہوتے بظاہر ناراضگی ہو بولی تھی۔

”یا سچ بتا، کوئی اور وجہ ہے؟“ وہ بدگمان تھی ارمان دل کھول کے ہنسا۔

”تیری بدگمانی کی کوئی حد بھی ہے کہ نہیں؟“ اشنہ اس کے سوال پر دو قدم اندر کمرے میں بڑھ آئی۔

”حد تو ہے، پر تو مانتا ہی نہیں۔“ وارفتگی مناتے انداز میں وہ دعوت نظارہ بنی اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

”اچھا، تو پھر بتاؤ کیا حد ہے تمہاری؟“ وہ بھی شریر ہوا مرد کو تو ویسے بھی ایسی عورت لبھاتی ہے جو اس پر فدا ہو نثار ہو اور ارمان تو اس گھر کا لائق ذہن و فطین لڑکا تھا سارے گھر کی نگاہوں کا تارا، سب کی امیدوں کا مرکز، سب گھر والے اسے غیر معمولی اہمیت دیتے تھے اور وہ اپنے لئے اپنی خوشی کے لئے کچھ بھی کر سکتا تھا کروا سکتا تھا۔

”شادی کر لے مجھ سے؟“ وہ تھوڑا اور قریب ہوئی۔

”قسم سے ساری بدگمانی آپوں آپ ہی ڈھل جائے گی قتل کر دینا اگر کبھی دوبارہ تجھ پہ شک بھی کیا تو؟“ وہ کندھے سے آ لگی ارمان نے ناپسندیدگی سے پرے ہٹایا۔

”تھرڈ کلاس موویز دیکھنی کب بند کرو گی، قسم سے بہت چیپ ایکٹنگ کرتی ہو۔“ ارمان اس کا سارا جوش و خروش پانی میں ملاتے بظاہر سنجیدگی سے بولا تھا اشنہ منہ بنا کے رہ گئی۔

”میرے سارے موڈ کا ناس مار دیا تو نے۔“ اشنہ نے غصے سے اسے پرے دھکیلا۔

”ہر وقت شادی شادی کا راگ مت الاپا کر، پرائیویٹ بی اے کرو تعلیم بہت اہم چیز ہے آگے بڑھنے کے لئے۔“ اشنہ کان کھجاتی باہر کو لپکی یہ بات ہمیشہ ہی اسے رفو چکر ہونے پر مجبور کرتی تھی۔

”ہاں تو ٹھیک ہے ناں، شادی کے بعد پڑھاتے رہنا خود ہی۔“ دروازے میں کھڑے ہو کے ایک آخری بات اس نے کرنا ضروری سمجھی تھی ارمان اسے مارنے لپکا تھا مگر اس نے بھاگنے میں ذرا دیری نہیں دکھائی تھی۔

☆☆☆

اگلے تین روز میں اس نے سارے معاملات دیکھتے امبر محمود کا اکاؤنٹ ایکٹیویٹ کر دیا تھا، جس روز اس کا کام ختم ہوا اسی رات وہ چھت پر لیٹا مچھروں سے نبرد آزما ہونے کی کوششوں میں تھا جبھی اس کے نمبر پر ایک میسج آیا تھا اس نے نمبر اٹھا کے دیکھا ان نون نمبر تھا۔

”اگر آپ بزی نہیں تو کیا میں آپ کو کال کر سکتی ہوں ارمان، مجھے کوئی ضروری بات کرنی ہے آپ سے؟“ اس پیغام کے ساتھ ہی نیچے امبر محمود کا نام لکھا تھا۔

اس پیغام کو پڑھتے ہی اس نے فوراً اس نمبر پہ بیک کال کی تھی مگر دوسری جانب کمپیوٹر پر چلتی ریکارڈنگ جو اسے کریڈٹ ری چارج کرنے کا مشورہ دے رہی تھی سنتے اس کا دل اپنے بال نوچنے کو چاہنے لگا تھا۔

”شٹ۔“ زیر لب گالیاں دیتے اس نے ”وائے ناٹ شیور“ لکھ کر میسج سینڈ کیا تھا یہ بھی شکر تھا کہ وہ میسجز کا پیکج لے لیا کرتا تھا، میسج سینٹ ہونے کے چند لمحوں بعد ہی اسی نمبر سے کال آنے لگی ارمان نے گلا کھنکار کر کال ریسو کرتے ہی سلام کیا تھا۔

”وعلیکم السلام ارمان، کیسے ہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا میں نے آپ کو۔“ دوسری جانب وہ بڑی شائستگی سے دھیمے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

”بالکل بھی نہیں، بلکہ میں تو کافی بور ہو رہا تھا۔“ جانے کیسے بے ساختگی میں اس کے منہ سے پھسل گیا، بول کے شرمندہ بھی ہوا نجانے امیر زادی برا مان جائے۔

”اچھا اس کا مطلب ہے کہ مجھے شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ ہولے سے مسکرائی۔

”بالکل بھی نہیں۔“ وہ چارپائی سے اٹھ کے منڈیر پر آ کھڑا ہوا، جہاں سے نیچے تنگ گلیوں والا اونچا محلہ زرد بلب کی روشنی میں زرد پژمردہ سا محسوس ہو رہا تھا۔

”ایکچوئیلی، مجھے آپ کو تھینکس کہنا تھا؟“ امبر نے لب دانتوں تلے کچلتے اپنی کال کی وضاحت کی۔

"تھینکس فار واٹ؟" وہ بچ میں نہیں سمجھا
کیا؟

"آپ نے میرا اکاؤنٹ ایکٹویٹ کر دیا اتنی جلدی، حالانکہ میں جانتی ہوں کہ یہ اتنا آسان نہیں ہوگا آپ کے لئے اور آپ نے ڈیڈ اور میرا جوائنٹ اکاؤنٹ بھی ڈی ایکٹویٹ نہیں ہونے دیا، اٹس بگ تھنک۔" ارمان نے اندرون شہر کے تنگ گلیوں والے اونچے محلے کے سر پہ سجے کشادہ اور روشن آسمان کی جانب دیکھا اور اس کی معلومات پر دل کھول کے محظوظ ہوتے دل میں ہنسا۔

"اچھا، آپ تو پھر بہت باخبر خاتون ہیں۔"

"ہاں میں اپنے سے متعلق ہر معاملے پر خبر رکھتی ہوں۔" اس نے فوراً اعتراف کیا۔

"نہیں آپ صرف اپنے معاملات پر ہی نظر نہیں رکھتیں بلکہ ان لوگوں کے بارے میں بھی رکھتی ہیں جن کو آپ جانتی تک نہیں اور بحیثیت شہری آپ کو ان لوگوں کی مشکلات کا اندازہ ہے۔" اس کے پرجوش انداز میں بولنے پر وہ برابر مسکرا رہی تھی۔

"سچ کہہ رہا ہوں، آپ کے بارے میں آپ کا اکاؤنٹ ایکٹویٹ کرنے کے دوران مجھے جاننے کا موقع ملا آپ تو آج کے دور کی مدر ٹریسا ہیں۔" وہ جوش جذبات میں کچھ زیادہ ہی بول گیا تھا۔

"ارے آپ تو بہت بڑی بات کہہ رہے ہیں؟" امبر نے فوراً ہی ٹوکا۔

"غلط نہیں کہہ رہا، سچ کہوں تو، پتہ نہیں مجھے یہ بات آپ کو بتانی بھی چاہیے کہ نہیں مگر اس روز آپ کی باتیں سن کے مجھے بہت حیرت ہوئی تھی، آئی مین، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک ایسی لڑکی کو غریب و نادار لوگوں کی مشکلات اور غربت سے درپیش مسائل دکھی کر سکتے ہیں جس نے آنکھ کھولتے ہی ایسا ماحول دیکھا ہو جس میں دکھ پریشانی، غربت تنگی جیسی کسی بھی مشکل کا تصور بھی نہ ہو، آپ بہت نایاب ہیں اور آپ ایسی کیوں ہیں، مجھے سمجھ نہیں آیا؟" اس کی شروع سے عادت تھی جو دل کو اچھا لگتا اسے حاصل کرنے کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جایا کرتا۔

"میں ایسی اس لئے ہوں ارمان، کیونکہ میرے ڈیڈ ایسے ہیں انہوں نے میری تربیت بے شک ہائی سوسائٹی میں رہ کر کی ہے مگر میرے اندر انہوں نے جذبہ حب الوطنی اور اپنے پاکستانی بہن بھائیوں کی مشکلات اور ان کے دکھوں کا احساس کوٹ کوٹ کر بھرا ہے میری رگ رگ میں صرف پاکستانی کیا پورے مسلمانوں کے لئے درد مندی اور احساس کا جذبہ ہے اور میں عام مسائل سے نبرد آزما ہر پاکستانی فرد کی طرح کڑھتی بھی ہوں۔"

"اسی لئے تو میں نے کہا نا کہ آپ مدر ٹریسا ہیں آج کے دور کی۔" ارمان اپنا قیافہ سچ ہو جانے پر بے اختیار خوش ہوا اور جتائے بغیر رہ نہیں سکا۔

"خیر کاش کہ میں ان جیسی بن پاؤں مگر یہ تو بہت بڑا کامپلیمنٹ ہے میرے لئے، ہاں نرم دل بہت ہوں میرے سے کسی کا دکھ دیکھا اور سہا نہیں جاتا۔" اس نے سادگی سے اعتراف کرتے ارمان اسد کو چونکایا تھا، اس روز انہوں نے طویل بات کی تھی دوبارہ جلد ہی رابطہ کرنے کے وعدے کے ساتھ، کہانی کا آغاز ہو چکا تھا۔

☆☆☆

"کہاں گم ہیں مدر ٹریسا۔"

اگلے ہی دن آفس میں ذرا سی فرصت ملتے ہی اس نے فوراً ہی امبر کو کال کی تھی تکلف کی دیوار ان کے درمیان پہلے دن ہی ڈھے چکی تھی اب تو اچھی خاصی دوستی ہو چکی تھی، سو اس نے اسے کال کرنے میں ذرا سی بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی تھی۔

"کہیں بھی نہیں، فجر کی نماز کے بعد سو گئی تھی طبیعت تھوڑی مضمحل سی تھی ابھی اٹھی ہوں آپ سنائیں کیسے ہیں؟" اس نے بیڈ پہ لیٹے انگڑائی لیتے کہا تھا اسے اس کا فون کرنا اچھا لگ رہا تھا۔

"ہم تو مزدور لوگ ہیں، کام کریں گے تو روٹی ملے گی سو پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے صبح سویرے ہی گھر سے نکلنا پڑتا ہے اور اب تو آدھا دن گزر چکا ہے مادام۔" کرسی کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے اس نے شگفتگی سے کہا تو امبر بے ساختہ ہنس دی اس کی نقرئی ہنسی ارمان اسد کے دل میں جلترنگ بجا گئی تھی۔

"آپ کی ہنسی بہت خوبصورت ہے مادام۔" بے ساختہ ہی وہ کہہ گیا، وہ امبر محمود کی ذات سے اتنا متاثر ہو چکا تھا کہ اس کی ہر ادا اسے حیرت میں گنگ کر دیا کرتی تھی۔

"آپ باتیں بہت خوبصورت کرتے ہیں؟" وہ دلکشی سے بے ساختہ دوبارہ ہنسی۔

"کیوں؟ آپ کو پہلے کبھی کسی نے نہیں بتایا کہ آپ کی ہنسی آپ ہی کی طرح سے دلکش ہے؟" اس نے فوراً سے پیشتر اپنی بات کی وضاحت دی۔

"جس دنیا میں میں رہتی ہوں نا یہاں بہت نقلی لوگ رہتے ہیں کوئی بغیر کسی مطلب کے کسی کی تعریف نہیں کیا کرتا، سو مجھے اگر کوئی ایسا کہہ بھی دے تو یقین نہیں کیا کرتی۔" اس نے سادگی سے کہتے اٹھ کر کھڑکیوں سے پردے ہٹائے۔

"مگر مجھے آپ کی بات پر اعتبار ہے، اس لئے کیونکہ آپ مجھے ویسے نہیں لگتے جیسے میرے آس پاس کے لوگ ہیں۔" سورج کی الوہی کرنیں اس کے چہرے پر پڑیں۔

"لگتا ہے آپ خاصی بے زار ہیں اپنے اردگرد بسنے والے لوگوں کی عادات سے؟" وہ اسمارٹ تھا ذہین تھا بات کرنے کے فن سے واقف کس کو کس طرح سے ہینڈل کرنا ہے اسے بخوبی علم تھا۔

"نہیں بے زار تو نہیں مگر میں خود کو مس فٹ ضرور سمجھتی ہوں ان لوگوں کے درمیان، میرے اندر کوئی بہت پرانی روح گھسی ہوئی ہے شاید جو مجھے اپنی سوسائٹی کے لوگوں کے درمیان رہنے نہیں دیتی۔" اس نے سچائی سے اعتراف کیا۔

"اور مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے کہ آپ اس دنیا کی باسی نہیں اور......" اس کے خاموش ہوتے ہی وہ ترنت بولا۔

"ہاں سب یہی کہتے ہیں کہ مجھے کسی مڈل کلاس کے گھر میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کھنکتے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

اس کی بات سن کے ارمان اسد مسکرا بھی نہیں سکا، اسے لگا وہ اسے سنا رہی ہے اسے امبر کی یہ بات طمانچہ بن کے لگی تھی جو کہ غیر دانستگی میں امبر کے منہ سے نکل گئی تھی۔

"کچھ اپنے بارے میں بتائیں ارمان؟" امبر نے اس کی خاموشی کو محسوس کیے بنا فوراً ہی اگلا سوال داغا، ارمان اسد گڑبڑا گیا بھلا وہ اسے اپنے بارے میں کیا بتائے اس کے پاس تو کوئی ایسا قابل ذکر اور قابل فخر بیک گراؤنڈ نہیں ہے اور کیا وہ اسے یہ بتا پائے گا کہ اس کا باپ اور پانچ بھائی اندرون شہر کی سب سے قدیم سبزی منڈی میں سارا دن سبزیوں کا بھاؤ تاؤ کرتے ہیں اس کا سارا خاندان ہی کم و بیش اسی طرح کی

معمولی محنت مزدوری والے کام کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں اور صرف وہی ہے جو پورے خاندان سے بغاوت کر کے اور خود غرضی سے دوسروں کا حق کھا کے اس مقام تک پہنچا ہے......؟ اس کا اندر کا احساس کمتری کا مارا انسان فوراً جاگا۔

"میرے پاس ایسا کچھ خاص نہیں بتانے کو اپنے بارے میں، سوائے اس کے کہ میں ایک سلیف میڈ بندہ ہوں اور زندگی میں بہت محنت کرنے کے بعد یہاں تک پہنچنے کے قابل ہوا ہوں۔" دنیا جہان کی بے بسی دکھ اور احساس کمتری ارمان اسد کے لہجے ٹپک رہا تھا۔

اسے زندگی سے ایک ہی گلہ رہا تھا کہ اس جیسا ذہین و فطین، ہینڈسم اور اسمارٹ بندے کو ویسا بیک گراؤنڈ کیوں نہیں ملا جیسا وہ ڈیزرو کرتا ہے یہ اس کا زندگی بھر کا دکھ تھا۔

"مجھے سیلف میڈ لوگ بہت متاثر کرتے ہیں ارمان، میں ان تمام سیلف میڈ انسانوں کو سلیوٹ کرتی ہوں جو محنت و مشقت سے اتنا اونچا مقام حاصل کرتے ہیں کہ ہائی پروفائل انسان کی سوچ بھی جہاں نہیں پہنچ سکتی۔" ارمان پھیکے سے انداز سے مسکرایا۔

"چلیں شکر ہے کہ کوئی تو ہے اس دنیا میں جو ہماری محنت کا قدر دان ہے ورنہ تو ہم جیسے لوگوں کی ساری زندگی اس دکھ میں گزر جاتی ہے کہ کوئی ان کی محنت کو سراہنے والا ہی نہیں ہے۔" آخری جملہ اس نے قدرے مسکینی سے ادا کیا تھا امبر کا نقرئی قہقہہ فضا کو معطر کر گیا تھا۔

☆☆☆

"آج شام کو آپ فری ہیں ارمان؟" امبر کا میسج آیا تھا وہ فوراً ہی لپک کر ان باکس کھول کے پڑھنے لگا سارا دن آفس میں سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی تھی اہم سے اہم فون کال کو وہ لوگ سن بھی نہیں سکتے تھے، پرائیویٹ بینک اگر تنخواہ زیادہ دیتے تھے تو کام بھی دہرا کرواتے تھے تنخواہ میں لی جانے والی اچھی خاصی رقم صرف مہینے کی پہلی تاریخ کو ہی خوشی دیتی باقی پورا مہینہ ارمان اسد کا دل خود پر لعنت بھیجتے ہوئے گزرتا تھا، تنخواہ کا چوتھائی حصہ وہ گھر کے خرچے کے لئے دیا کرتا باقی کے تین حصے وہ پرسنل اکاؤنٹ میں جمع کروا دیتا، وہ اپنے لئے جمع کر رہا تھا کیونکہ اس نے زندگی میں محنت و مشقت صرف اپنے لئے کی تھی اور اسے ہمیشہ یہاں رہنا بھی نہیں تھا کیونکہ یہاں رہ کر وہ صرف کھینچ تان کر ہی گزارہ کر سکتا تھا ڈھیر ساری دولت نہیں کما سکتا تھا، ہاں مگر اب اسے اپنے سپنوں کی رانی نظر آنے لگی تھی۔

"فری نہیں تو ہو جاؤں گا میری لکشمی دیوی۔" میسج پڑھتے ہی اس کے چہرے پر بڑی کمینی سی مسکراہٹ مچلنے لگی تھی اس نے لبوں میں مسکراہٹ دبوچے میسج لکھا۔

"جی بس تھوڑی دیر میں، خیریت؟" میسج سینڈ کر کے وہ اگلے میسج کا انتظار کرنے لگا۔

"مجھے تھوڑی سی شاپنگ کرنی تھی اگر آپ فری ہیں تو اکٹھے چلیں گے؟" میسج پڑھتے ہی ارمان نے منٹوں میں حساب لگایا وہ آج کوئی ایسا خاص مصروف نہیں تھا اس نے فوراً ہی حامی بھرتے اوکے لکھ کے بھیجا تھا۔

"تھینکس، آپ آفس میں ہی میرا ویٹ کریں میں بس آدھے گھنٹے میں پہنچتی ہوں۔" اگلے آدھے گھنٹے میں وہ واقعی میں وہاں پہنچ چکی تھی، اس نے سرخ اناری رنگ کی لانگ شرٹ کے ساتھ ہمرنگ چوڑی دار پاجامہ پہن رکھا تھا ساتھ تین گز کا لمبا پیور شیفون کا دوپٹہ لبوں پر اناری سرخ رنگ کی لپ اسٹک اور آنکھوں میں

گہری کاجل کی باریک تہہ، اتنے سے میک اپ میں ہی وہ غضب ڈھا رہی تھی کیونکہ وہ قیامت تھی جو سادگی میں بھی قیامت ہی دکھتی ہے قیامت ہی ڈھاتی ہے۔

گاڑی وہ خود ڈرائیو کر رہی تھی اس کے سفید لمبی انگلیوں میں زمرد جڑی انگوٹھی ارمان اسد کی توجہ بار بار اپنی طرف کھینچ رہی تھی، اس کے گلابی ناخن نفاست سے تراشے ہوئے تھے کیونکس سے پاک۔

"میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا ناں ارمان، آپ سارا دن آفس میں بھی کام کرتے رہے اب تو کافی تھک چکے ہوں گے ہے ناں؟" گاڑی چلاتے وہ بہت شرمندہ شرمندہ سی کہہ رہی تھی۔

"ایسا کچھ نہیں ہے، اگر میں تھکا ہوا بھی ہوتا تب بھی آپ کے لئے وقت نکال لیتا اور مجھے خوشی ہے کہ آپ نے اپنی شاپنگ کے لئے مجھے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔" اس کی بات پر وہ دھیمے سے رخ موڑ کر مسکرائی کچھ اس طرح کہ اس کے بائیں گال پہ دمکتا کالا تل بھی مسکرا دیا۔

"آپ بہت اچھے ہیں ارمان۔" وہ دل کی بات بتا رہی تھی پھر وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

"اصل میں کل میرا برتھ ڈے ہے اور میں کچھ شاپنگ کرنا چاہ رہی تھی ان لوگوں کے لئے جن کے ساتھ میں اپنا برتھ ڈے سیلبریٹ کرتی ہوں۔"

"اوہ۔" ارمان نے اسے دیکھتے لب سکوڑے وہ انہاک سے ڈرائیونگ میں مصروف تھی۔

"یہ سب آپ کس کے لئے خرید رہی ہیں۔" بچوں کے ملبوسات کی دکان میں دھڑا دھڑا ڈھیروں ریڈی میڈز فراکیں اور نیکر شرٹس خریدتے دیکھ کر وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

"میں اپنا برتھ ڈے ہمیشہ ایدھی سینٹر میں مقیم یتیم بچوں کے ساتھ گزارتی ہوں اور یہ چیزیں بس انہی کے لئے خرید رہی تھی۔" اس کی بات سن کے ارمان اسد کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا تھا کوئی اتنا شفاف کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ امبر محمود جیسی ہائی فائی لڑکی اپنا برتھ ڈے اس طرح گزار سکتی ہے وہ تو کسی پارٹی کلب میں ایک گرینڈ فنکشن کا تصور کیے ہوئے تھا جس میں شہر بھر کی کریم انواع واقسام کی قیمتی گاڑیوں سے اترتے قیمتی ملبوسات میں ملبوس خوشبوئیں بکھیرتے ادھر سے ادھر ہاتھوں میں جام کے پیالے لئے ناز و ادا سے پھر رہے ہوں گے۔

"اس کا مطلب ہے آپ اپنے مام ڈیڈ کے ساتھ یہ خاص دن نہیں گزاریں گی۔" وہ اپنی حیرت کو چھپائے بے حد نارمل سے انداز میں کہہ رہا تھا۔

"نہیں شام کو مام ڈیڈ ایک چھوٹی سی پارٹی ارینج کرتے ہیں جن میں ہم صرف گھر والے ہی ہوتے ہیں۔" اس کی وضاحت پر ارمان کو کم از کم بہت مایوسی ہوئی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اپنی برتھ ڈے پارٹی میں اسے بھی ضرور انوائیٹ کرے گی مگر اپنی پرسنل فیملی گیٹ ٹو گیدر میں وہ اسے ظاہری بات ہے کہ نہیں بلا سکتی تھی ابھی وہ اتنا پرسنل کہاں ہوا تھا۔

"اگر کل کا دن آپ آفس سے چھٹی کر سکیں تو ہم اکٹھے ساتھ چلتے ہیں ایدھی سینٹر۔"

"ایسی۔" آفر پر ارمان اسد کا دل خود پر تین نہیں سات حرف بھیجنے کو چاہا تھا وہ کیوں جانے ان گندے مندے بچوں کے درمیان سارا دن وقت برباد کرنے، اونہہ اسے غریبی سے

تھی اور امراء کے لئے ایسے چونچلوں سے بے پناہ چڑ اور وہ کسی بھی قیمت پر اپنے بچپن کی جھلک ان ... تے ہوئے بچوں کے وجود میں نہ دیکھ سکتا تھا نہ ہی برداشت کر سکتا تھا۔

"تو کیا میں امید رکھوں کہ آپ آئیں گے۔" وہ کاؤنٹر پر اپنا کریڈٹ کارڈ پکڑاتے آس سے پوچھ رہی تھی، ارمان اسد کے پاس اس سے زیادہ خاص موقع امبر محمود کے پاس ہونے کا ہو ہی نہیں سکتا تھا مگر وہ مجبور تھا وہ حامی نہیں بھر سکتا تھا وہ زندگی میں پیچھے مڑ کر نہ دیکھنے والے اصول سے انحراف نہیں کر سکتا تھا تبھی بولا تو بہت تول کے۔

"کل تو مشکل ہوگا کل برانچ کے ایگزیکٹو کے ساتھ ایک میٹنگ ہے تمام سٹاف کا ہونا ضروری ہے ہاں پھر کسی روز...... مجھے خود بہت افسوس ہے کہ اتنی اچھی آفر مسترد کرنا پڑ رہی ہے۔" ارمان اسد نے منہ لٹکاتے بڑے دکھ سے کہا۔

"اٹس اوکے۔" امبر محمود نے بھی دلگرفتگی سے جواب دیا تھا۔

☆☆☆

چاندنی رات کا چاند اپنے جوبن پر تھا اور اسی شہر کے آسمان پر بجے اس مغرور چاند کی نگاہوں کا مرکز دو لوگ تھے جو بیک وقت اس پر اپنی نگاہیں مرکوز کیے اس کے وجود میں کسی کی تشبیہ تلاش رہے تھے، امبر محمود نے اس خوبصورت کارڈ اور ساتھ آئے سرخ پھولوں کے بوکے کو بار بار ہاتھ پھیر کر ان کی نرماہٹ کو محسوس کرتے ہر دفعہ ایک نیا احساس اپنی رگ و پے میں اترتا محسوس کیا وہ پھول اور خوبصورت کارڈ اس کی سالگرہ کے تحفے ارمان اسد نے بھیجے تھے، وہ جو سب سے الگ تھا سب سے جدا اور منفرد، جو امبر محمود کو پہلی نظر میں ہی بے حد بھا گیا تھا اس نے اپنی نگاہیں خیرہ ہوتی اور من سیراب ہوتا محسوس کیا تھا ہوتے ہیں کچھ ایسے لوگ بھی جن سے مل کر ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں صرف انہی کا انتظار تھا ہمیں بس انہی کی تلاش تھی اور اس سے تلاش تو ختم ہو جاتی ہے مگر من سیراب نہیں ہوتا پانے کی چاہ، ساتھ کی آرزو لمحہ بہ لمحہ بے کل و بے چین کرنے لگتی ہے بھلا یہ بھی کوئی کہنے سننے کی بات ہے سب ہی محبت کرنے والے جانتے ہیں کہ محبت کرنے والے کیا محسوس کرتے ہیں محبت کا میٹھا میٹھا درد، ہلکی سی کسک۔

"تھینکس فار دا لولی فلاورز۔" مخروطی انگلیاں تیزی سے ایک جانے پہچانے نمبر پر ٹائپ کر رہی تھیں، پیغام ہوا کے سپرد کرتے ہی اس نے گہرا سانس لیا پوری فضا محبت کی الوہی خوشبو سے مہک رہی تھی۔

"شکریہ تو مجھے آپ کا ادا کرنا چاہیے کہ آپ نے انہیں قبول کر کے مجھے عزت بخشی۔" مہکتا ہوا پیغام لمحوں میں خوشبوئیں بکھیرتا اس کے قیمتی موبائل کی ایل سی ڈی پر روشن تھا امبر کو وہ الفاظ چمکتے ہوئے محسوس ہوئے اس نے سمائلی فیس ریپلائی میں سینڈ کیا۔

"کیا ہم اچھے دوست ہیں۔" کچھ دیر کے بعد سوال آیا۔

"کیا آپ کو ابھی بھی شک ہے؟" اس نے جواباً حیرت سے استفسار کیا۔

"شک، ہاں ہو جاتا ہے تھوڑا بہت جب......؟" ادھورا فقرہ ادھورا مفہوم کئی مطالب واضح کرتا ہوا ارمان اسد نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

"کب؟" یک لفظی استفسار میں ارمان اسد کی توقع کے عین مطابق بے چینی و اضطراب چھپا تھا، وہ نشانہ صحیح لگنے پر دل کھول کر ہنسا مگر سنجیدگی سے جواب لکھا۔

"جب آپ میرے ساتھ فارمیلٹیز نبھاتی ہیں۔"

"میں سمجھی نہیں۔" اسے واقعی میں سمجھ نہیں آئی تھی۔

"دوستی میں فارمیلٹیز نہیں ہوا کرتیں اور آپ بہت فارمل ہو جاتی ہیں۔" اس نے شکوہ کیا۔

"اوہ۔" اس نے سمجھ کر ہولے سے سر ہلایا۔

"میں بہت شرمندہ ہوں ارمان، بتائیے میری سزا۔" اگلے ہی لمحے وہ اپنی غلطی مانتے سزا پوچھ رہی تھی۔

"میرے ساتھ کسی بھی اچھی جگہ پر ڈنر۔" میسج سینڈ کرتے ہی اس نے لب دانتوں تلے دبوچے اتنی جلدی ایسی آفر جب دوستی کو ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے تھے، پتا نہیں وہ اپنی جلد بازی کے ہاتھوں ڈوبے گا یا کامیاب ہوگا یہ سب اس کی جلد باز فطرت نے کبھی بھی نہیں سوچا تھا اس کا ذہن لمحوں میں حساب کتاب کرتے نفع و نقصان کا اندازہ لگا لیا کرتا تھا اگر مطلوبہ نتائج بروقت نہ ملتے تو اس کا یہ مطلب وہ ہرگز بھی نہیں سمجھتا تھا کہ اگلے آئیڈیے پر محنت اور کام نہیں کرنا چاہیے وہ ہار نہیں مانتا تھا، اس کی سزا سن کے امبر محمود کا قہقہہ چاندنی رات کی ٹھنڈک میں موتیوں کی مانند بکھر گیا۔

"اتنی سی بات۔" سمائلی فیس کے ساتھ سوال آیا تھا۔

"کل ملتے ہیں۔" ساتھ ہی دوسرا میسج آیا تھا ارمان اسد نے اپنے اردگرد ہیرے کی کنیاں بکھرتے چمکتے محسوس کی تھیں۔

☆☆☆

"کہاں جانے کی تیاری ہے شہزادے، بڑا ٹائم لگا کے بن ٹھن رہا ہے؟" وہ بڑے انہماک سے خود پر پرفیوم بکھیر رہا تھا، نیا تھری پیس ٹوٹ میں ملبوس بالوں میں جیل لگائے وہ بے حد وجیہہ نظر آ رہا تھا اشنہ نے دل نے اسے دیکھتے ہی ایک بیٹ مس کی، ہمیشہ کی طرح اس نے اپنا آپ لٹتا محسوس کیا تھا شہزادہ اس کا پیار کا نام تھا مگر اشنہ صرف چڑانے کو لگا لیتی تھی اس وقت بھی ارمان اسد نے ایک قہر بھری نگاہ اس پر ڈالی۔

"یہ تو کیا ہر وقت میرے پہ تھانیداری لگی ہوئی ہے، میں جس وقت جہاں جاؤں آؤں میری مرضی، کسی کو بتانے کا پابند ہرگز بھی نہیں ہوں۔" لہجہ سخت، نگاہ کڑی مگر پرواہ کسے تھی۔

"ہائے۔" اس نے فدا ہو جانے والے انداز میں دروازے سے سر ٹکایا۔

"ایسی کافر ادا پہ کون نہ مر جائے میرے خدا۔" میٹرک پاس گہرے رنگوں کے لباس پہننے والی اشنہ اسے آج سے پہلے شاید ہی اتنی بری لگی ہو جتنی اس وقت لگ رہی تھی۔

"تو جائے گی یہاں سے کہ لگاؤں ایک۔" وہ تیاری مکمل کر چکا تھا لمحہ کی تاخیر کیے بغیر اس کی جانب پلٹا۔

"ایک دفعہ ہاں کر دے پھر بے شک صبح شام مارے لینا اف بھی کر جاؤں تو نام بدل دینا۔" وہی انداز جس سے عامیانہ پن جھلکتا تو نہیں تھا ہو محسوس ضرور ہوتا تھا اور امبر محمود کی شائستہ اور شستہ انداز گفتگو کے بعد تو اب کھلنے لگا تھا۔

"چلی جا یہاں سے ورنہ قتل ہو جائے گی میرے ہاتھوں۔" وہ بیچ میں مارنے کو لپکا تبھی وہ چھپاک سے نیچے زینے کی طرف بھاگی ارمان

اس کے پیچھے تھا آگے پیچھے زینے پھلانگتے اشنہ کی کھنکتی ہنسی کی چہکار سارے گھر میں پھیلی تھی تایا تائی سمیت ارمان کے والدین نے بھی اس نوک جھونک کو دیکھتے مسکراتے ہوئے اشاروں ہی اشاروں میں ایک دوسرے کو کچھ کہا تھا اس سے پہلے کہ وہ لوگ انہی سوچوں کو زبان دیتے ارمان ان کے قریب چلا آیا تھا اشنہ سے بدلہ لینے کا ارادہ فی الحال اس نے ملتوی کر دیا تھا وہ لیٹ ہو رہا تھا۔

''السلام علیکم اماں!'' ارمان نے ماں کے سامنے سر جھکایا وہ جب بھی آفس یا اس کے علاوہ کہیں جانے لگتا ہمیشہ ماں سے مل کے جاتا ماں کی اس کی زندگی میں ایک خاص اہمیت تھی اور ارمان اعتراف کرتا تھا کہ اس کی ماں نے کس طرح سے بچت کر کر کے اس کی فیس بھری تھیں تب تک جب تک وہ خود ٹیوشن پڑھانے کے قابل نہیں ہو گیا، ایسا نہیں تھا کہ باقی سب اس کے شوق اور لگن کے مخالف تھے بلکہ وسائل کی کمی انہیں ارمان اسد کی خواہش کو پوری کرنے میں مدد تو دور تھپکی دے کر ہمت بندھانے سے بھی روکے رکھتی تھی اور ارمان بھی یہ بات جانتا تھا پر سمجھتا نہیں تھا۔

''وعلیکم السلام! جیتا رہ کہیں جا رہا ہے کیا؟'' آیت الکرسی پڑھ کے پھونک مارتے انہوں نے ارمان کا ماتھا چومتے پوچھا تو ارمان ہولے سے مسکرا دیا۔

''جی اماں ایک بہت اچھا دوست ہے اس کے ساتھ ڈنر پر جانا ہے، آج تھوڑا دیر سے آؤں گا۔''

''فی امان اللہ بیٹا، پھر بھی جلدی لوٹ آنا تجھے تو پتا ہے تیرے نہ آنے تک میں ہولتی ہی رہتی ہوں۔'' اماں کی بات پر ارمان ہنسا۔

''اماں آج کل تو لڑکیاں گھر سے آدھی آدھی رات تک اکیلی باہر رہتی ہیں، آپ میری وجہ سے پریشان رہتی ہیں۔'' وہ حیران ہوا۔

''وہ اور ماں باپ ہوتے ہیں جو اپنے بچوں کو اتنی آزادی دیتے ہیں اور ان سے لاپروائی برتتے ہیں میں ایسا نہیں کر سکتی۔'' اماں کو برا لگا تھا یقیناً، تبھی انہوں نے تڑختے جواب دیا مگر ارمان انہیں تنگ کرنے کے موڈ میں تھا۔

''اور اگر آپ کو کوئی بہو ایسی مل گئی تو...... پھر کیا کریں گی؟'' وہ مائل بہ شرارت آنکھوں میں ہیرے کی کنیاں دمکائے سراپا سوال بنا اماں کے لئے آزمائش لئے کھڑا تھا چق کے پیچھے کھڑی اشنہ کا دل سکڑ کر پھیلا، ارمان نے ایسی مثال کیوں دی؟

''جان نکال دوں گی تیری اگر ایسا کچھ سوچا بھی۔'' وہ اسے مارنے کو لپکی ارمان ہنستا ہوا باہر نکل گیا اس کی چوڑی پشت کو تادیر اشنہ کھڑی دیکھتی رہی۔

''دوست؟'' اشنہ کے ذہن میں بھنور بننے بگڑنے لگے۔

☆☆☆

اشنہ کے دل کو پتنگے لگ گئے، وہ اتنا خوش کیوں تھا کس دوست سے ملنے گیا تھا اور اتنی تیاری کے ساتھ، خوش لباس تو وہ پہلے ہی بہت تھا اعلٰی برانڈ کے کپڑے جوتے پرفیوم استعمال میں رکھتا تھا مگر اشنہ سمجھ نہیں سکی آج اس کی تیاری میں وہ کیا خاص بات تھی جو اسے دیکھتے ہی، تشویش ہوئی تھی، کیا اس کا گنگنانا، ڈانس خود پر اسپرے کرنا، کیا، کیا، کیا وہ بال نوچنے کی حد تک جھنجلا گئی۔

''کیا پتا میرا ہی وہم ہو، ارمان ٹھیک کہتا ہے میں بہت شک کرتی ہوں؟'' اس نے خود کو

تسلی دینے کی کوشش کی مگر اور بے چین ہو گئی مگر اتنا خوش تو وہ پہلے کبھی نہیں رہا جتنا آج کل رہنے لگا ہے اور پھر ہر وقت موبائل پر فون اور میسجز، نہیں نہیں یہ یہ میرا وہم نہیں ہو سکتا اور اشنہ کا شک یقین میں اس وقت تبدیل ہوا جب وہ واپس آیا اس کی کلائی میں قیمتی راڈو تھی راڈو کا خوبصورت کیس اس نے آتے ہی ڈریسنگ ٹیبل پر پھینک دیا تھ، اشنہ نے لپک کر وہ کیس اٹھایا راڈو گھڑی کے بارے میں تو بچہ بچہ جانتا ہے کہ مہنگی گھڑی ہے اور ہر ایک کے خریدنے کے بس کی بات نہیں ہے، پھر......

''تم یہاں۔'' وہ واش روم سے فریش ہو کے نکلا تو اشنہ کو اپنے کمرے میں کھڑا پایا تھا، پورے گھر کی وہ اکلوتی لڑکی، بڑے دھڑلے کے ساتھ اس کے کمرے میں کیا کسی کے بھی کمرے میں بلا جھجک ہر وقت جا سکتی تھی اور ارمان پر تو وہ خاصا حق رکھتی تھی۔

''یہ تو خاصی مہنگی گھڑی ہے ارمان، تمہیں اتنا قیمتی تحفہ کس نے دیا؟''

''دوست نے؟'' اس نے اشنہ کے ہاتھ سے کیس لے کر گھڑی اس میں رکھ دی جو وہ نہاتے وقت بیڈ پہ رکھ کر گیا تھا۔

''خاصا امیر معلوم ہوتا ہے تمہارا دوست؟''

''ہاں ہے تو؟'' ارمان نے اس کے سوالوں کی بوچھاڑ پر ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا۔

''بچ کے رہنا شہزادے، یہ امیروں کی دوستیاں بڑا خوار کرتی ہیں۔'' اشنہ کے دل پہ گھونسا پڑا تھا تبھی لہجے کو زہر آلود ہونے سے بچا نہیں پائی تھی۔

''اچھا تجھے بڑا تجربہ ہے؟'' ارمان نے صاف اس کا مذاق اڑایا اشنہ خونخوار نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

''تجربہ نہ سہی پر ایسا دیکھا تو اکثر ہے۔'' وہ تڑخ کر جواب دیتی پلٹ گئی۔

☆☆☆

''ارمان! یہ آپ کی آنکھ کے نیچے کیا ہوا؟'' امبر کے لہجے میں گہری فکر مندی تھی۔

''یہ......؟'' ارمان نے لہجے کو حتی الامکان سرسری بنانے کی کوشش کی۔

''مچھر نے کاٹا ہے شاید۔'' منہ میں چیونگم چباتے اس نے لاپروائی سے کہتے پارک میں کھیلتے بچوں پہ نگاہ مرکوز کر دی۔

''اوہ مائی گاڈ، آپ باہر کیوں سوتے ہیں ارمان، دیکھیں تو کتنے ریش ہو گئے، اتنی حساس جگہ پہ۔'' توقع کے عین مطابق وہ اگلے ہی لمحے پریشان سی کہہ رہی تھی۔

''امبر اٹس اوکے یار تم پریشان مت ہو، مجھے عادت ہے۔'' بات کے اختتام پر جان بوجھ کے ہنسا۔

''آپ کے کمرے میں اے سی نہیں ہے کیا؟'' امبر سنجیدگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''نہیں۔''

''کیوں؟'' امبر اب بھی سنجیدہ تھی۔

''میں ایک ملازم بندہ ہوں امبر، دس افراد کو سنبھال رہا ہوں، میرے پاس ایسے چونچلوں کے لئے فضول پیسہ نہیں ہے۔'' اس نے قطعیت سے کہا۔

''مگر یہ تو ضرورت ہے کوئی چونچلہ نہیں اس میں فضول خرچی کیسی؟'' امبر کو حیرت ہوئی تھی۔

''میرے لئے اپنی ذات پہ خرچ کرنا فضول خرچی کے برابر ہے امبر، میرے لئے سب سے زیادہ اہم مجھ سے منسلک وہ لوگ ہیں جنہیں میری ضرورت ہے جو میری کمائی کے

زیادہ حقدار ہیں اور وہ لوگ میرے والدین ہیں اور تم جانتی ہو کہ میں ایک ساتھ دو دو اے سی افورڈ نہیں کر سکوں گا۔" نہایت آرام سے کہتے اس نے امبر محمود جیسی سادہ دل اور قدرے بے وقوف لڑکی کو متاثر کیا تھا وہ جانتا تھا دوسرے ہی دن دو نہیں تو ایک اے سی تو ضرور ہی اس کے کمرے میں لگ جائے گا، ویسے بھی جب سے امبر محمود اس کی زندگی میں آئی تھی اس کی تو چاندی ہو گئی تھی وہ اس کی ضروریات زندگی کی تمام چیزیں اسے بطور تحفہ دے دیا کرتی تھی، ارمان اسد اپنے لئے اب پیسے جمع کر رہا تھا تاکہ بیرون ملک جا کر سیٹل ہو سکے۔

"میں آپ کے جذبات کی قدر کرتی ہوں ارمان، ورنہ آج کل کے دور میں ایسا کون سوچتا ہے اپنے والدین کے لئے، لیکن کوئی بات نہیں ہمارے گھر کے ہر کمرے میں ایئر کنڈیشنر ہو گا، گھر کے ہر فرد کے لئے ایک الگ کمرہ اور اے سی اور ضرورت کی ہر چیز......" امبر نے مسکرا کر اسے چیئر اپ کرنا چاہا تھا جو خواہ مخواہ ہی جذباتی نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اچھا تو پھر کب ملوا رہی ہو اپنے والدین سے۔" من پسند بات اتنی جلدی سن کے وہ مغرور نہ ہوتا تو کیا کرتا۔

"میرے واپس آنے کے بعد؟" وہ دو ماہ کے لئے انگلینڈ جا رہی تھی۔

"اکیلے میرے بغیر انجوائے کرو گی کیا؟" اس نے اس کی محبت کو جانچنا چاہا تھا۔

"بالکل بھی مزہ نہیں آئے گا مگر مجبوری ہے مجھ ڈیڈ کی لندن برانچ کا کام کچھ عرصہ دیکھنا ہے چند ایک کورسز کرنے ہیں اس لئے آپ کو بتا دوں کہ میں انجوائے بالکل بھی نہیں کرنے جا رہی۔"

"ارے یاد آیا آپ کا پاسپورٹ بن گیا اسپین جانے کے لئے؟" وہ جانتی تھی کہ وہ آج کل اسپین جانے کے لئے وزٹ ویزہ حاصل کرنے کی جدوجہد میں ہے۔

"نہیں یار، غریب بندے کے لئے اس ملک میں کچھ بھی ممکن نہیں ہے، ہر بار مسترد کر دیا جاتا ہے ویزہ اب خالی پاسپورٹ کا کیا کروں؟"

"تو مجھے کہا ہوتا ارمان، میرے ڈیڈ کے بیسٹ فرینڈ ہیں ایمبیسی میں۔"

"پلیز امبر تم جانتی ہو کہ میں اپنی ضرورت کے لئے کسی سے نہیں کہہ سکتا اور پھر بن کہے تم میرے لئے اتنا کچھ کر دیتی ہو مجھے بہت شرمندگی ہوتی ہے۔" وہ شرمندہ شرمندہ سا کہہ رہا تھا، امبر نے اسے دکھ سے دیکھا۔

"میرے اور آپ کے درمیان تمہارا میرا کب سے ہونے لگا ارمان؟"

"میں جانتا ہوں امبر اور نہ ہی میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا ہے لیکن پلیز تم میری مجبوری کو سمجھا کرو، کل کو میں اس گھر کا داماد بنوں گا تو میری کیا عزت ہو گی وہاں...... اور؟" امبر محمود نے اس سے اتنے خوددار محبوب کو دیکھ کے خدا کا شکر ادا کیا تھا، ارمان اسد اسے خود سے مرعوب دیکھ کر دل ہی دل میں ہنسا۔

☆☆☆

"یہ اس دفعہ تم پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو کے نہیں آ گئیں پاکستان سے؟" شاندیل نے اسے شرارت سے دیکھتے کافی کا مگ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا وہ جھینپ ہی تو گئی۔

"ہوں...... ہوں...... ہوں؟" شاندیل نے اسے گدگدا کے ہنسنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"کون ہے وہ؟" وہ اب بظاہر سنجیدہ مگر ابھی بھی شرارت سے پوچھ رہی تھی۔

"کون...... کس کی بات کر رہی ہو؟" وہ

انجان بنی۔

"آہ...... ہا چالاکی بھی سیکھ گئیں مگر تم جتنی بھی چالاک بن جاؤ میرے سامنے کچھ نہیں چھپا سکتیں آخر کو مابدولت تمہارے بچپن کی دوست ہیں، اب سچ سچ بتاؤ، شاباش۔"

"ارمان...... ارمان اسد نام ہے اس کا۔" امبر نے آہستگی سے بتایا قوس وقزح کے سارے رنگ امبر محمود کے چہرے پر بکھرے تھے شاندیل کو وہ اس وقت دنیا کی سب سے پیاری لڑکی لگی تھی اور وہ تھی بھی بہت پیاری بہت سادہ، نرم دل، ہر کسی پر اعتبار کرنے والی، ہر بات کو سچ مان لینے والی خود سے وابستہ لوگوں پر جان نچھاور کرنے والی دوسروں کے دکھ درد کو محسوس کرنے والی۔

"واہ...... موصوف کا نام تو بہت خوبصورت ہے کرتے کیا ہیں؟" نام سنتے ہی اس کی دلچسپی بڑھ گئی تھی۔

"بینک جاب۔" امبر نے احتیاط سے کام لیا مگر شاندیل کو پھر بھی حیرت ہوئی ان کے سرکل میں سب کے اپنے اپنے بزنس تھے کوئی کہیں بھی جاب نہیں کرتا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ وہ ہمارے سرکل کا نہیں ہے؟" شاندیل نے سمجھ کر سر ہلایا اور امبر نے اس کے درست قیافے پہ۔

"اس کا فیملی بیک گراؤنڈ؟" شاندیل اب تفتیش کے موڈ میں تھی۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے شانی، محبت میں یہ سب کہاں دیکھا جاتا ہے؟" وہ جھنجھلائی۔

"محبت تو دیکھتی ہے بدھو، مگر تم نہیں دیکھتیں، بتاؤ تم مجھے اس کا اسٹیٹس کیا ہے؟"

"شانی وہ ایک سلیف میڈ بندہ ہے۔" اس نے صاف ٹالا۔

"چلو تم یہ تو بتا سکتی ہو ناں کہ وہ رہتا کہاں ہے۔" شاندیل جان گئی تھی کہ وہ اسے اس سے زیادہ کچھ نہیں بتانے والی اسی لئے اس نے ایسا پوچھا تھا۔

"اندرون شہر۔" امبر نے بے حد آہستگی سے بتایا شاندیل تو سن کے یوں اچھلی گویا بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"تم پاگل ہو امبر، جانتی ہو انکل کبھی نہیں مانیں گے۔"

"کیوں نہیں مانیں گے میری خوشی اہم ہے ان کے لئے اور پھر ارمان بہت اچھا لڑکا ہے غریب خاندان کا ہوا تو کیا ہوا میرے نزدیک ان سب کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔" اس نے صاف مکھی اڑانے والے انداز میں کہا۔

"تمہارے نزدیک نہ سہی مگر انکل کے لئے تو ہو گی پاکستان میں ہی نہیں یہاں لندن میں ان کا ایک مقام ہے عزت ہے تم اکلوتی بیٹی ہو ان کی وہ کیسے تمہیں ایک ایسے لڑکے کے ساتھ بیاہ دیں جو ایک معمولی بینک ایمپلائی ہے جس کے آگے پیچھے کوئی قابل فخر حسب نسب نہیں کہ انکل اسے اپنے سرکل میں کسی سے داماد کے طور پر ملوا سکیں۔"

"یہ رتبہ یہ جھوٹی شان و شوکت یہ مقام صرف ہمارے بنائے معاشرے کے اصول ہیں، ہم مسلمان برابر ہے اور میرا اسی پہ اعتقاد ہے جب بنانے والے نے کوئی فرق نہیں رکھا تو پھر معاشرے کے ناخداؤں کے ایسے طبقاتی فرق کو میں نہیں مانتی۔" شاندیل کے اندازے کے مطابق وہ جذباتی ہو گئی تھی۔

"یہ معاشرے کا صدیوں پرانا رائج اصول ہے امبر، اسے میں یا تم چاہیں بھی تو نہیں بدل سکتے نہ ہی توڑ سکتے ہیں اور بہتر ہے کہ تم بھی کوئی

ایسی کوشش، مت، کرنا۔" اس نے امبر کے ہاتھ پہ تسلی آمیز انداز میں ہاتھ رکھا، امبر نے تیزی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑایا۔

"مگر میں ارمان کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی، پہلی بار مجھے ایسا انسان ملا ہے جو مجھے اپنا ہی پرتو محسوس ہوا ہے، میں سچ کہہ رہی ہوں شانی مجھے ہمیشہ اس سے مل کر یہی لگا ہے کہ میں خود آئینے کے سامنے کھڑی ہوں، اگر تم خود اس سے ملو تو تمہیں یقین آ جائے گا۔" وہ اب اس کا ہاتھ تھامے آہستگی سے بول رہی تھی۔

"میں نے یہ کب کہا امبر، مجھے تمہاری ہر بات کا یقین ہے تم جانتی ہو، میں تو بس آنے والے وقت کی چوٹ سے تمہیں بچانا چاہتی تھی۔" وہ اپنی جگہ بے بس تھی۔

"میں تمہاری اسکائپ پر بات کروا دیتی ہوں وہ اتنا نائس ہے کہ تمہیں میری پسند پہ رشک آئے گا۔" اس نے جلدی سے موبائل میں اسکائپ آن کیا مگر ارمان سے بات نہیں ہو سکی، نتیجتاً اس نے اپنی میموری کارڈ میں سیو ارمان کی تصاویر اسے دکھائی تھیں۔

"بندہ تو ہینڈسم ہے اور کافی چالاک بھی۔" شاندیل ایک اچھی فیس ریڈر تھی لمحوں میں چہرے کے اتار چڑھاؤ سے مطلوبہ انسان کی سوچیں تک پڑھ ڈالتی۔

"بالکل غلط، وہ ہینڈسم ہے مگر چالاک نہیں نہایت خوددار اور حساس دل کا مالک ہے۔" امبر کو برا لگا تھا۔

"تو ایسا کون سی کتاب میں لکھا ہے امبر کہ جو خوددار یا حساس ہوگا وہ چالاک نہیں ہو سکتا۔" اسے اعتراض تھا۔

"ہوگا مگر تم ارمان کے بارے میں ایسا کچھ مت کہو، مجھے اچھا نہیں لگتا۔" شاندیل نے اسے بے حد سنجیدگی سے سنا اور سمجھا تھا پھر اس کے بعد وہ اس نے ایسی کوئی بھی بات نہیں کی تھی، امبر نے اس کے لئے وہاں سے بے حد و بے تحاشا شاپنگ کی تھی بلکہ اس کے پورے گھر والوں کے لئے بھی، آفس سے واپسی پر ساری رات اس کی ارمان اسد سے باتیں کرتے گزرتی تھی صبح کو شاندیل اس کی متورم سرخی مائل آنکھیں دیکھ کے ٹھنڈی سانس بھر کے رہ جاتی کچھ بھی تھا مگر اسے یہ شخص امبر محمود کے لئے مناسب نہیں لگا تھا۔

☆☆☆

اپنے لئے اور اپنے گھر والوں کے لئے آئے اتنے سارے تحائف دیکھ کر ارمان اسد کی آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں اور آنکھیں تو اس کے گھر والوں کی بھی کھل گئی تھیں اس سے پچھلے ایک سال میں پہلی مرتبہ اس دیالو دوست کے بارے میں سوالات ہونے لگے تھے جس کی نوازش وہ لوگ پچھلے ایک سال سے دیکھ رہے تھے، اس مرتبہ ارمان اسد نے بھی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لیا تھا بلکہ صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ امبر محمود سے شادی کرنا چاہتا ہے، سارے گھر پہ موت کا سناٹا اتر آیا تھا، سب ہی انگشت بدنداں رہ گئے اور اشنہ اس کا تو دل پاتال میں جا گرا تھا۔

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ امبر سے ہی شادی کروں گا۔" اس نے خاموشی کے سمندر میں اپنی آواز کا پتھر پھینکا۔

"تم ہوش میں ہو ارمان۔" سب سے پہلے اماں کو ہی ہوش آیا تھا۔

"جانتا بھی ہے بچپن کی منگ ہے اشنہ، تیرے نام پہ بیٹھی ہے کتنے سالوں سے؟"

"تو میں نے کب کہا کہ یوں بٹھائیں اسے، اس جیسی بد دماغ کے لئے کیا ایک میں ہی رہ گیا ہوں میرے لئے کیوں باندھ رہی ہیں اس

جاہل اور نکمی کو جسے بات تک کرنے کی تمیز نہیں ہے۔" وہ بول نہیں رہا تھا زہر اگل رہا تھا اشنہ نے اپنا وجود نیل و نیل ہوتا محسوس کیا۔

"زبان سنبھال کر بات کرو شہزادے، چار جماعتیں کیا پڑھ لیں دماغ تو آسمان پر چڑھ گیا تیرا، ہماری بچی کوئی گری پڑی ہرگز نہیں کہ تم جیسے ناقدرے انسان کے ہاتھوں دے کے رول دیں، ہمیں رشتوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔" چچی کو بھی تاؤ آ گیا تھا تبھی وہ تڑخ اٹھیں بات بننے کی بجائے بگڑ گئی، ارمان مزید اڑ گیا، پنچائیت بلوائی گئی مگر ارمان اسد کی نہ ہاں میں بدلی نہ ہی چچی چچا راضی ہوئے، ارمان اسد تو اور منزلوں کا مسافر تھا اور والدین اپنی بچی کھچی عزت و انا کو مٹھی میں دابے لاپرواہ نظر آ رہے تھے۔

☆☆☆

"ڈیڈ! ارمان بہت اچھے انسان ہیں۔" دوسری جانب امبر ارمان اور اپنا مقدمہ باپ کی عدالت میں لڑ رہی تھی مگر وہاں شاندیل کی پیشین گوئی سچ ثابت ہو رہی تھی۔

"امبر تم ہمیں بہت عزیز ہو، زندگی میں تم نے ہم سے جس چیز کی بھی فرمائش کی ہم نے وہ بلا تامل لا کر تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دی مگر ہمیں اب کی بار مجبور مت کرو۔" ان کے لہجے میں قطعیت تھی۔

"آپ ایک دفعہ اس سے مل کر تو دیکھیں، پلیز ڈیڈ میری خاطر پلیز ڈیڈ۔" اس نے کچھ ایسے انداز میں کہا انہیں مانتے ہی بنی تھی ارمان اسد پر دن بدن گھر کے حالات تنگ ہو رہے تھے اسے پرواہ بھی کہاں تھی منت ترس واسطہ قسمیں اماں نے ہر حربہ آزمایا، تنگ آ کے دودھ نہ بخشنے کی دھمکی دے ڈالی مگر اسے اپنی دنیا بنانی تھی آخرت سنوارنے کا فی الحال اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا سو بڑے آرام سے اپنا آخری فیصلہ سنایا کہ وہ گھر چھوڑ دے گا، اشنہ جلے پاؤں کی مانند ہو گئی فوراً اس کے پاس پہنچی تھی۔

"کیا وہ بہت حسین ہے ارمان؟" سلگتا ہوا لہجہ اس کے ٹوٹے خوابوں کو ظاہر کر رہا تھا، ارمان نے اسے ایک نظر دیکھ کر گہری سانس اور اثبات میں سر ہلا دیا، اشنہ کے دل پہ ارمان کے اقرار سے آرے چلے۔

"بہت پڑھی لکھی اور پیسے والی تو ہے ناں وہ، کیا تم صرف اسی لئے اس سے شادی کر رہے ہو کہ......" ارمان اسے دیکھ کر مسکرایا اور ایک مرتبہ پھر اثبات میں سر ہلایا وہ جانتا تھا کہ اشنہ کانٹوں پہ لوٹ رہی ہے اس نے بھی اس کی اذیت میں اضافہ ہی کیا۔

"کیا تم اس سے بہت پیار کرتے ہوئے ارمان؟" اس سوال پہ ارمان چونکا تھا یہ تو اس نے خود بھی نہیں سوچا تھا کہ اس سے ایسا بھی کوئی سوال ہو سکتا ہے۔

"سچ بولنا شہزادے۔" اشنہ نے سسکاری کو لبوں میں دبوچ کے خود کو باہمت ظاہر کیا۔

"نہیں۔" پیکنگ چھوڑ کر اس نے واقعی میں سچ بولنے کی ٹھانی اشنہ کو اس سوال کی توقع نہیں تھی۔

"مجھے بس وہ اچھی لگتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہم بہت اچھی زندگی گزار سکتے ہیں اور مجھے اس کا ساتھ وہ سب دے سکتا ہے جو بچپن سے میری خواہشات میں شامل رہا ہے اور...... کچھ......؟" اس کا انداز ایسا تھا گویا پوچھ رہا ہو کہ پوچھ لیا جو پوچھنا تھا اب مہربانی کر کے دفع ہو جاؤ؟

"اگر وہ تمہیں نہ ملی تو؟" وہ کیا پوچھنا چاہ رہی تھی خود بھی نہیں جانتی تھی۔

"تو پھر بھی واپس مڑ کے نہیں دیکھوں گا آگے ہی بڑھوں گا کیونکہ میرے لئے پیچھے کچھ نہ پہلے کبھی تھا نہ ہی اب ہے اور نہ ہی کبھی مستقبل میں ہو سکتا ہے، اب میں پیکنگ کر لوں کیونکہ مجھے دیر ہو رہی ہے۔" اشنہ لب کا نفی اثبات میں سر ہلاتے واپس مڑ گئی، اسی شام اپنے لئے امبر کی طرف سے بک کروائے فرنشڈ فلیٹ میں وہ شفٹ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

"آخر وقاص شیرازی میں کیا خرابی ہے امبر؟ تم جانتی ہو ہارورڈ سے ایم بی اے کیا ہے اس نے، شیرازی صاحب کی کڑوروں کی جائیداد کا اکلوتا وارث ہے اور سب سے بڑی بات تمہیں پسند کرتا ہے۔" مام پچھلے ایک ماہ سے اسے منانے کی کوشش کر رہی تھیں انہیں امبر کے انکار کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"پر میں اسے پسند نہیں کرتی مام، اہم کیا بات ہوئی پھر اس کا ہارورڈ سے ایم بی اے کا ڈگری ہولڈر ہونا شیرازی انکل کی کڑوروں کی جائیداد کا وارث ہونا یا اس کی میری لئے پسندیدگی، جو ہر دوسرے ماہ کسی اور خوبصورت لڑکی کو دیکھ کے بدل جاتی ہے؟" مام نے اس کے چہرے پر پھیلی بے زاری اور ناپسندیدگی کو نظر بھر کر دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئیں۔

"شادی کے لئے وہ تمہارے لئے ایک پرفیکٹ میچ ہے امبر۔" انہوں نے ایک آخری کوشش کی۔

"یہ شادی ہے مام، بزنس ڈیل نہیں کہ میں ان سب فائدوں کے متعلق سوچوں جو آپ مجھے گنوا رہی ہیں میرے لئے اہم میرے دل کی خوشی ہے۔"

"پھر کون ہے تمہارے دل کی خوشی؟" انہوں نے تھکن زدہ پژمردہ سانس بھری امبر نے ایک نظر انہیں دیکھا اور مسکرا دی اس کا نام تو وہ سانس لئے بغیر لے سکتی تھی۔

"وہ دو ٹکے کا بینک مینجر۔" اس کے بولنے سے پہلے ہی مام نے زہر آلود لہجے میں نفرت سے کہا تھا امبر نے دکھ سے ان کی طرف دیکھا اور ضبط کرنے کی کوشش کی۔

"انسانوں کی دولت کے ترازو میں پرکھنا کب چھوڑیں گی مام، ہر انسان چھوٹا نہیں ہوتا صرف اسٹیٹس کی انسان کے اعلیٰ وارفع ہونے کا ثبوت نہیں ہو سکتا نہ ہی صرف دولت کا ہونا کافی مانا جاتا ہے۔" اس نے بھی ناپسندیدگی سے کہہ دیا۔

"امبر!" مام کا لہجہ انتباہ لئے ہوئے تھا۔

"پلیز مام مگر میں اپنی محبت کے بارے میں ایک لفظ نہیں سن سکتی۔"

"تم ہوش میں نہیں ہو امبر، جتنی اس لڑکے کی تنخواہ ہے اتنا تمہارا ایک دن کا خرچا ہے تم دو این جی اوز کو اسپورٹ کر رہی ہو لاکھوں کی شاپنگ کرتی ہو ایک سینڈل صرف ایک بار کے استعمال کے بعد دوبارہ نہیں پہنتی ہو تم جانتی ہو کہ اس کا ساتھ تمہیں ایسی آسائشوں سے محرومی کے سوا کچھ نہیں دے گا۔"

"مجھے ارمان کے سوا اور کچھ بھی نہیں چاہیے مام نہ آپ کی دولت نہ بلند معیار زندگی۔" اس کا لہجہ دوٹوک اور قطعی ہو گیا دروازے میں کھڑے محمود ربانی نے آخری جملہ غور سے سنا۔

"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے امبر؟" مام دوبارہ پوچھ رہی تھیں محمود ربانی اندر کمرے میں بڑھ آئے، امبر نے باپ کو دیکھ کے جواب نہیں دیا بس خاموش رہی مگر اس کے چہرے پر اس کا جواب صاف لکھا نظر آ رہا تھا۔

"امبر! اگر تمہارا یہ آخری فیصلہ ہے تو ٹھیک ہے ہمارے لئے تمہاری خوشی سے بڑھ کر اور کچھ بھی نہیں ہے تم اس لڑکے کو کل شام ڈنر پر بلا لو۔" محمود ربانی نے اچانک ہی کہا تھا، امبر پہ تو شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی اس نے بے یقینی سے باپ کی طرف دیکھا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں محمود، ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" مام تو چلا اٹھی تھیں۔

"امبر کی خوشی کے لئے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔" باپ کے کہنے پر امبر خوشی خوشی باہر کمرے کی طرف دوڑی تھی۔

"مگر محمود وہ ناسمجھ اور بے وقوف ہے ساری دنیا کو اپنے جیسا شفاف اور مخلص سمجھتی ہے مگر آپ نے تو دنیا دیکھی ہے آپ کو تو عقل سے کام لینا چاہیے۔" وہ غصے سے بپھر رہی تھیں محمود ربانی اتنے ہی پرسکون نظر آ رہے تھے۔

"عقل سے ہی کام لے رہا ہوں تمہیں بھی سمجھنا چاہیے میری حکمت عملی کو۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے ان سے کہا تو وہ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگی تھیں۔

☆☆☆

ارمان نے جیسے ہی دروازہ کھولا سامنے ہی وہ شعلہ جوالہ دہکتے رخسار لئے کھڑی نظر آئی خوشی جس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی چہرے کی چمک دن کی روشنی کو بھی مات دے رہی تھی۔

"واٹ آ پلیزنٹ سرپرائز، آؤ اندر آؤ۔" ارمان اسے دیکھ کر خوشی سے بولا تھا وہ اس کے گھر پہلی دفعہ آئی تھی۔

"ڈیڈ آپ سے ملنا چاہتے ہیں ارمان، ہے ناں خوشی کی بات۔" وہ پرجوش سی کہتے اندر بڑھ آئی ارمان حیرت سی اپنی ہی جگہ منجمد ہو کے رہ گیا، اسے یقین نہیں آیا کہ قسمت کی دیوی یوں اتنی آسانی سے بھی اس پر مہربان ہو سکتی ہے۔

"سچ امبر، آر یو سیریس۔"

"یس۔" امبر نے چہکتے ہوئے بتایا تو خوشی کے والہانہ اظہار کے طور پر ارمان نے اسے بانہوں میں بھر کے پورے لاؤنج میں گھما ڈالا امبر کو اس نے یوں پہلی بار چھوا تھا، امبر کو بے حد اچھا لگا اس کی خوشی اور حد درجہ خوشی اس کے انگ انگ اور ہر ایک ایک انداز سے واضح ہو رہی تھی۔

"امبر ایک پرابلم ہے۔" کافی چھپتے اسے اچانک یاد آیا تھا امبر نے اسے ناسمجھی سے دیکھا۔

"تم جانتی ہو میں نے اپنا گھر تمہارے لئے چھوڑا ہے تو ہماری شادی میں میرے گھر کی طرف سے کوئی بھی شامل نہیں ہوگا۔" وہ دلگیر تھا۔

"اٹس اوکے۔" امبر نے اس کا ہاتھ سہلایا۔

"ہم انہیں منا لیں گے شادی ہونے تک۔" مگر ارمان نے سن کے نفی میں سر ہلایا۔

"وہ نہیں آئیں گے امبر، میں انہیں جانتا ہوں وہ لوگ بہت ضدی ہیں جو ٹھان لیں وہ پورا کر کے ہی رہتے ہیں چاہے جتنا بھی نقصان کیوں نہ ہو۔" اس نے سچ کہا تھا کیونکہ وہ بھی تو ایسا ہی تھا۔

☆☆☆

محمود ربانی نے اپنے سامنے بیٹھے تیس سالہ نوجوان کو دیکھا جس کی گہری آنکھوں میں عزم، استقلال ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دے رہا تھا، انہوں نے اس سے اکیلے ملنے کا فیصلہ کیا تھا۔

"تم امبر سے کیوں شادی کرنا چاہتے ہو؟" ان کا پہلا سوال ہی مشکل تھا اور عجیب بھی۔

"کیونکہ ہم ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔" اس نے نارمل انداز میں جواب دیا۔

"کتنا پیار۔" انداز جانچتا ہوا مگر تیکھا تھا۔

"اتنا کہ اس کی خاطر میں نے اپنے گھر والوں کو چھوڑ دیا ہے؟" ارمان نے اپنے طور ترپ کا پتا پھینکا کہ جیسے اس جواب کے بعد تو وہ متاثر ہو ہی جائیں گے۔

"گھر چھوڑ دیا یا انہوں نے نکال دیا۔" محمود ربانی کا کاٹ دار لہجہ ارمان اسد کو پہلو بدلنے پر مجبور کر گیا۔

"میں نے اپنی مرضی سے گھر چھوڑا ہے کیونکہ میں امبر کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔" اس نے اس بار لہجہ کو تھوڑا روکھا اور قطعی کر کے بات میں وزن پیدا کرنے کی کوشش کی، اس کی بات سن کر وہ قہقہہ لگا کے ہنس پڑے تھے اتنی زور سے کہ ارمان خواہ مخواہ خجالت کا شکار نظر آنے لگا۔

"اچھا مگر میں نے تو سنا ہے کہ اشنہ سے شادی نہ کرنے کے جرم میں تمہیں گھر سے نکالا گیا ہے؟" ارمان نے آن واحد میں اپنے اوپر پہاڑ ٹوٹتا محسوس کیا وہ حیرت سے پھٹی پھٹی نگاہوں سے محمود ربانی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں سیدھی طرح سے کہیں۔" کچھ دیر بعد خود کو کمپوز کرنے کے بعد اس نے کہا تھا۔

"میری بیٹی کا پیچھا چھوڑنے کا کیا لو گے؟" وہ بھی بغیر لگی لپٹی رکھے بغیر اصل مدعا کی طرف آئے تھے، اس بار ارمان مسکرایا یوں کہ گیند اس کے کورٹ میں نہیں ہاتھ میں تھی۔

"میں نے امبر سے محبت کی ہے ایسے کیسے چھوڑ دوں؟" محمود ربانی کو اس کا جواب سن کے مایوسی ہوئی۔

"ٹھیک ہے، میں تمہارا رشتہ منظور کرتا ہوں مگر میری ایک شرط ہے؟" محمود ربانی نے ہاتھ جھاڑتے اقرار کیا ارمان دل ہی دل میں خود کو شاباشی دینے لگا بیٹی کی طرح وہ باپ کو بھی بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا اب اس کی خواہشات اس سے زیادہ دوری پر نہیں تھیں، بھی بغیر تولے اور سوچ سمجھے دعویٰ کر گیا۔

"مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے؟" اس نے بڑھک ماری وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

"امبر خالی ہاتھ اس گھر سے رخصت ہو گی جہیز کے نام پر ایک تنکا بھی اس گھر سے نہیں جائے گا اور نہ ہی میری جائیداد کی اب اور نہ میرے مرنے کے بعد وارث ہو گی، بولو ابھی بھی منظور ہے تمہیں اس کا ساتھ؟" سگار سلگاتے انہوں نے گہری نظروں سے ارمان اسد کا دھواں دھواں پڑتا چہرہ دیکھا تھا انہوں نے دنیا دیکھی تھی جانتے تھے کہ اپنی بیٹی کے اس نام نہاد عاشق سے کیسے نپٹنا ہے سو وہ اپنے انداز سے کھیل رہے تھے۔

"مگر آپ ایسا کیسے کر سکتے ہیں امبر آپ کی بیٹی ہے آپ کی جائیداد کی اکلوتی وارث۔" ارمان نے زبان ہونٹوں پر پھیر کر اسے تر کرتے خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کی۔

"اسے تمہارے پیار کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں چاہیے اسی لئے تو میں اس کے کہنے پر ایسا کہہ رہا ہوں۔" انہوں نے سکون سے جواب دیا۔

"وہ تو نا سمجھ ہے اسے کیا عقل انکل، آپ اسے سمجھائیں زندگی ایسے بھلا کیسے گزر سکتی ہے بغیر دولت کے۔" زیر لب اسے گالی دیتے اس نے بظاہر سنجیدگی، متانت سے کہا تھا۔

"اس کے لئے تمہاری محنت کی کمائی ہوئی تنخواہ ہی کافی ہو گی ایسا اس کا خود کا کہنا ہے۔" انہوں نے دوبارہ بھی اسی سکون سے جواب دیا۔

"مگر چند ہزار میں گزارہ کیسے ہو پائے گا

امبر کتنی بے وقوفی کر رہی ہے۔" وہ زیادہ دیر خود پر قابو نہیں رکھ پایا دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں غصے سے بھینچے اس نے جیسے ایک فیصلہ کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"آئم سوری میں آپ کی بیٹی سے پھر شادی نہیں کر سکتا۔" اچانک اس نے سچ بولنے کی ٹھانی تھی۔

"میں نے کہا ناں اس کی عادت تھی وہ مطلوبہ نتائج نہ ملنے پر غمزدہ اور مایوس نہیں ہوتا تھا آگے کی سوچتا تھا اور اس نے سوچ لیا تھا کہ اسے آگے کیا کرنا ہے۔"

"بیٹھ جاؤ۔" سگار کا لمبا کش لیتے انہوں نے اسے بٹھایا وہ کسی روبوٹ کی مانند بیٹھ گیا، مگر وہ اوب گیا تھا وہ اب اور محبت محبت کا ڈرامہ نہیں رچا سکتا تھا جس میں محنت کے بعد رسپانس کے طور پر صرف تالیاں سننے کو ملیں، بھاری بھرکم انعام نہیں۔

"ایک ڈیل کرتے ہیں۔" ارمان اسد نے چونک کر محمود ربانی کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا دیا۔

☆☆☆

اور اس نے ان کے ساتھ ڈیل کر لی تھی امبر کا ساتھ اسے کچھ نہیں دے سکتا تھا مگر امبر کا ساتھ نہ پانا اس کے لئے بہت کچھ زندگی میں کر سکتا تھا سو اس نے محمود ربانی کی بات مان لی تھی، امبر کے ساتھ ساری زندگی شادی کر کے پچھتانے سے بہتر تھا کہ وہ اس کی باپ کی بات کی لاج رکھ لے اور امبر کی زندگی سے ہنسی خوشی نکل جائے، وہ انعام کے طور پر اسے کسی بھی ملک میں سیٹل کروا سکتے تھے وہ آرام سے اپنے لئے بہت ڈھیر ساری دولت کما سکتا تھا اور جب وہ سیٹل ہو جاتا، تب کسی بہت اچھی لڑکی کے ساتھ شادی کر کے بہت اچھی زندگی گزار سکتا تھا بالکل ویسی ہی زندگی جس کے وہ ہمیشہ سے خواب دیکھتا آیا تھا۔

ایک بات اس نے محمود ربانی کی مانی تھی، ایک بات محمود ربانی نے اس کی مانی تھی، اس نے لندن میں ایک اپارٹمنٹ کے ساتھ بہت اچھی جاب اور گاڑی کے بدلے امبر کو چھوڑنے کی بات کی تھی جواباً انہوں نے اسے ایک بینک چیک فوراً لکھ دیا تھا یہ ان تمام چیزوں کے علاوہ تھا جن کی اس نے فرمائش کی تھی، ارمان اسد دل سے مسکرایا تھا زندہ ہاتھی بھی اب کی بار مرے ہوئے ہاتھی جتنا ہی فائدہ دے رہا تھا اسے اب بس اور کچھ نہیں کرنا تھا اپنی پیکنگ کرنا تھی اور ایک چھوٹا سا ڈرامہ۔

☆☆☆

اس روز اسے بہت تیز بخار تھا کہ وہ غنودگی میں بار بار جا رہا تھا اسے اپنی ہوش تھی نہ ہی خبر، بمشکل تمام اس نے امبر کو کال کر کے بلوایا تھا، وہ اس کی بیماری کا سن کے فوراً ہی دوڑی چلی آئی تھی، وہ بخار میں بری طرح سے تپ رہا تھا امبر اس کے ماتھے پر بار بار پٹیاں رکھ رہی تھی مگر بخار کی حدت کم ہونے کے بجائے مسلسل بڑھ رہی تھی۔

"ارمان، پلیز ہوش کریں اٹھیں میں آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے چلتی ہوں۔" وہ فکر مندی سے کہہ رہی تھی ارمان دل ہی دل میں ہنسا کیا وہ پاگل تھا کہ ڈاکٹر کے پاس جا کے اپنا پول کھولتا۔

"امبر میری جان!۔" نیم بے ہوشی میں وہ اس پر جھکا تھا۔

"سب نے مجھے چھوڑ دیا میں بہت اکیلا ہو گیا ہوں، وعدہ کرو تم میرا ساتھ کبھی نہیں چھوڑو گی۔" امبر اس کی غیر ہوتی حالت پہ پہلے ہی

پریشان تھی اس کی باتیں سن کے مزید ہوگئی۔

”ارمان آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں میں تو آپ کی خاطر جان بھی دے سکتی ہوں پلیز آنکھیں کھولیں، مجھ سے آپ کی ایسی حالت دیکھی نہیں جا رہی۔“ وہ رو رہی تھی۔

”تو پھر مجھے اپنالو، امبر مجھے تمہاری بہت ضرورت ہے؟“ اچانک اس نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے سینے پر رکھا تھا جو بری طرح سے دھڑک رہا تھا دھڑکنوں کا بے ہنگم شور اور سلگتا ہوا لمس امبر محمود کے جسم میں برقی کوندا دوڑا گیا تھا، وہ لمحوں میں سن پڑ گئی تھی۔

”میں آپ کے ساتھ ہوں ہمیشہ آپ کو اپنا مان چکی ہوں ہمیشہ کے لئے، آپ کو کس بات کی ٹینشن ہے۔“ اسے لگا بیماری میں وہ ان سیکیور ہو رہا ہے تبھی اس نے پیار سے ارمان کے ماتھے پر نرمی سے اپنا ہاتھ رکھتے کہا تھا ارمان آنکھیں بند کرکے لیٹا رہا۔

”میں وعدہ کرتا ہوں امبر ساری زندگی تمہیں بہت خوش رکھوں گا اپنی زندگی کا ایک ایک پل تمہارے ساتھ بتاؤں گا، بس تم کبھی میرے ساتھ بے وفائی مت کرنا میں چاہتا ہوں میری بیوی پر صرف میرا حق ہو اور وہ اتنی مضبوط ہو کہ کسی بھی مشکل میں وہ کبھی بھی نہ ہارے ہمیشہ مضبوطی سے اپنی جگہ قائم رہے۔“ ارمان نے اس کا ہاتھ ماتھے سے ہٹا کر اپنے جلتے ہوئے لبوں سے لگایا تھا امبر پوری جی جان سے پگھل گئی، آنکھوں سے آنکھیں ملیں محبت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر آگ اگل رہا تھا آگ سی آگ تھی جو دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی امبر کو تو جیسے کسی نے ہپناٹائز کر دیا تھا، وہ ان لمحوں کی اسیر ہو رہی تھی جن کی طرف اسے ارمان لے جا رہا تھا ارمان کی انگلیاں دھیرے دھیرے رقص کرتی اس کی گردن پر رینگنے لگی جبھی لمحوں کا وقتی طلسم ٹوٹ کے بکھر گیا اور امبر خود کو سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”فریزر میں ٹرائفل رکھا ہے میں نے رات کو بنایا تھا وہ لے آؤ، تھوڑا سا، بخار سے میرا اندر جل رہا ہے۔“ کچھ بھی ظاہر کیے بغیر ارمان نے نقاہت زدہ انداز میں کہا تھا امبر سر ہلاتی مڑ گئی تھی واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ٹرائفل سے بھرا باؤل تھا اس نے ارمان کو سہارا دے کر بٹھایا اور خود چمچ بھر کے اس کے منہ کی طرف کیا، مگر ارمانے ٹرائفل خود نہیں کھایا بلکہ وہی چمچ وارفتگی سے دیکھتے مدہوشی کی سی کیفیت میں محبت پاش نظروں سے امبر کو دیکھتے اس کے منہ میں ڈال دیا تھا امبر اس قدر محبت پر نم آنکھوں سمیت مسکرا دی، چاہا جانا کس قدر خوبصورت اور پرفسوں احساس تھا امبر کو خود پر رشک ہوا، پہلا چمچ پھر دوسرا، پھر تیسرا ایک ایک کرکے اس نے آدھا ٹرائفل امبر کو کھلا دیا، امبر کی آنکھیں نیم وا ہونے لگیں سر بھاری اور دماغ ہونے لگا ارمان نے اس کی کیفیت پر اسے مسکرا کر دیکھا وہ آہستہ آہستہ ہوش کھو رہی تھی مگر ارمان ہوش میں آ رہا تھا امبر کی قسمت سیاہ ہو رہی تھی مگر ارمان کی جاگ رہی تھی، امبر کی بے ہوشی کی تصدیق کرنے کے فوراً بعد ہی ارمان نے اسے اپنے پاس بیڈ پر لٹا دیا اور خوشی کا جشن مناتے کمرے کی بتی بجھا دی۔

امبر محمود پر اس نے ایک سال کڑی محنت کی تھی تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ فائدہ نہ اٹھاتا، محمود ربانی نے اس کی غربت کا مذاق اڑایا تھا اس کی کچھ قیمت محمود ربانی کو بھی تو ادا کرنی چاہیے تھی۔

☆☆☆

دوسری صبح اس کے لئے تاریکی لئے نمودار ہوئی تھی اس نے اٹھ کے دیکھا تو خود کو ارمان کے گھر اس کے بیڈ روم میں اس کے بیڈ پر لیٹا پایا تھا، امبر کی جان نکل گئی وہ ساری رات گھر سے باہر رہی تھی، اس کے مام ڈیڈ کس قدر پریشان ہو گئے ہوں گے جلدی میں ارمان کی طبیعت خرابی کا سن کے وہ تو انہیں بتانا ہی بھول گئی تھی کہ وہ کس کے پاس جا رہی ہے؟ اس نے جلدی سے کمبل ہٹایا اور سن پڑ گئی، اپنا نیم برہنہ وجود اسے کسی انہونی کا احساس آن واحد میں دلا گیا تھا اس کے دل پہ گھونسا سا پڑا تھا اس نے بے اختیار خود کو کمبل میں چھپایا مگر جو کالک وہ رات کی سیاہی میں اپنے چہرے پہ مل چکی تھی اسے تو ساری زندگی نہ دھو سکتی تھی نہ مٹا سکتی تھی اور نہ ہی چھپا سکتی تھی، اس نے دیوانہ وار انداز میں خود کو ڈھانپ کر ارمان کو تلاشا، وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ یہ سب انہوں نے غلط کیا ہے انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا شادی سے پہلے نکاح کے بغیر، یہ سب، اتنا کچھ؟

اس نے سارا گھر تلاشا مگر ارمان کہیں نہیں تھا، وہ دیوانہ وار اسے آوازیں دیتی رہی پورے گھر میں ڈھونڈتی رہی مگر وہ ہوتا تو ملتا ناں، تھک ہار کر وہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر رونے لگی تھی، روتے روتے نیچے بیٹھ گئی خود کو اس نے پاتال میں گرتا محسوس کیا تھا محبت نے اسے پاتال میں ہی گرایا تھا تبھی اس کی نگاہ آئینے پر لگی چٹ پر پڑی تھی وہ جھپٹ کر اس تک پہنچی۔

”پیاری امبر! مجھے افسوس ہے کہ اس طرح تمہیں بتائے بغیر تم سے دور جا رہا ہوں میں ایسا شاید کبھی نہ کرتا اگر تم عقل سے کام لیتیں تو، تم سوچ رہی ہوگی کہ میں نے کیا کیا ہے، کل رات جو کچھ ہمارے درمیان ہوا اس سب پہ مجھے اکسانے والی تم ہی تھیں میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنے کمزور کردار کی بھی ہو سکتی ہو اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ جو لڑکی شادی سے پہلے میرے ساتھ سو سکتی ہے وہ مجھ سے شادی کے بعد کسی اور کے پاس کیسے نہیں جا کے میری عزت کا جنازہ نکال سکتی تم نے اس باپ کا نہیں سوچا جو تم سے اس قدر والہانہ محبت کرتا ہے تو پھر میری کیا اوقات؟ بہرحال تمہارے باپ کی دی ہوئی آفر میرے لئے تمہارے ساتھ سے کہیں زیادہ سود مند ہے کیونکہ مجھے تمہاری دولت کی چاہ تھی تمہاری نہیں، میں جا رہا ہوں ہو سکے تو مجھے بھول جانا مگر میں تم جیسی بدکردار لڑکی کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا۔“ الفاظ تھے یا پتھر امبر نے اپنا دل لہولہان ہوتا محسوس کیا اس نے پاگلوں کی طرح سے خود کو پیٹنا شروع کیا تھا آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس نے خود پر بار بار نفرت سے تھوکا تھا، دیوانوں کی طرح اس نے دیواروں میں بار بار اپنا سر پٹخا تھا۔

”غلطی کس کی تھی؟“ وہ گھنٹوں سوچے جاتی۔

”سزا کسے ملی۔“ اسے پہروں ڈھونڈے سے جواب نہ ملتا۔

وہ کیسی بیٹی تھی جس نے اپنے باپ کی عزت کی لاج رکھی نہ اپنے کردار کی حفاظت کر سکی؟ اسے خود پر حیرت ہوتی نفرت ہوتی اسے انسانوں کی پرکھ کیوں نہ ہو سکی، وہ ایک انسان کو نہیں پرکھ سکی اس کا سب کچھ لٹ گیا تھا اور وہ لوٹانے والی وہ خود تھی مزے کی بات تھی لٹی بھی رہی برباد بھی وہ ہوئی اور سب سب کی ذمہ دار بھی وہ ہی تھی؟ مام ڈیڈ اس کی ایسی حالت دیکھ دیکھ کر کڑھتے کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے دل کو کیا روگ لگ چکا ہے سب یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ ارمان کے جانے کی وجہ سے مضطرب و پریشان ہے مگر ڈیڈ کا خیال تھا کہ وہ آہستہ آہستہ سنبھل جائے گی، جب

ارمان کا اصلی روپ جان جائے گی مگر ڈیڈ محمود ربانی کو خبر نہیں تھی کہ وہ ارمان اسد کی اصلیت جان چکی ہے اور اب کبھی ٹھیک ہونے والی نہیں، وہ کمرے میں محصور ہو کے رہ گئی، مگر ارمان کے لکھے وہ جملے وحشت بن کے پورے کمرے میں لکھے نظر آتے ہر دیوار پر چھت پر فرش پر قالین پر ٹیبل ہر جگہ اسے بدکردار لفظ لکھا نظر آتا، وہ بدکردار تھی اور اس نے ارمان اسد کو اس رات بدکاری پر اکسایا تھا، وہ سوچتے ہوئے تڑپنے لگتی، اسے تو خود ہوش نہیں رہا تھا وہ بھلا کیونکر ایسا کرتی، مگر ارمان نے کہا کہ اس نے ایسا کیا اور اس نے مان بھی لیا اس کی اچھی عادت تھی یا بری مگر وہ ہر کسی کی بات پر اعتبار کرلیا کرتی تھی ہر کسی کی جھوٹی سچی بات کو مان لیا کرتی تھی، اس کی حالت دن بدن خراب ہونے لگی شہر کے مہنگے اور مشہور ترین سائیکاٹرس اس کے لئے ہائر کیے گیے مگر وہ انہیں دیکھ کے چلانے لگتی پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگتی اپنے بال نوچتی ناخن چباتی، روتی چلاتی کرلاتی، بچاؤ بچاؤ کی آوازیں نکالنے لگتی، محمود ربانی اپنے سامنے اپنی بیٹی کو پاگل ہوتا دیکھ رہے تھے مگر کچھ کر نہیں سکتے تھے یہ سب کرنے والے امبر کو اس حال میں پہنچانے والے تو وہ خود تھے۔

☆☆☆

ارمان کو گئے ایک سال کا عرصہ ہو چکا تھا امبر کی حالت سنبھلنے کے بجائے مزید بگڑ رہی تھی ہاں اب وہ پہلے سے خاموش ضرور ہو گئی تھی، نہ چیختی نہ چلاتی نہ ہی کسی کو دیکھ کے بچاؤ بچاؤ بولتی، ایک فی میل سائیکاٹرسٹ سے بات ہونے کے بعد محمود ربانی نے اسے لندن شاندیل کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا، وہاں ان کی برانچ میں ارمان اسد کام کر رہا تھا اپنی بیٹی کی زندگی اور خوشی کی خاطر وہ یہ کڑوا گھونٹ پینے کو تیار ہو چکے تھے، اس بات کا اظہار اگرچہ ابھی انہوں نے کسی نے نہیں کیا تھا مگر امبر کو لندن بھیجنے کا مقصد ان کا یہی تھا، امبر خاموشی سے لندن آ گئی، شاندیل نے اس کا ہر طرح سے بھرپور خیال رکھا اتنا کہ وہ سنبھل گئی اور شاندیل کے کندھے پر سر رکھ کے وہ سب بھی کہہ گئی جس کا بار اس سے اٹھایا نہیں جا رہا تھا، شاندیل نے اسے تسلی دی نہ دلاسہ بس اپنی غلطی کو سدھارنے کی کوشش کا مشورہ دیا اور ارمان اسد کا مکمل بائیوڈیٹا، اسے لندن آئے چھ ماہ گزر گئے اس دوران مام ڈیڈ دوبار آ کے اس سے مل گئے آخری بار ساتھ چلنے کو بھی کہا، مگر وہ نہیں مانی لندن کی آب و ہوا اب راس آنے لگی تھی۔

وہ دونوں اس وقت کافی سے لطف اندوز ہو رہی تھیں، شاندیل نے غور سے دیکھا امبر کی صحت اب پہلے سے کافی اچھی ہو گئی تھی تازہ تازہ کروائی کٹنگ اس کے گول چہرے پر بے حد بھلی لگ رہی تھی۔

”امبر ایک بات پوچھوں؟“

”پوچھو، تمہیں اجازت کب سے درکار ہونے لگی۔“ امبر نے بے نیازی سے کہتے ہوئے کافی کا سپ لیا۔

”کیا تم ابھی بھی ارمان سے محبت کرتی ہو؟“ کافی کا کڑوا گھونٹ اور کڑوا ہو گیا، اتنا کہ امبر پی نہیں سکی وہ حلق میں ہی اٹک گیا۔

”نہیں۔“ مگر وہ بولی تو اس کا لہجہ کسی بھی قسم کے جذبے سے عاری اور کمپوزڈ تھا۔

”میں اس سے اتنی شدید نفرت کرتی ہوں کہ نفرت سے اس پر تھوکنا بھی اپنی توہین لگتی ہے مجھے۔“

”میں جانتی ہوں اس نے تمہارے ساتھ بہت غلط کیا مگر اس سب میں تمہارے ڈیڈ بھی تو شامل تھے۔“

”ڈیڈ نے اسے صرف مجھے چھوڑنے کی قیمت لگائی تھی، مگر اس نے تو حد ہی کر دی اسے پیسہ چاہیے تھا تو مجھ سے کہا ہوتا میں بن کہے اپنا سب کچھ اس پر لٹا دیتی مگر جاتے جاتے اس نے تو مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا، میں ہی نہیں سمجھ پائی کہ وہ ایک خود غرض انسان تھا جس نے دولت کی خاطر اپنے خون کے سگوں کو بھی چھوڑ دیا، بس میں ہی سمجھ نہیں پائی۔“ امبر آنسوؤں کو بہنے سے روک نہیں پائی۔

”بٹ امبر، وہ بہت شرمندہ ہے معافی مانگنا چاہتا ہے تم سے۔“ شاندیل کے انکشاف پر امبر نے اپنا سر پھٹتا محسوس کیا تھا وہ کیا کہنے جا رہی تھی کیا کوئی نئی بات نیا قصہ نیا انکشاف۔

”تم یہ سب کیسے کہہ سکتی ہو؟“ وہ الجھ گئی۔

”کیونکہ میں اس سے ملی تھی، ایک بار نہیں بار بار۔“ اس نے سچ بولنے کی ٹھان لی تھی۔

”میں چاہتی تو یہ سب چھپا سکتی تھی تم سے، بہت آسانی سے کسی بھی ناول یا موی کی سٹوری کی طرح سے تم دونوں کی اتفاقیہ ملاقات ارینج کر سکتی تھی مگر میں نے ایسا نہیں کیا اس لئے کیونکہ زندگی میں اتفاقات بہت کم ہوتے ہیں اور سچائی کو اسی طرح سے بیان کیا جائے جیسی وہ ہوتی ہے تو اس سے زیادہ اچھی بات ہو ہی نہیں سکتی، جب وہ لندن آیا تو میرے ہی آفس میں جاب کے لئے آیا تھا لیکن اس سے بھی پہلے تمہارے ڈیڈ کی دی گئی جائیداد کو اس نے بالکل ویسے ہی لٹایا جیسا کوئی بھی انسان مفت میں ملنے والی چیز کا استعمال کر سکتا ہے، دنیا بھر میں گھومنے پھرنے، عیاشی اور موجیں کرنے کے بعد جب میں اس سے ملی تو نام کے سوا باقی اس میں کچھ بھی نہیں بچا تھا۔“ اس نے وقفے کے دوران امبر کا دھواں دھواں پڑتا چہرہ دیکھا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”مجھے اس پر اتنا غصہ تھا امبر کہ میرا دل چاہا کہ بغیر کچھ کہے ہی اس کا سارے آفس کے سامنے منہ نوچ کر اسے اتنا بے عزت کروں کہ یہ کسی کو منہ دکھانے لائق بھی نہ رہے، مگر اس سے بھی پہلے اوپر والے نے تمہارا انصاف کر دیا امبر، بے راہ روی اور شراب نوشی کی بری لت نے اسے بالکل اندر سے ختم کر دیا ہے، وہ چین اسموکر بن چکا ہے ڈرگز لیتا ہے اور بے حساب لیتا ہے اور جانتی ہو امبر، اللہ کا انصاف اس نے اپنی مردانگی کے غرور میں تمہیں رسوا کیا اپنی نظروں گرایا مگر اب وہی ارمان ایڈز کا مریض ہے درد سے تڑپتا ہے تو ڈرگز اور شراب کا سہارا لیتا ہے مگر اسے سکون پھر بھی نہیں ملتا اس لئے کیونکہ اس نے تمہارا دل دکھایا ہے اور اسے صرف اب موت کی خواہش ہے اور اسے سے بھی پہلے تم سے معافی کی اور امبر ہم کچھ بھی نہیں ہیں مٹی کے پتلے کے سوا ہمارا غرور ہمیں کہیں کا نہیں رہنے دیتا ہم جب جب خود پر غرور کرتے ہیں ہمیں راس نہیں آتا کیونکہ اللہ کو غرور ناپسند ہے ہمیں اپنی اوقات سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں کرنا چاہیے ہم ایک انسان ہیں اور ہمیں انسانوں کی طرح سے انہی احکامات پر عمل کرنا چاہیے جس کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔“

”تم کہنا کیا چاہتی ہو شانی۔“ امبر نے اسے ایکدم ہی درشتی سے ٹوک دیا تھا۔

”ارمان کو معاف کر دو تا کہ اسے سکون سے موت نصیب ہو سکے۔“ شاندیل کے لہجے میں صدیوں کا دکھ تھا۔

”نہیں کر سکتی، کیونکہ میں اتنی اعلیٰ ظرف نہیں ہوں میں وہ اذیت نہیں بھول سکتی جو میں نے ان دو سالوں میں برداشت کی دن رات کے وہ پچھتاوے جو مجھے کسی انتقامی ناگ کی طرح

ڈستے رہے لہولہان کرتے رہے کیوں کروں میں اس پہ رحم کیا اس نے کیا تھا مجھ پہ۔" وہ روتے روتے چلائی۔

"مگر امبر...... اگر تم۔" شاندیل نے کچھ کہنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی اس نے ٹوک دیا۔

"بس اب تم مجھے مجبور نہیں کرو گی۔" یہ کہہ کے وہ اٹھ کے چلی گئی پھر گھر سے ہی نکل گئی اور لندن کی کڑی کیٹیلی ٹھنڈ میں بغیر کسی گرم شال کے رات دیر تک ٹہلتی رہی، اس کے احساسات برف میں ڈھل گئے تھے فیصلے کی رات عذاب بن کے اتری تھی اور قیامت برپا کر رہی تھی۔

☆☆☆

"ائم سوری ارمان، مگر میں اسے منا نہیں سکی۔" شاندیل اس کے سامنے بیٹھی تھی پچھلے دو دن سے وہ ہاسپٹل میں ایڈمٹ تھا اس کا ایڈز آخری اسٹیج پر تھا اور موت اس پر کسی بھی وقت مہربان ہو سکتی تھی، مگر موت اور زندگی کے درمیان وقفہ لمحوں میں صدیوں کا فاصلہ رکھتا تھا، ارمان نے اپنی آخری امید بھی ٹوٹتی محسوس کی۔

"جو کچھ اس کے ساتھ تم نے کیا ارمان، وہ سب وہ نہیں بھولا سکتی کبھی بھی نہیں۔"

"شاندیل اسے کہو صرف ایک بار مجھے سکون کی موت نصیب ہو جائے گی۔" وہ اس کے سامنے گڑگڑایا تھا وہ شخص جو کبھی جھکا تھا نہ کبھی کسی کے کام آیا تھا خود غرضی جس کے اندر کوٹ کوٹ کے بھری تھی اور دولت جس کا معیار اور ترجیح رہی تھی ہمیشہ اس نے رشتوں کو اہمیت نہیں دی تھی کبھی، مگر آج دولت بھی اس کے کام نہیں آ رہی تھی وہ خالی ہاتھ نہیں تھا ڈھیروں دولت کما چکا تھا مگر خالی دل تھا، اس دل میں صرف ویرانی، تنہائی اور اکیلے پن کا بسیرا تھا، بستر مرگ پر پڑے ارمان اسد کو اندرون شہر کے سب باسی یاد آئے تھے حتیٰ کہ اشنہ بھی، جو دیوانوں کی طرح اس کے پیچھے پھرا کرتی تھی اور جس کی آنکھوں میں وہ آنسو ہمیشہ کے لئے دے آیا تھا۔

"حوصلہ کرو ارمان، کانٹے بو کر پھولوں کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔" ارمان کو روتے ہوئے دیکھ کر اسے بھی دکھ رہا تھا مگر جو کچھ ماضی میں وہ کر چکا تھا اس کے لئے معافی اتنی جلدی نہیں مل سکتی تھی جتنی جلدی وہ توقع کر رہا تھا۔

شاندیل واپس گھر لوٹی تو امبر وہیں بیٹھی تھی جہاں وہ اسے بیٹھا چھوڑ گئی تھی شاندیل اسے بتا کے گئی تھی کہ وہ آج ارمان سے ملنے جائے گی شاندیل کے گھر کے اندر داخل ہوتے ہی وہ تڑپ کر اس کے پاس آئی تھی مگر پھر شاندیل کا سپاٹ چہرہ دیکھ کے ٹھٹک کے رک گئی تھی۔

"تم نے آج بہت دیر لگا دی۔" وہ سنبھل گئی شاندیل نے ایک نظر اسے دیکھا وہ صرف مضبوط نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"آفس میں دیر ہو گئی۔" شاندیل نے سرد لہجہ اپنایا کیونکہ وہ چاہتی تھی کہ امبر اپنا خول اتار دے۔

"کھانا لگاؤں؟" شاندیل کو دھچکا لگا تھا امبر کے سوال پر، اسے امید نہیں تھی کہ وہ ایسا جواب دے سکتی ہے۔

"نہیں مجھے ابھی بھوک نہیں ہے۔" اس نے ہنوز انداز میں جواب دیا ہے شاندیل کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی ساری حکایت جاننے کے باوجود بھی اسے ارمان پر ترس آ رہا تھا اسے صاف لگ رہا تھا کہ امبر اس کے ساتھ زیادتی کر رہی ہے۔

"شانی تم آج ارمان سے ملنے گئی تھیں۔" ضبط کا دامن بالآخر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا۔

"ہاں۔" شاندیل نے اسے محسوس نہیں ہونے دیا کہ اسے ارمان کے بارے میں پوچھنا کتنا اچھا لگا ہے۔

"کیسا ہے وہ۔" امبر کا لہجہ بھیگا ساتھ ہی آنکھیں بھی۔

"تمہارے خیال میں کیسا ہو سکتا ہے ایک موت کا منتظر انسان۔" وہ پلٹ کر اس سے استفسار کر رہا تھا۔

"یو نو واٹ امبر تمہارا پرابلم کیا ہے۔" وہ اس پتھر کی مورت کے پاس چلتی ہوئی لے آئی۔

"تم اپنا ایگو (انا) اس وقت استعمال کر رہی ہو جس وقت اس چیز کی ضرورت ہی نہیں ہے تم اس سے محبت کا دعویٰ کرتی رہی ہو مگر تم ایکچوئیلی میں محبت کے معنی سے ہی واقف نہیں ہو......"

"شانی، تم زیادتی کر رہی ہو۔" وہ بھرائے لہجے میں چلائی۔

"زیادتی۔" وہ استہزائیہ ہنسی۔

"میں کر رہی ہوں زیادتی تو تم خود جو کر رہی ہو اسے کیا کہو گی، تم ایک ایسے انسان سے بدلہ لے رہی ہو جو پہلے ہی ہارا ہوا ہے، پچھتاؤں کی جنگ لڑتے لڑتے وہ موت کی دہلیز تک جا پہنچا ہے اور تم اپنی ایگو بچانے میں لگی ہو، ویری فنی۔"

"یہ کیسی محبت ہے تمہاری امبر، کہ تم اپنے محبوب کی خاطر جوگ تو لے چکی ہو مگر اسے معاف نہیں کر رہیں، تم اسے تڑپ تڑپ کر مرتا ہوا دیکھ تو رہی ہو مگر اس کی اذیت کو کم نہیں کر رہیں بلکہ اپنی بے رخی کی مار سے دو چند کر رہی ہو آئم سوری، پر میں اسے محبت نہیں مانتی اور پلیز اب یہ رونا دھونا بند کرو، ہو جاؤ خوش وہ مر رہا ہے۔" اس نے لیپ ٹاپ آن کر کے اپنی طرف سے بات ختم کر دی۔

"میں خود میں اتنا حوصلہ نہیں پاتی کہ اس کا سامنا کر سکوں اس کی گزشتہ غلطیوں پر اسے معاف کر سکوں۔" وہ بے بس ہو کے رونے لگی، وہ ساری رات اس نے جاگتے ہوئے گزاری

تضاد

فرح طاہر قریشی

تھی، وہ پل صراط پہ کھڑی تھی۔

☆☆☆

فیصلہ مشکل تھا مگر ناممکن اس دنیا میں کچھ بھی نہیں ہوتا، ارمان نے جو بھی کیا وہ غلط سہی مگر امبر نے بھی غلط کیا، اپنے والدین کا کہا نہ مان کے۔

امبر ارمان سے محبت کا دم بھرتی تھی تو پھر محبوب کو معاف کرنے میں اتنا تامل کس لئے؟ حیرت کی بات ہے ناں، آپ لوگ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ امبر نے صحیح کیا ارمان اسی سزا کا حقدار تھا لیکن محبت میں درگزر ہی اسے عشق کی معراج پر پہنچاتی ہے۔

جس وقت وہ شاندیل کے ہمراہ ارمان کے پرائیویٹ روم میں داخل ہوئی اس کی سانسیں بکھر رہی تھیں ڈاکٹرز اس پر جھکے مختلف انجکشنز لگا رہے تھے کوئی آکسیجن ماسک منہ پر لگا رہا تھا، کوئی سینے پر دباؤ ڈال رہا تھا، امبر نے اپنا حوصلہ پست ہوتا محسوس کیا تھا، ارمان نے نہ سہی مگر امبر محمود نے اس شخص کو زندگی سے بڑھ کر چاہا تا وہ تڑپ کے اس کے پاس گئی تھی اور آن واحد میں معجزہ ہوا تھا اس نے دیکھا ارمان اسد کی دھڑکنیں معمول پہ آتی محسوس ہو رہی تھیں وہ یک ٹک امبر کو دیکھ رہا تھا اس کی آنکھیں پہلے حیرت سے کھلیں پھر آنسوؤں سے لبالب بھر گئیں، لندن ہاسپٹل کے پرائیویٹ روم میں کھڑے ڈاکٹرز اور نرسز نے دیکھا ارمان اسد امبر محمود کے سامنے ہاتھ جوڑ رہا تھا وہ اس سے معافی مانگ رہا تھا امبر دو قدم آگے بڑھی ڈاکٹرز ایک ٹرانس کی سی کیفیت میں پیچھے ہٹے، امبر نے ارمان کے کانپتے ہاتھ پکڑ لئے۔

"میں تم سے ناراض نہیں ہوں ارمان، تم معافی مت مانگو مجھ سے۔" وہ اس کے ہاتھ تھامے رو رہی تھی۔

"میں نے بہت غلط کیا۔" وہ پژمردہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا چکا تھا بمشکل تمام وہ بول پا رہا تھا۔

"تم جلدی ٹھیک ہو جاؤ گے اسٹریس نہ لو۔" امبر کو اپنی تسلی کھوکھلی محسوس ہوئی۔

"امبر میرے گھر والوں سے بھی کہنا مجھے معاف کر دیں اشنہ سے بھی۔" تبھی اس کا سانس بگڑا اور وہ بول نہیں پایا۔

"تم ان سب کو واپس پاکستان جا کے خود منانا ارمان، تم جلدی ٹھیک ہو جاؤ گے ارمان...... ارمان...... ارمان۔" اسے یوں ساکت دیکھ کے وہ ہراساں ہوئی ڈاکٹرز نے آگے بڑھ کے اس کا چہرہ ڈھانپ دیا۔

"یہ...... یہ...... بول کیوں نہیں رہا، اسے کہو شاندیل امبر اس سے ناراض نہیں ہے میں نے اسے معاف کر دیا ہے۔" وہ شاندیل کی طرف پلٹی جو اسے خود سے لگائے باہر لے جانے کی کوشش کر رہی تھی، ارمان کو صرف امبر کی معافی کا انتظار تھا اور معافی کے بعد اسے کس قدر سکون کی موت نصیب ہوئی تھی ارمان نے اس کے ساتھ بھلے غلط کیا مگر اس کے دل کا کوئی کونا بھی امبر کی محبت کے لئے روشن ہو کے آباد رہ گیا تھا وہ اور کونا ہمیشہ آباد رہا تھا۔

وہاں سے آنے کے بعد ملکوں ملکوں بھٹکنے کے بعد بھی ہر چہرے میں ارمان اسد نے لاشعوری طور پہ امبر محمود کا چہرہ ڈھونڈا تھا مگر کچھ گناہ ایسے ہوتے ہیں جن کی معافی ملتے ملتے زندگی ختم ہو جاتی ہے، ارمان اسد کے ساتھ ہی ہوا ہے قارئین آپ سب کا خیال ہے کیا آپ کو لگتا ہے کہ امبر محمود نے ارمان کو معاف کر کے اچھا کیا۔

☆☆☆

"مجھے کبھی بھی اس بات کی سمجھ نہیں آتی۔"

"کس بات کی؟" وہاں موجود بھی افراد بیک وقت اس کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

"اسی بات کی، کہ ہمارے لوگ اپنے ملک کی پڑھائی اور کمائی پر باہر کے ملک کی پڑھائی اور کمائی کو ترجیح کیوں دیتے ہیں، اپنے ملک کی آزادی پر گوروں کی غلامی کو کیوں پسند کرتے ہیں؟" اس کی سوچ کی پٹاری سے سوال باہر آیا تھا جسے سن کر منچلے بھیا نے کہا۔

"محترمہ! تمہارا یہ سوال اس قدر پیچیدہ بھی نہیں ہے کہ تمہیں اس کا جواب ہی نہ ملے، ذرا سی غور و فکر کرو اور ہمارے ملک کے درپیش حالات کو سامنے رکھو تو سیکنڈ سے بھی کم وقت میں تمہیں تمہارے اس سوال کا جواب مل جائے گا۔"

"ایسا تو نہیں ہے بھائی کہ میں نے بنا جواب کے سوچے ہی یہ سوال اٹھا دیا، میں نے بہت سے بھی کہیں زیادہ اس سوال پر سوچا ہے، مگر مجھے کبھی اس کا کوئی خاطر خواہ جواب نہیں مل سکا ہے، یہ کیا کہ ہم اپنی پڑھائی کو چھوڑ کر فخر سے پھولے نہ سماتے ہوئے باہر کوچ کر جائیں، صرف اس لئے کہ وہاں کی ڈگری اہمیت زیادہ رکھتی ہے، وہاں کے ڈالرز زیادہ اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ڈگری کے آگے تو قابلیت زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے ناں؟ ہم اپنی قابلیت پر یہاں کی ڈگری پر بھی تو بہت کچھ کر سکتے ہیں ناں؟" وہ کچھ زیادہ ہی الجھی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"ہاں تو تم قابلیت کو مت دیکھو ناں عابی تم حالات کو دیکھو، یہ تو مانتی ہو ناں حالات انسان کو کچھ بھی کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں؟ انہی حالات کو سامنے رکھو، جانتی ہو یہاں ہمارے ملک میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگری ہولڈر کس پوسٹ پر جاب کرنے پر مجبور ہیں؟ اونلی فائن سکیل کی دس ہزار کی تنخواہ کی عام سی پوسٹ پر، اب سوچو ان کی اتنی اہم ڈگری کے بل پر انہیں کیا مل رہا ہے؟ کس قدر بے ایمانی اور ناانصافی ہو رہی ہے، کم ڈگری کے حامل لوگ اچھی پوسٹ پر جبکہ اچھی ڈگری کے حامل لوگ کم پوسٹ پر کام کر رہے ہیں، اس قدر رشوت اور سفارش کے عروج پر وہ کیا کریں؟ انہی حالات نے لوگوں کے ذہنوں میں لالچ بھر دیا ہے کہ جب وہ یہاں کی بجائے باہر کسی ملک کی ڈگری لے کر یہاں آئیں گے تو انہیں اپنے ملک میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتے گا اور پھر ان کا یوں لالچ کرنا کچھ غلط بھی تو نہیں ہے، ایسا ہی تو ہو رہا ہے یہاں؟ تو بہنا جس ملک میں پڑھائی کا یہ حال ہو تو وہاں پڑھے لکھے لوگوں کو کمائی میں کیا ملے گا؟ ہم لوگوں کو غلط نہیں کہہ سکتے ہیں، بہت ساری وجوہات مل کر انہیں ایسا کرنے پر مجبور کرتے ہیں، ورنہ دوسروں کی غلامی اس طرح کون پسند کرتا ہے؟" بھیا نے خاصی تفصیل سے اس کے سوالات کا جواب دے کر استفہامیہ اس کی طرف دیکھا تھا، جہاں مطمئن نہ ہوئے تاثرات بڑے واضح تھے، بھیا نے بہت غور سے اس کے چہرے کو دیکھا پھر کہا۔

"سوال کے جواب کے بعد بھی تم بے چین دکھائی دیتی ہو، جو اسی بات کا واضح ثبوت ہے کہ تم کچھ اور کہنا چاہتی ہو۔"

"کیا میں ٹھیک ہوں؟" وہ اس کی طرف دیکھ رہے تھے تب اس نے گردن ہلاتے ہوئے ہنکارا ابھرا۔

"اونہہ۔"

"تو پھر خواہ مخواہ میں وقت ضائع کیوں کر رہی ہو جو کہنا چاہتی ہو سیدھی طرح کہو۔" اس بار بھیا کا لہجہ کچھ تیکھا سا ہو گیا جس پر ایک دم بھی کی

ہنسی بلند ہوئی تھی، وہ ایک دم تپ سی گئی۔

"تم سب اپنے دانت اندر کرو، ہر وقت ہی ٹوتھ پیسٹ کی مشہوری کرتے دکھائی دیتے ہو۔" ان کے دانت فوراً اندر ہوئے تھے، ان کی طرف سے مطمئن ہو کر اس نے اپنی توجہ کا رخ بھیا کی طرف کیا۔

"جب آپ کو محسوس ہو رہا تھا میں کچھ اور کہنا چاہتی ہوں تو تبھی کیوں نہ پوچھ لیا خواہ مخواہ لوگوں کا سیروں خون بڑھا دیا۔" اس نے تیکھی نظر سے چھوٹے بہن بھائیوں کی طرف دیکھا تھا جو اب خاصی باادب دکھائی دے رہے تھے، اس کے انداز نے خود بھیا کو بھی مسکرانے پر مجبور کر دیا تھا جبھی ہلکا سا مسکراتے کہنے لگے۔

"لیں بالکل پوچھ لینا، مگر تم جیسی حب الوطنی ہستی کو پہلے تمہارے اس پیچیدہ سوال کا جواب دینا زیادہ بہتر ہو لگا مجھے، جواب اسی لئے دیا تاکہ تمہارے جلے دل کو تھوڑا بہت سکون نصیب ہو جائے۔"

"یہ تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو بیٹا، اس لڑکی کی واقعی کوئی کل سیدھی نہیں ہے، ہمیشہ بات کو گھما کر رکھ دیتی ہے۔" امی نے بھی اسے لتاڑا تھا جس پر وہ برا سا منہ بنا کر رہ گئی۔

"بس سب کو موقع چاہیے ہوتا ہے مجھے ڈانٹنے کا۔"

"تو پھر ایسے کام کرتی کیوں ہو؟" امی کا جواب فوراً حاضر تھا، وہ لاجواب ہو کر رہ گئی۔

اس وقت وہ سب ہی فراغت کے لمحات کو انجوائے کرتے ہوئے دادی جان کے کمرے میں محفل جمائے بیٹھے تھے، ابھی کچھ دیر تک کچھ خصوصی مہمانوں کی آمد متوقع تھی جن کا انتظار کئی روز سے جاری تھا، عابیہ کے والد اور بڑے بھائی انہی خصوصی مہمانوں کو ریسو کرنے ائیرپورٹ جا چکے تھے، دادی جان اس کی روہانسی صورت دیکھ کر اس کی مدد کو آئی تھیں۔

"یہ کیا تم میری بچی کو ہر وقت تنگ کیے رکھتے ہو۔"

"ہم کہاں تنگ کر رہے ہیں دادی، آپ کی بچی خود اپنے ہی سوالوں میں الجھی تنگ ہو رہی ہے ہم تو بس اس کو ان کی الجھن سے نکلنا چاہتے ہیں۔" بھیا نے شوخی سے جواب دیا تھا۔

"اچھا بس کرو اب، مجھے بات کر لینے دو۔" ان کو ڈپٹنے کے بعد دادی جان نے اپنی توجہ کا رخ اس کی سمت کیا جو ان کی حمایت پا کر خوشی محسوس کر رہی تھی۔

"ہاں عابیہ تم بتاؤں کس بات نے تمہیں اس طرح الجھا کر رکھ دیا ہے؟" دادی جان کا انداز پیار سے بھرا تھا، اس کی ہمت خوب بندھی تھی۔

"اگر میں کچھ کہوں تو آپ ناراض تو نہیں ہوں گی؟" کہنے سے پہلے اس کو اس طرح اجازت طلب کرتے دیکھ کر وہ بھی حیرت میں گھرے اسے دیکھ رہے تھے۔

"ایسی کیا بات ہے آپی، جس کو کہنے کے لئے آپ کو اجازت درکار ہے؟" سب کی طرف سے انابیہ نے سوال کیا تھا۔

"دادی ہاں کریں تو میں کچھ کہوں۔" اس نے سوالیہ نگاہوں سے دادی کی طرف دیکھا، جنہوں نے مسکرا کر اسے بولنے کی اجازت دی تھی۔

"ہاں کہو۔" اجازت ملتے ہی وہ بولنا شروع ہوئی تھی۔

"مجھے اس بات نے حد سے زیادہ الجھا رکھا ہے کہ آخر جب ہمارے لوگ یہاں سے پڑھنے یا کمانے کی خاطر باہر جاتے ہیں تو پھر وہ

وہاں جا کر اپنے اصل مقصد کو نظر انداز کیے ہزار یا مجبوریوں کو بہانہ بنا کر خود کو وہاں کے رنگ میں رنگنے کیوں لگتے ہیں؟ اور پھر تابوت میں آخری کیل اس وقت ٹھوک دی جاتی ہے جب انہیں وہاں کی نیلی آنکھوں اور سنہری زلفوں والی میم سے شدید قسم کا عشق ہو جاتا ہے، اب یہ ان کا سچا عشق ہے یا گرین کارڈ کا خوبصورت لالچ، کچھ بھی کہنا قبل از وقت ہوتا ہے، مگر جو بھی ہو اس سے وہ اپنے گھر اپنے وطن کو بری طرح فراموش کر دیتے ہیں آخر ایسا کیوں؟ اور حیرت تو اس بات کی ہے وہ سب کچھ فراموش کیے ہی رکھتے ہیں اصل ہوش انہیں تب آتا ہے جب وہ والد محترم بن چکے ہوتے ہیں، وہ بھی بیٹی کے والد، پھر بیٹی کو جوان ہوتے دیکھ کر انہیں یہ احساس شدت سے ہونے لگتا ہے کہ وہ غلط جگہ زندگی گزار رہے ہیں، اس وقت وہ واپسی کے لئے پر تولنے لگتے ہیں، آخر پہلے سے انہیں واپسی کا خیال کیوں نہیں آتا، اس وقت ہی کیوں؟ جب خود ان کی اولاد اس ماحول کی عادی ہو چکی ہوتی ہے، اس وقت اس طرح ملک کی تبدیلی ان کی اولادوں پر کس قدر ناگوار گزرتی ہے یہ جاننے کے باوجود بھی وہ رسک لئے واپس لوٹ آتے ہیں، پھر وہ یہ تک جاننے کی کوشش بھی نہیں کرتے کہ ان کے اس فیصلے سے ان کی اولاد خوش بھی ہے یا نہیں؟ جو اگر ان کی اولاد ناخوش ہو کر ان سے بغاوت پر اتر تی ہے تو انہیں سخت برا لگتا ہے، حالانکہ اس سب کے ذمے دار تو وہ خود ہوتے ہیں ناں؟" اس کی اس قدر لمبی چوڑی جذباتی تقریر کو ان سبھی نے بڑی خاموشی سے سنا تھا، اس کے ان اتنے سارے سوالوں کا ان کے پاس شاید کوئی جواب بھی نہیں تھا، کیونکہ اگر وہ ایسا سوچ رہی تھی تو یہ غلط بھی نہیں تھا، ایک طرح سے یہ ایک ایسی تلخ حقیقت تھی جس سے خود انہیں بھی انکار نہیں تھا۔

"ماں جی دیکھنا اس لڑکی نے ہمیں مہمانوں کے سامنے جی بھر کے شرمندہ کروانا ہے، اس کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا ہے یہ رباح کو سخت ناپسند کر رہی ہے، بس اس کے آنے کی دیر ہے یہ تو اٹھتے بیٹھتے اس کا یہاں رہنا دوبھر کر دے گی، اسے جان بوجھ کر یہ احساس دلائے گی کہ وہ ایک ایسی ماں کی بیٹی ہے جو غیر مسلم تھی، جو اس کے باپ کو چھوڑ کر اپنے آشنا کے ساتھ فرار ہو گئی، وہ بچی بیچاری تو احساس ندامت سے ہی مر جائے گی میں تو اسے سمجھا کر تھک چکی ہوں ماں جی، اب آپ ہی اسے سمجھائیں تاکہ یہ اپنی پسندیدگی کو صرف اپنے تک محدود رکھے۔" آخر میں انہوں نے دادی جان کی طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھا تھا۔

"نہیں بہو، ہماری عابیہ ایسی تو نہیں ہے کہ اس طرح کسی کو شرمندہ کرے، کسی کو اس کے ماضی کے حوالے سے طعنے دے، مجھے پورا یقین ہے یہ رباح کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کرے گی، ہے ناں عابیہ؟" انہوں نے جواب طلب نظروں سے اس کی سمت دیکھا۔

"میں کوشش کروں گی دادی جان۔" اس نے لب بھینچ کر اپنی ناپسندیدگی کو اپنے اندر اتارنا چاہا تھا، وہ ایسی ہی تھی اسی کے لئے کسی ناپسندیدہ ہستی کے ساتھ کچھ پل بھی گزارنا خاصا دشوار ہوا کرتا تھا، جبکہ اب تو رباح کو شاید اسی کے ساتھ رہنا تھا، سوچ سوچ کر ہی اسے پریشانی سی ہونے لگی تھی۔

رباح اس کے چچا کی بیٹی تھی، وہ عرصہ دراز سے لندن میں مقیم تھا، جو اب رباح کے بڑے ہونے کا خیال کر کے اپنے وطن میں اپنوں کے

پاس لوٹ آنے والا تھا، رباح چونکہ لندن میں پلی بڑھی تھی تو ان سب کا پہلا خیال یہی تھا کہ وہ اپنے مذہب کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی ہو گی، وہاں کی باشندہ ہونے کے ناطے وہ وہاں کے لوگوں ہی کی طرح کی سہی ہو گی، یہی وجہ تھی یہ سب سوچ لینے کے بعد اسے رباح سے سخت الرجک شروع ہو چکی تھی۔

اس کے جواب میں انہیں تسلی ہوئی یا نہیں مگر اس کی خاموشی سے انہیں یہ اطمینان ضرور ہو گیا تھا کہ وہ رباح کو کچھ کہے گی نہیں۔

☆☆☆

رضا گیلانی کے دو بیٹے تھے، احمد گیلانی اور حماد گیلانی۔

احمد گیلانی کی شادی ہو چکی تھی ان کے چار بچے تھے، جبکہ حماد گیلانی کئی سال پہلے رضا گیلانی کی وفات کے بعد سب کی مخالفت کے باوجود اپنی اچھی خاصی نوکری کو چھوڑ کر اچھے مستقبل کی خواہش لئے لندن کوچ کر گیا تھا، اس کے اس فیصلے سے وہ سب بری طرح ناراض ہوئے تھے، لندن جانے کے کچھ عرصہ بعد حماد نے جینی نامی ایک فارنر سے شادی کر لی، جس سے اس کی ایک بیٹی رباح تھی، حماد جیسا بھی صحیح مگر ایک مسلمان مرد تھا جو اپنی بیوی کی اتنی کھلی آزادانہ زندگی کو ہضم نہیں کر سکا تھا جبھی اس پر ہر سے روک ٹوک کرنے لگا، جس کی بنا پر اس سے تنگ آ کر جینی نے رباح کی پیدائش کے کچھ عرصے بعد اسے چھوڑ کر اپنے کسی دوسرے آشنا کے ساتھ شادی کر لی، رباح اس وقت بہت چھوٹی تھی وہ چاہتا تو اس وقت واپس آ سکتا تھا، مگر ان سب کی ناراضگی کو سوچ کر اس نے اپنے آنے کے خیال کو ملتوی کیا اور خود جیسے تیسے کر کے رباح کی پرورش کرنے لگا، رباح اپنی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی خود وہ بھی بیمار رہنے لگا تھا، اپنوں کا خیال بہت شدت سے اسے ستانے لگا تو اس نے تمام ڈر اور وسوسوں کو ایک طرف کر کے پاکستان میں مقیم اپنی فیملی سے معافی مانگنے کے لئے کال کی، وقت بہت سا گزر چکا تھا، ان کے دلوں میں موجود اسی کے لئے جو بھی ناراضگی تھی اب بہت کم رہ گئی تھی جو اس کے معافی مانگنے پر بالکل ختم ہو گئی تھی، ان کی معافی ملنے کی دیر تھی، وہ فوراً ہی پاکستان آنے کے لئے بے چین ہوا تھا، یہی وجہ تھی وہ آج رباح کے ساتھ بیس سال بعد اپنوں کے درمیان واپس آ رہا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے مزید انتظار کے بعد آخر کار حماد گیلانی نے رباح کے ہمراہ گیلانی ہاؤس میں قدم رکھ ہی دیا، ان سبھی نے خوش دلی سے ان کا استقبال کیا تھا، حماد سے ملنے کے بعد جب ان کا سامنا رباح سے ہوا تو انہیں شدید قسم کا جھٹکا لگا تھا، وہ ان کے خیالوں کے بالکل برعکس تھی۔

شلوار قمیض میں ملبوس ڈھائی گز کا بڑا سا دوپٹہ اپنے گرد لپیٹے وہ ان کے خیالوں کو بری طرح رد کر رہی تھی۔

"السلام علیکم!"

یہ دوسرا شدید جھٹکا تھا جو اس کے سلام کرنے پر ان کو پہنچا تھا، ان کا خیال تھا وہ ان سے مل کر پکے انگریزی سٹائل میں ہائے ہیلو کرے گی، مگر اس کے سلام نے ان سب کے ساتھ ساتھ دادی جان کو بھی خوش گوار حیرت میں مبتلا کیا تھا، جبھی اسے پیار سے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے دادی جان نے استفسار کیا تھا۔

"آپ کو یہ سب کس نے سکھایا بیٹا؟"

"مجھے یہ میرے پاپا نے سکھایا، دادی جان!"

''ماشا اللہ۔'' دادی جان خوش ہو کر حماد گیلانی سے بولیں تھیں۔

''بیٹی کی تربیت تو تم نے خوب کی ہے حماد۔'' ان کے الفاظ پر شرمندہ ہوتا حماد ہلکے سے گویا ہوا تھا۔

''امی جان، میں نہیں چاہتا تھا جو غلطی میں نے کی اس کی سزا میری بیٹی کو ملے، بس اسی لئے جیسے ہی اس نے شعور کی دنیا میں قدم رکھا میں نے خود اپنی ہر غلطی کو اس کے سامنے بیان کر دیا، آج یہ اپنی ماں اور اپنے باپ کے متعلق بھی کچھ اچھے سے جانتی ہے۔''

''یہی وجہ ہے کہ مجھے اب ایسا کوئی ڈر نہیں ہے کہ میرے ماضی کے متعلق میری بیٹی کو کسی سے سن کر شاک نہیں لگے گا، یہ ہرٹ نہیں ہوگی کیونکہ یہ سب وہ پہلے سے جانتی ہوگی، یہ سب اسے بتانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے جو بھی کیا اس کی وجہ سے آج تک آپ لوگوں سے نظر نہیں ملا پاتا ہوں، ایسے میں میں اپنی اولاد کے سامنے شرمندہ ہونا نہیں چاہتا تھا، اسی لئے بنا کچھ چھپائے سب کچھ رباح کو بتا دیا اور اس کی تربیت اسی طرح تھی جتنی اور جیسے میں کر سکتا تھا، اب وہ جو بھی کمی بیشی آپ محسوس کریں پوری کر دیجئے گا۔'' اس کا انداز شرمندگی سے دو چار تھا جسے محسوس کر کے احمد گیلانی نے اس کے کندھے پر بازو دراز کرتے ہوئے اسے ان احساسات سے باہر نکالنے کی خاطر کہا۔

''تم نے جو بھی کیا اچھا کیا اور پھر رباح بھی ہمیں خاصی سمجھدار محسوس ہوئی ہے۔'' ان کے لفظوں سے حوصلہ پاتے ہوئے حماد گیلانی مسکرا دیا، اسی پل امی کمرے میں داخل ہوئی اور مسکرا کر بولیں۔

''باقی باتیں بعد میں، ابھی ڈنر کا وقت ہو چکا ہے، پہلے ڈنر کر لیں پھر ان لوگوں کو آرام بھی کرنا ہوگا۔''

پھر سب ڈائننگ ٹیبل پر جمع ہو گئے جہاں عابیہ نے ماں کے ساتھ مل کر کھانا سرو کر دیا تھا، خوشگوار ماحول میں ڈنر کرنے کے بعد احمد گیلانی اپنی اسی آرام گاہ کی طرف بڑھ گئے جو لندن جانے سے پہلے ان کے مخصوص تھی۔

رباح کے لئے ابھی کوئی کمرہ مخصوص نہیں کیا گیا تھا، اسی لئے آج رات اس کا قیام عابیہ اور انابیہ کے کمرے میں تھا سو وہ ان کے ساتھ ان کے کمرے میں چلی آئی۔

☆☆☆

کمرے میں داخل ہو کر رباح چاروں طرف نظریں گھمائے اچھی طرح کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔

یہ ایک اچھا خاصا ویل ڈیکوریٹ اور کشادہ کمرہ تھا، کمرے کی ڈیکوریشن اس کے مکین کی نفاست کو خوب ظاہر کر رہی تھی، اسے سکون محسوس ہونے لگا، اسے اس طرح معائنہ کرتے دیکھ کر عابیہ مسکرا کر بولی۔

''کیا ہوا؟ کمرہ پسند نہیں آیا؟''

''ایسی بات نہیں ہے، آپ کا کمرہ بہت خوبصورت ہے، اپنے گھر میں، میں نے بھی اپنا کمرہ اسی طرح سجایا ہوا تھا۔'' بات کے اختتام تک وہ ذرا سی اداس ہو گئی، اس کی اداسی محسوس کر کے انابیہ نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

''تمہیں اپنا گھر یاد آرہا ہے؟''

''ہاں۔'' اس نے سر جھکا کر اعتراف کیا، مگر دوسرے ہی پل اس نے تیزی سے کہا۔

''مگر یہ سب وقتی ہے، وقت کے ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

"پاپا کی اور میری شروع سے یہی کمٹمنٹ تھی کہ ایک دن ہم نے پاکستان واپس آنا ہے اسی لئے میں نے خود کو تیار کر رکھا تھا، یہی وجہ ہے مجھے بہت زیادہ دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا ہے، ہاں یہ سچ ہے میں اتنی جلدی وہ سب بھول نہیں پا رہی ہوں۔" سر جھکائے معصومیت سے اعتراف کرتی وہ اس سے بہت معصوم دیکھائی دے رہی تھی، انابیہ ایک دم مسکرا دی، جبکہ عابیہ کمپیوٹر چیئر پر بیٹھی گردن موڑے اسے دیکھ رہی تھی، اس سے پہلے کہ انابیہ تسلی میں اسے کچھ کہتی، رباح کے سیل کی ٹوٹو نے اس کے کھلتے لبوں کو بند کر دیا۔

رباح نے سیل کو ہاتھ میں لیا اور موبائل سکرین پر نظر آتے نمبر کو دیکھا تو پل میں اسی کے اداس و مغموم چہرے پر خوشی کے تاثرات نمودار ہوئے تھے۔

"اس کے خوشی بھرے تاثرات سے کوئی بھی اندازہ کر سکتا تھا کہ فون کسی خاص ہستی کا تھا۔" عابیہ چیئر کا رخ بدلتی پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی، جبکہ انابیہ اسی طرح مسکراتی ہوئی اس کے تاثرات میں الجھی تھی۔

تقریباً دس منٹ کی بات کے بعد رباح خوشگوار موڈ میں کال ڈسکنکٹ کرتی ان کی طرف متوجہ ہوتی معذرت بھرے لہجے میں بولی۔

"سوری، دانیال کی کال تھی، وہ جاننا چاہتا تھا ہم خیریت سے گھر پہنچ گئے۔"

"دانیال، تمہارا بوائے فرینڈ؟" عابیہ کی پیشانی پر بہت سی شکنیں ایک ساتھ نمودار ہوئی تھیں۔

"بوائے فرینڈ؟" اس کے لفظوں کو دوہراتی وہ ایک دم چونک کر اس کے چہرے کو دیکھنے لگی جہاں بہت ساری شکنوں کو دیکھ کر وہ ایک دم سیدھی ہوئی تھی۔

"آپ کو ایسا کیوں لگا کہ دانیال میرا بوائے فرینڈ ہوگا؟"

"تو پھر؟" اس نے تیکھی نظر سے اس کی سمت دیکھا۔

اس کے اتنے کڑوے انداز پر اس نے لب بھینچ کر کچھ پل اس کی طرف دیکھا تھا، پھر کچھ سوچ کر اس نے گہرا سانس لیا اور کہنے کے لئے جوں ہی لب کھولے عابیہ نے فوراً ہی اسے ٹوک دیا۔

"رباح ڈیئر، تم شاید نہیں جانتی ہمارا مذہب ہمیں اس بات کی ہرگز بھی اجازت نہیں دیتا ہے، کہ ہم غیر محرم سے ملیں، یا اس سے کسی بھی قسم کا تعلق رکھیں۔"

"مگر عابیہ آپی......" وہ شاید کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس نے ایک بار پھر اس کی بات کو کاٹ دیا تھا۔

"ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی ہے۔"

"اوکے پہلے آپ بول لیں۔" رباح نے خود کو ریلیکس چھوڑتے ہوئے خود کو اس کی کڑوی کسیلی شک بھری باتیں سننے کے لئے تیار کیا تھا۔

"تمہیں ایک غیر محرم کال کر رہا ہے اور تم، اس کی کال دیکھ کر اس قدر خوشی کا اظہار کر رہی ہو یہ سب بہت غلط ہے، تمہارے اس فعل سے تمہیں کس قدر گناہ ملا ہوگا اس کا شاید تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے۔" اپنی بات مکمل کر کے اس نے اس کی طرف دیکھا جو اس کے خاموش ہونے کے بعد بھی اسی طرح چپ بیٹھی اس کی شکل دیکھ رہی تھی، وہ تینوں ہی خاموش تھیں، کچھ پل کی خاموشی کے بعد رباح نے اس کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے بولنے کی اجازت چاہی۔

"کیا میں اب کچھ بول سکتی ہوں؟"

"ہنہ۔" عابیہ نے بولے بنا ہنکارا بھرا تھا۔

"آپ ہمارے متعلق کس قدر غلط سوچتی ہیں عابیہ آپی، اس کا اندازہ تو مجھے ہو چکا، مگر اس طرح کسی پر تنقید کرنا اور اس کے متعلق غلط رائے قائم کر لینا بڑا آسان ہوا کرتا ہے، دانیال کا نام سن کر آپ نے خود ہی سے فرض کر لیا کہ وہ میرا بیسٹ فرینڈ ہوگا، پھر مجھے کچھ بھی بولنے کا موقع دیئے بنا آپ نے کچھ بھی بول دیا، ورنہ میں آپ کو بتاتی کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہے، دانیال میرا بوائے فرینڈ نہیں ہے، وہ میرا اس وقت کا ساتھی ہے جب میری ماں مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھی......"

بات کو ادھورا چھوڑتی وہ کچھ پل کو چپ ہوئی تو عابیہ نے فوراً کچھ کہنا چاہا، مگر اس بار رباح نے اسے چپ کروا دیا۔

"اب مجھے بول لینے دیجئے، مجھے پتا ہے اب آپ نے ساتھی کا مطلب کچھ اور اخذ کر لیا ہو گا مگر پلیز آپی اس قدر بدگمان مت ہوں، وہ میرا ساتھی ہے، جسے آپ میرا دودھ شریک بھائی کہہ سکتی ہیں۔" آخر میں رباح کا لہجہ کچھ مسکراتا ہوا محسوس ہوا تھا، اس کے لفظوں کا اثر تھا کہ عابیہ کے لئے نقوش پہلے کی نسبت ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

"جی ہاں وہ میرا بھائی ہے، جب ممی مجھے چھوڑ گئی تھیں میں بس چند دن کی تھی، تب دانیال کے ساتھ ممی نے مجھے بھی فیڈ کروایا تھا، فرینڈ یا بوائے فرینڈ کا تو پھر کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس کی کال نے مجھے اس لئے خوشی دی کیونکہ وہ ہمیں بھولا نہیں تھا، وہ لوگ وہاں ہمارے لئے پریشان ہو رہے تھے کہ ہم خیریت سے ہیں یا نہیں، وہ لوگ ہمارے سگے نہیں تھے مگر دیار غیر میں انہوں نے ہمیشہ سگوں سے بڑھ کر ہمارا خیال رکھا ہے، رشتے صرف خون ہی کے نہیں ہوتے آپی، احساس کے رشتے بھی اہمیت رکھتے ہیں، جس طرح پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہو سکتی اسی طرح سب لوگ بھی برے نہیں ہو سکتے، مانتی ہوں آزاد فضا میں رہنے والے اکثر لوگ آزاد زندگی گزار رہے ہوتے ہیں مگر یہ لازمی تو نہیں ہم بھی انہی کے جیسے ہوں؟ ہمارے لئے آپ نے خود ہی فرض کر لیا کہ ہم بھی انہی کے جیسے ہونگے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، پاپا نے ہر ممکن کوشش کی کہ مجھے دین اور دنیا کی سمجھ دے سکیں، ہمارے مذہب میں کس چیز کی اجازت ہے اور کس کی نہیں میں بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں۔" اس کے لفظوں میں محسوس کی جانے والی کاٹ تھی عابیہ شدید شرمندہ دیکھائی دے رہی تھی۔

"ہم باہر کے لوگوں کی ذرا ذرا سی حرکت پر نظر رکھی جاتی ہے، مگر میں نے تو یہاں آنے تک بہت سی مسلمان لڑکیوں کو اسی طرح چست لباس میں دیکھا جس طرح کا لباس ہمارے ملک میں عام استعمال کیا جاتا ہے، بے حیائی کے اور بھی بہت سے مظاہرے دیکھنے میں آئے یہاں تک کہ لڑکی لڑکے کے ساتھ گھومتی بھی دیکھائی دی، اسے آپ کیا کہیں گے؟ کیا یہ بوائے فرینڈ گرل فرینڈ کے زمرے میں نہیں آتا؟ یا پھر سارے گناہ اور ثواب ہمارے لئے مقرر ہیں؟" اس نے اپنے لفظوں سے اسے اس کے غلط ہونے کا احساس بہت اچھی طرح کرا دیا تھا سچ کہا تھا اس نے کسی دوسرے پر انگلی اٹھا دینا اس کے متعلق کوئی بھی رائے قائم کر لینا بڑا آسان ہوا کرتا ہے مگر جب بات خود پر آ جائے تو نظریں چرا لی جاتی ہیں، کیا یہ کھلا تضاد نہیں؟

☆☆☆

اک جہاں اور

سدرۃ المنتہیٰ

پچھلی قسط کا خلاصہ

امرت کے لئے نئی نوکری ایک چیلنج ثابت ہوتی ہے، اسے پہلے دن ہی کئی تبدیلیاں کرنی پڑتی ہیں، اپنے ساتھی ایڈیٹر سے کچھ شکایت ہے جس کے بارے میں وہ سیکرٹری سے بات کرتی ہے۔

عمارہ گوہر کی چچا زاد ہے، گوہر کے ماں باپ ان دونوں کی شادی کے خواہشمند ہیں عمارہ تایا تائی کے ساتھ رہتی ہے، بچپن سے، کیونکہ اس کے باپ کی وفات کے بعد ماں دوسری شادی کر کے باہر سیٹل ہو جاتی ہے جس وجہ سے عمارہ ماں سے بہت نفرت کرتی ہے، اسی وجہ سے اسے اپنی خالہ اور خالہ زاد امرت سے سخت قسم کی چڑ ہے۔

گوہر رات گئے گھر لوٹتا ہے تو اسے عمارہ کی نانی کی فوتگی کا پتہ چلتا ہے۔

گوہر عمارہ کو ایک عمر رسیدہ خاتون اور لڑکی کے بارے میں بتاتا ہے جس کے کئی نام ہیں، عمارہ کو اس کی بات پر یقین نہیں آتا۔

عمر رسیدہ خاتون بات کرنے لگی ہیں، چلنے پھرنے لگی ہیں جس پر گوہر بے حد حیران ہے، فنکار اپنے گھر کے تہہ خانے میں پھنس جاتا ہے جہاں سے نکلنا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے وہ بری طرح سے زخمی ہے اور اسے اپنی موت یقینی محسوس ہوتی ہے۔

تیسری قسط

وہ صبح کی پہلی کرن تھی، جو روشندان کی درز چیرتی ہوئی روشنی اندر لے آئی تھی، اس ایک ننھی سی کرن دھندلاہٹ کو چیرنے کا کام کیا تھا وہ جگہ جو رات بھر اندھیرے نے گھیر رکھی تھی وہاں اب روشنی اپنا پیغام پہنچانے میں کچھ کچھ کامیاب ہو رہی تھی، جو کہ روشنی پھیل جاتی ہے جبکہ اندھیرے کو گھیرنے کے لئے بہت سی جگہ چاہیے ہوتی ہے، یہ ایک معمولی سی لکیر تھی جو زندگی کے ہونے کا پتہ دے رہی تھی۔

فنکار نے پوری کوشش سے آنکھیں کھولی تھیں اور اس روشنی کی لکیر کو پھیلتے ہوئے دیکھا اور یقین کرنا چاہا تھا، اگلے پل ایک لمبی سانس خارج کرنا چاہی جو خارج ہونے کے باوجود بھی سینے میں اٹکی سی تھی۔

عبدالحادی نے اپنا سر اٹھانا چاہا تھا اور اس حرکت سے ہی سر میں شدید درد کی ٹیس اٹھی تھی، ٹھنڈا فرش جیسے زخم دہکا رہا تھا، جیسے آگ دہکاتی ہے زخموں سے اٹھے سینے پر کوئی بوجھ ویسے ہی گرا ہوا تھا اس نے ہاتھ اٹھا کر یہ بوجھ ہٹانا چاہا تھا مگر جسم میں اتنی طاقت نہیں تھی یہ کوئی ٹوٹی ہوئی کرسی تھی جو اس کے سینے پر گری تھی، جس سے سانس بند ہوتی ہوئی محسوس ہوتی تھی، مگر اس کے باوجود بھی وہ زندہ تھا، اس کی آنکھوں سے آنسو گر کر داڑھی کے بالوں میں جذب ہونے لگے۔

"تو میں کب تک یہاں پڑا رہوں گا، آخر کو مجھے اٹھنا ہے۔" اس نے خود کو ہمت دینا چاہی تھی، مگر اردگرد لڑھک کر گرتی ہوئی چیزوں کا جو ڈھیر تھا اس میں زخموں سمیت خود کو رہا کروانا ذرا مشکل تھا، کھٹ کھٹ کی آوازیں سماعتوں سے ٹکرائیں تو اسے کچھ اطمینان سا ہوا یہ شاید خود اس کی اپنی رہائی کی کوشش تھی مگر نہیں کوئی تھا، کوئی تھا جسے اللہ نے بھیجا ہو گا۔

کوئی تہہ خانے کی سیڑھیاں اترتا ہوا اندر آ رہا تھا، گہرائی میں جہاں بے ترتیب چیزوں کے ڈھیر بکھرے پڑے تھے، وہ تیز رفتار آدمی سیڑھیاں اترتا ہوا کسی چیز میں اٹک گیا تھا، پھر وہ نیچے جھک کر وہ چیزیں ہٹانے لگا تھا۔

"یہاں کوئی ہے؟ پروفیسر صاحب، یہاں کوئی ہے؟"

"میں ہوں۔" خود ان کی آواز سماعتوں کو نامانوس سی لگی تھی۔

نوجوان بڑی برق رفتاری سے ٹارچ گھماتا ہوا اندر آیا تھا، چیزوں کے ڈھیر سے انسانی آواز کچھ عجیب سی لگی تھی۔

نوجوان نے ایک ایک چیزیں اٹھا کر ملبا ہٹایا تھا، اتفاق سے اس کا پاؤں فنکار کے زخمی انگوٹھے پر لگا اور ان کی چیخیں بلند ہوئیں تھیں۔

"کچھ نہیں ہوا، خیریت ہے۔" وہ بوکھلا کر احتیاط سے آگے بڑھا تھا، ان کے قریب آ کر گھٹنے ٹیک کر فرش پر جھکا اپنا ہاتھ ان کے سامنے کیا۔

"باہر چلنا ہے نا۔" (مدد کرنے کا بھی نرالہ انداز تھا)

"تم کون ہو؟" سینے پر سے بوجھ ہٹتے ہی جیسے سانسوں کی رفتار درست ہوئی تھی کچھ کچھ۔

"نام علی گوہر، کام لور لور پھرنا، پروفیسر غفور نے بھیجا ہے، رات ساڑھے تین بجے پیغام ملا تھا۔" اس نے سہارا دے کر انہیں اٹھاتے ہوئے بتایا تھا۔

"کس نے پیغام دیا؟" وہ نوجوان کے کندھے سے لگے اٹھے تھے۔

"آپ کے بیٹے کو ڈھائی بجے کے نزدیک برے برے خواب آتے رہے انہوں نے اٹھا دیا، پروفیسر غفور کو اور انہوں نے میری واٹ لگا دی، رات ہی تو گھر پہنچا تھا ابھی سونے لگا تھا مگر...... خیر...... آپ کیسے ہیں، آپ کو چوٹ آئی ہے سر میں؟"

"ہاں، بہت چوٹیں آئیں ہیں مجھے، مگر میں زندہ ہوں میاں۔"

"اچھی بات ہے، مجھے آپ سے ملنے کا شوق تھا بہت زیادہ، مگر پتہ نہیں تھا اس حالت میں آپ سے ملوں گا۔"

"مجھے باہر نکالو علی گوہر۔" فنکار پوری طرح بے بس تھا۔

"میں آپ کو ضرور باہر نکالوں گا سر!" وہ فنکار کو پورا سہارا دے کر تہہ خانے سے باہر نکال لایا تھا۔

"ایسا لگ رہا ہے جیسے صدیوں سے جیل میں پڑا تھا۔" انہوں نے لمبی لمبی سانسیں خارج کیں تھیں یہ کہتے ہوئے۔

"آپ خوش نصیب ہیں، ورنہ کچھ لوگ کبھی بھی رہا نہیں ہو پاتے، مجھے آپ کے سر کی پٹی کروانی ہے، خون خشک ہے مگر زخم گہرا ہے، آپ کو چکر تو نہیں آ رہے کیا؟" وہ فکرمندی سے ان کے گرد منڈلا رہا تھا۔

"مجھے بہت درد ہے علی گوہر، مجھے لے چلو ڈاکٹر کے پاس، مگر ٹھہرو، پہلے میری ھالار سے بات کروا دو، وہ فکرمند ہو گا میرے لئے۔" وہ فون ان کے پاس لایا تار کھینچ کر اور وہ نمبر ملانے لگے۔

"ہیلو...... ہاں ھالار...... میں زندہ ہوں۔"

"کیا تم نے واقعی خواب دیکھا تھا؟...... ھالار...... تم آؤ نا، ہاں میرے پاس ایک نوجوان ہے، اس نے مجھے باہر نکالا ہے، اس کا شکریہ ادا کرو۔" انہوں نے فون علی گوہر کو پکڑایا کہتے ہوئے۔

"شکریے کی کوئی بات نہیں ہے، ہاں میں خیال رکھوں گا، چکر بھی لگاتا رہوں، یہ تو بہت بڑی ڈیوٹی ہے، وعدہ نہیں کر سکتا، کیونکہ وعدہ وفا ہوتا ہی نہیں ہے، ہاں البتہ کوشش ضرور کروں گا، اللہ دے حوالے۔" اس نے فون ان کو پکڑایا الوداعی کلمات کہتے ہوئے۔

"ھالار مجھے دوسروں کے سہاروں کا محتاج مت بناؤ، خود نہیں آتے تو مت آؤ، نہیں میں تمہیں بلیک میل نہیں کر رہا، ٹھیک ہے، خوش رہو۔" انہوں نے مایوسی ریسور رکھا تھا۔

"بہلاتا ہے مجھے، الو کا پٹھا۔"

"تو پھر الو کون؟" گوہر فون اپنی جگہ پر رکھنے گیا۔

"کہہ دو الو میں ہوں، تم بھی مالی جتنے بدتمیز ہو، میں سمجھ رہا تھا کہ خاصے تمیز دار ثابت ہو گے۔"

"اس بدتمیز کے ساتھ آپ نے پٹی کرانے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے، اس لئے بنا کر رکھیے مجھ سے۔"

"مجھے تمہاری پرواہ نہیں ہے، مگر...... فی الحال میں ذرا کمزور ہوں۔"

"آپ اچھے ہیں، مانتے تو ہیں، چلیں حلیہ درست کر لیں، کپڑوں سے دھول جھڑ رہی ہے، میں آپ کے کپڑے نکال دوں، کہاں ہیں؟"

"رہنے دو میں نکالتا ہوں۔" وہ ٹانگ سہلاتے ہوئے اٹھے تھے مگر درد کی وجہ سے پھر بیٹھ گئے، اندرونی موچ گھٹنے پر بھی آئی تھی سیڑھیوں سے گرتے ہوئے بیٹھ جائیں۔

"ایسا کریں یہ شرٹ بدل لیں صرف۔" وہ ان کے لئے شرٹ اور شال لے کر باہر آیا کمرے سے، ان کو شرٹ تبدیل کرنے میں مدد کی پھر شال اوڑھا کر ان کا ہاتھ اپنے کندھے پر جمائے انہیں پورا سہارا دیتے ہوئے باہر لانے لگا۔

"تمہارے ماں باپ خوش قسمت ہوں گے بڑے۔" یہی بدتمیز انہیں اس لمحے سب سے زیادہ باتمیز اور بااخلاق لگ رہا تھا۔

"وہ اتنے خوش قسمت نہیں رہے ہیں کسی بھی معاملے میں، خصوصاً میرے معاملے میں تو بالکل نہیں ہیں، میں بہت دنوں بعد گھر آیا تھا، رات کے اندھیرے میں، مگر فجر سے پہلے پہلے مجھے وہاں سے نکلنا پڑا، ابھی میری ماں نے مجھے دیکھا تک نہیں ہے، میرا باپ بگڑا بیٹھا ہوگا، مجھے رات کے پہلے پہر سے پہلے وہاں پہنچنا چاہیے، وہ بہت جلدی سو جاتے ہیں۔" وہ بڑے افسوس کے ساتھ یہ سب کہہ رہا تھا۔

"تو تم چلے جاؤ گے۔" انہوں نے لمبی سانس بھری، اس سے زیادہ افسوس ان کے لہجے میں تھا۔

"میرا جانا لازمی ہے، آپ بائیک پر بیٹھ سکیں گے۔" وہ ان کی ٹانگ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا تھا۔

"میں بیٹھ جاؤں گا، تھوڑی تکلیف اور سہی۔" وہ اس کے سہارے بیٹھ گیا اور پیچھے بیٹھتے ہوئے اپنا ایک بازو اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

"یہ ٹھیک ہے، کیونکہ ہمیں روڈ تک جا کر پھر گاڑی کا ویٹ کرنا پڑتا۔" وہ بائیک اسٹارٹ کر رہا تھا، چند منٹ میں وہ مین روڈ پر تھے۔

"یہ بورڈ کا دفتر ہے؟" انہوں نے سر کو مفلر سے لپیٹ رکھا تھا۔

"ہاں یہ ادبی بورڈ کا دفتر ہے، آپ کا گھر یہاں سے نزدیک ہے، حیدرآباد جام شورو، یہاں سے قریبی ہسپتال جا رہے ہیں ہم، ادبی بورڈ، بہت یادیں وابستہ ہیں یہاں سے۔" دفتر اب فاصلے پر ہو رہا تھا، انہوں نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا پھر سر جھٹکتے ہوئے جیسے درد کا احساس ہوا تو سیدھے ہو کر بیٹھ گئے، سر میں کوئی گیلی گیلی شے رینگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی، ساتھ ہی ہلکے ہلکے چکر آنے لگے، انہوں نے گوہر کو مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔

"ہم بس پہنچنے ہی والے ہیں۔" گوہر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، یہ وہ بالکل نہ تھے جیسا سنا ہوا تھا پروفیسر غفور سے۔

گوہر نے ان کا ایک ہی روپ دیکھا تھا ابھی، ابھی بہت کچھ باقی تھا۔

☆☆☆

"عمارہ! وہ کمرے میں نہیں ہے، تم نے کہا تھا وہ آیا ہے۔" وہ فجر سے فارغ ہوئیں تھیں جب عمارہ نے ان کو گوہر کے آنے کا بتایا تھا وہ فوراً جاء نماز رکھتے ہوئے اس کے کمرے کی طرف آئیں۔

"وہ واقعی آیا ہے اماں!" کبھی کبھار وہ ان کو اماں کہتی تھی۔

"تو پھر وہ کمرے میں کیوں نہیں ہے۔" وہ بے یقین سی تھیں۔

"وہ باتھ روم گیا ہوگا، یا پھر...... آئیں میرے ساتھ۔" وہ کچن سے باہر آ کر اس کے کمرے کی طرف گئی ان کو لے کر، واش روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا، وہ واقعی کمرے میں نہیں تھا۔

"کیا وہ چھت پر گیا ہے؟ اتنی سردی میں، میں دیکھتی ہوں۔" وہ سیڑھیاں چڑھتی ہوئی چھت پر گئی، چھوٹی سی چھت خالی تھی۔

"وہ اوپر نہیں ہے، شاید وہ فجر پڑھنے مسجد گیا ہوگا۔"

"وہ فجر نماز پر کہاں اتنی جلدی اٹھتا ہے بھلا، کیا وہ واقعی آیا تھا، یا تم مجھے جھوٹے آسرے دے رہی ہو۔"

"اماں میرا یقین کریں، میں کیوں آپ کو جھوٹے آسرے دوں گی، وہ رات دیر سے آیا تھا، میں نے اس کا بستر بھی بچھایا، باتیں بھی ہوئیں بہت عجیب عجیب باتیں کر رہا تھا۔"

"کیسی عجیب باتیں؟" ان کے چہرے پر فکرمندی چھائی تھی۔

"پاگلوں جیسی...... جانے دیں...... میرا مطلب ہے وہ آیا ضرور تھا۔"

"وہ ٹھیک تھا نا عمارہ...... سچ سچ بتاؤ مجھے۔"

"وہ بالکل ٹھیک تھا اماں، بس چہرے پر ہلکی ہلکی خراشیں تھیں۔"

"کس چیز کی خراشیں؟ بتاؤ مجھے جلدی۔"

"کہہ رہا تھا جھاڑیوں کی وجہ سے لگی ہیں، جنگل میں۔" وہ مزید کہتے کہتے رک گئی فوراً غلطی کا احساس ہوا تھا جیسے۔

"جنگل میں تھا وہ...... کیسے...... کیوں گیا تھا، وہ اتنے دنوں سے جنگل میں تھا، اماں مجھے زیادہ نہیں پتہ وہ آئے تو آپ پوچھ لیجیے گا سب کچھ۔"

"یہ کیا جنگلات کی ذکر ہو رہا ہے صبح صبح۔" وہ تسبیح کر کے باہر آتے تھے جب آخری جملہ سنا۔

"گوہر جنگلوں میں تھا، رات آیا تھا، کہہ رہی ہے، عجیب عجیب باتیں کر رہا تھا، چہرے پر خراشیں تھیں، میرا بچہ زخمی تھا۔" وہ بتاتے ہوئے رونے والی تھیں جیسے۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں۔" انہیں ان کی باتوں کا کم ہی یقین آتا تھا۔

"خراشیں زیادہ نہیں تھیں، ہاں کہہ تو یہی رہا تھا بس۔"

"آیا کب تھا نالائق اور ہے کہاں ابھی۔" وہ اردگرد دیکھتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"آیا تھا رات دیر سے، پتہ نہیں کہاں ہے شاید باہر گیا ہے، آپ دیکھیں نا ذرا باہر جا کر۔" وہ بے چارگی سے درخواست کرنے لگیں۔

"رہنے دو، اتنی سردی میں، جا کر سڑکیں ناپوں، آنا ہوگا تو آ جائے گا۔"

"عمارہ مجھے چائے بنا دو بیٹا، آج چائے پی کر ذرا باہر جاؤں گا کام ہے۔" وہ سویٹر کے بٹن بند کرتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئے۔

"میرے بیٹے کو دیکھنے کے لئے باہر سردی ہے اور...... اپنے کام بہت عزیز ہیں۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

"چائے لاتی ہوں ابا۔" عمارہ مسکراہٹ دبا کر کچن میں آ گئی، مگر گوہر پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔

وہ چائے پیتے ہوئے مسلسل برا بھلا کہہ رہے تھے اسے، جبکہ وہ بڑی بے بسی سے گھڑی کی طرف دیکھ رہیں تھیں جس کے آگے سرکنے والا کانٹا ان کی سانسوں کی رفتار بھی بڑھا رہا تھا۔

"گوہر تم کب مجھے دکھ دینا ختم کرو گے۔" ان کی آنکھوں کی نمی تیرتی ہوئی آنکھوں سے بہہ رہی تھی۔

عمارہ کمرے کی چوکھٹ کے پاس کھڑی بڑے افسوس کے ساتھ ان کی طرف دیکھ رہی تھی، ایک ہی شخص تھا جس نے تینوں نفوس کو ایک وقت میں پریشان کر رکھا تھا، جبکہ وہ خود کون سا خوش تھا۔

☆☆☆

"تو کیا آپ اتنی جلدی میں یہ سب کر لیں گی۔" مس یاسمین پرچے کی ہنگامی تیاریوں میں مصروف تھی جب وہ اندر آئی تھی ان کے روم میں اور چند منٹ تک ان کی افراتفری دیکھتے ہوئے بالآخر پوچھ بیٹھی۔

"ہاں اب تو پرچہ لانا ہے ہر حالت میں سہ ماہی ختم ہونے والی ہے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہمارا پرچہ نہ آیا ہو تقریباً پچھلے پچاس سال سے مسلسل آرہا ہے جس کے بعد کئی پرچے آئے اور گئے بھی۔"

"آپ یہاں کب سے ہیں؟" اس کی نظر ان کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ پر تھی۔

"میں پچھلے بارہ سال سے یہاں ہوں، میرا باپ اس ادارے کا بڑا پرانا ملازم تھا، وفادار اور محنتی ملازم، ان کی حادثاتی موت کے بعد ادارے نے مجھے سیٹ آفر کی تھی، تب میں پڑھ رہی تھی اور واجبی سی تعلیم تھی، میں نے بی اے مکمل کیا اسی دوران اور اب آرام سے کام کر رہی ہوں۔" وہ کاغذ رکھ کر بڑی دلچسپی سے اسے بتا رہی تھی۔

"او اچھا...... آپ کی شادی ہو چکی ہے غالباً۔" اس نے کہتے ہوئے کاغذ اپنی طرف کھسکا لیا تھا اور ہاتھ میں پکڑا بال پین کھول لیا۔

"ہاں ماشا اللہ میرے تین بچے ہیں سب سے بڑی بیٹی نو سال کی ہے پھر دو بیٹے ہیں، میرا شوہر بہت اچھا ہے، بہت خیال رکھتا ہے میرا اور بچوں کا۔" وہ بڑے فخریہ انداز میں بتا رہی تھیں۔

"آپ کی سیلری کیا ہے؟" اس نے ایک لفظ کے نقطے ٹھیک کرتے ہوئے پوچھا۔

"بائیس ہزار کے لگ بھگ ہے۔"

"اور آپ کے شوہر کی؟ اگر برا نہ لگے تو بتا دیں۔" اب وہ دوسرا صفحہ چیک کر رہی تھی جس کی چوتھی سطر میں ایک لفظ غلط لکھا ہوا تھا اور آخری سطر میں ایک لفظ کا مفہوم واضح نہیں تھا، اس نے بریکٹ میں مفہوم ڈالا اور درست کیا۔

"وہ پچیس ہزار کما لیتا ہے، مہینے کے اپنے ماں باپ کو خرچہ بھیجتا ہے، کچھ گھر کے لئے دیتا ہے اپنا جیب خرچ چلاتا ہے، بہت بوجھ ہے بیچارے پر مشکل سے مینج کرتا ہے۔"

"آپ دونوں اکٹھے گھر کا خرچ چلاتے ہیں۔" وہ ایک کے بعد ایک صفحہ دیکھ رہی تھی۔

"ظاہر ہے، مگر عورت کی کمائی میں برکت کہاں ہوتی ہے بھلا۔"

"یہ آپ خود کہہ رہی ہیں، اپنے شوہر کے سامنے مت کہیے گا یہ سب۔" وہ مسکراتے ہوئے اسے مشورہ دینے لگی۔

"وہ خود ہی یہی کہتے ہیں۔" وہ ہنس پڑی تھی اس کی بات پر۔

"آپ کماتی ہیں، اب گھر جا کر بچوں کے لئے کھانا بنانا ہوگا یا وہ آپ کا شوہر کر لیتا ہے؟" اسے

احساس تھا کہ وہ کچھ پرسنل ہو رہی ہے مگر مس یاسمین بہت اچھے موڈ میں تھیں آج۔

"نہیں میں گھر جا کر سب کچھ بناتی ہوں، انتظار کرتے رہتے ہیں میرا لنچ تو بنا کر رکھ آتی ہوں سب کے لئے، اختر کو ہوٹلوں کا کھانا پسند نہیں ہے وہ گھر کا کھاتے ہیں وہ بھی میرے ہاتھ کا۔"

"آپ گھر جا کر کھانا بناتی ہیں، کپڑے خود دھوتی ہیں؟ صفائی بھی کر لیتی ہونگی۔"

"جی ہاں سارا کام میں خود کرتی ہوں آج کل کام کے لئے اگر ماسی رکھو تو سو نخرے اٹھانا پڑتے ہیں پیسے کا اضافی خرچ الگ ہو جاتا ہے۔"

"سب آپ کرتی ہیں، گھر بھی، کام بھی، کماتی بھی ہیں، تو کیا اب بھی اختر صاحب آپ کا خیال نہیں رکھیں گے، اب تو لازمی ہے۔" وہ پیپرز فائنل کر کے کرسی سے اٹھی، مس یاسمین کچھ حیرت اور پر سوچ انداز میں اس کی بات پر اسے دیکھتی رہیں۔

"مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ گھر جا کر اس بات پر سوچیں یا اپنا دل جلائیں، آپ خوش ہیں، خوش رہیں، مگر اپنی اور دوسروں کی قدر کرتی رہیے گا، معافی چاہتی ہوں، مجھے یہ سب نہیں کہنا چاہیے تھا اگر آپ کو برا لگا تو۔"

"نہیں مجھے برا نہیں لگا، تم نے یہ کاغذوں کا کیا کیا؟"

"کچھ تبدیلیاں کی ہیں چیک کر لیں، میں چلتی ہوں اب۔"

"ٹھہرو میں بھی چلتی ہوں، ساتھ چلتے ہیں۔" انہوں نے بغیر کاغذ چیک کیے، دراز میں ڈالے اور بیگ لے کر کھڑی ہو گئیں۔

"آپ نے پیپرز چیک نہیں کیے؟" وہ ان کے ساتھ ساتھ باہر آئی۔

"تم نے بہتر کر لئے ہونگے، چیک کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔"

"شکریہ، ایک اور بات پوچھوں اگر برا نہ لگے تو؟"

"پوچھ لو، اب کیا رہ جاتا ہے۔"

"آپ کو پروف کی شکایات نہیں آتیں کبھی۔"

"ہاں کافی دفعہ کیونکہ کمپوزر بڑا غائب دماغ ہے۔"

"میں پروف کی بات کر رہی ہوں۔"

"یعنی تم میری غلطی جتا رہی ہو۔"

"نہیں صرف احساس دلا رہی ہوں۔"

"ایک ہی بات ہے، ہاں ایسا ہوتا ہے میرے ساتھ، کیونکہ مجھے گھر کی زیادہ فکر ہوتی ہے، بچوں کی، ذہن وہاں لگا رہتا ہے اور پھر آخری دنوں میں کام کا پریشر بڑھ جاتا ہے۔"

"پریشر اس لئے بڑھتا ہے کہ آپ سارا کام آخری دنوں کے لئے چھوڑتی ہیں کام وقت کے حساب سے بانٹ لیں، اب کی بار ایسا کیجئے گا تو آخری دنوں سے پہلے آپ کام مکمل کر چکی ہونگی، یہ پرچہ بھی سہ ماہی ہے تو کچھ ریلیف ہے۔"

"شاید تم ٹھیک کہتی ہو، مگر چلو دیکھیں گے، ویسے جب تم نے کہا اک بات اور پوچھوں تو میں ڈر گئی تھی۔"

"آپ نے سمجھا میں آپ کے اور آپ کے شوہر کے ریلشن کے بارے میں سوال کروں گی؟"
"نہیں، میں نے یہ تو سوچا نہیں کہ تم ایسا بھی کر سکتی ہو۔" انہوں نے مسکراہٹ دبا رکھی تھی۔
"تو آپ نے کیا سوچا تھا۔" وہ سنجیدہ تھی۔
"تم کہو گی کہ آپ کا کہیں شادی سے پہلے کوئی چکر تو نہیں چل رہا تھا۔" انہوں نے آنکھ دبا کر کہا اور مسکرائیں۔
"ہاہاہا...... اچھا تو کیا یہ تھا۔" وہ دونوں گیٹ سے باہر مین روڈ تک آ گئیں تھیں۔
"ایسا نہیں تھا، افسوس کہ میں بڑی بھولی بھالی اور شریف سی لڑکی تھی۔" وہ مصنوعی افسوس کے ساتھ کہنے لگیں۔
"آپ اچھی ہیں، ویسے آفس والے بہت برے ہیں۔" اس نے سامنے دیکھتے ہوئے فوراً کہا تھا۔
"اب کیا کر دیا بیچارے آفس والوں نے یار۔"
"آپ کو نہیں لگتا کہ انہیں کنوینس دینی چاہیے ملازموں کو۔"
"یہ تو مجھے بھی لگتا ہے، مگر کیا کر سکتے ہیں۔" سامنے اک ٹیکسی رکی تھی ان کے اشارے پر۔
"آج پھر بس نہیں آئی۔" انہیں افسوس تھا۔
"آپ بارہ سالوں سے یہ مشقت بھرا سفر کرتی آئی ہیں۔"
"میں بارہ دنوں میں بیزار آ گئی ہوں اس سفر سے، مگر کیا کہتے ہیں کہ مجبوری بھی کسی بلا کا نام ہے۔"
"میں نے تو اس کا نام شکریہ ہی سنا تھا۔" وہ پھر ہنسی تھیں۔
"میں اسے بلا کے نام سے جانتی ہوں۔" وہ مسکراتی آگے آئی۔
"بیٹھو امرت۔" اسے دروازے کے پاس کھڑا دیکھ کر وہ بولیں، جبکہ کچھ غور سے دھواں اڑاتی بائیک کی طرف دیکھ رہی تھی۔
"ہاں بیٹھتی ہوں۔" بائیک کافی آگے جا چکی تھی۔
"کوئی جاننے والا تھا؟"
"آں...... میری کزن کا کزن، آئی مین اس کا منگیتر، مگر اس کے پیچھے کون تھا؟" گاڑی اسٹارٹ ہو گئی تھی ڈرائیور اب ان سے ایڈریس پوچھ رہا تھا۔
"میں نے نہیں دیکھا، ہاں بھئی مجھے لطیف آباد اور میڈم کو قاسم آباد چھوڑنا ہو گا۔" وہ اب دوسری طرف متوجہ تھیں۔
مگر امرت کے ذہن میں کچھ چل رہا تھا، وہ اس جلدی میں پاس سے گزرتے ہوئے چہرے کو ذہن کی اسکرین پر لانے کی کوشش کر رہی تھی، مگر بہت دیر کوشش کے بعد بھی پہچان دھندلی تھی۔

☆☆☆

"کیا اب مجھے اب گھر چلے جانا چاہیے، آپ کو نہیں لگتا۔" وہ جب پیٹ بھر کر کھانا کھا چکے تو اس نے اٹھنے کا سوچا۔
"تم چلے جاؤ گے علی گوہر، میں تو اکیلا رہ جاؤں گا۔" ان کے حلق سے آخری نوالہ اتر نہیں رہا تھا یہ سن کر کہ وہ واپس جائے گا انہوں نے سوچا تھا وہ اسے آج رات روکنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

"مجھے جانا چاہیے، میری ماں میرا انتظار کر رہی ہو گی، آپ نے کھانا کھا لیا مگر میری ماں نے نہیں کھایا ہو گا، میرا باپ مجھے پیٹنے کے لئے بے تاب ہو گا کئی دنوں سے انہوں نے اپنا غصہ مجھ پر نہیں نکالا، مجھے جانا چاہیے اب، مغرب ہو گئی ہے، آج اگر میں گھر نہ گیا تو میری ماں سے رات گزارنا مشکل ہو جائے گی۔"
"کیا میرا سالار بھی یہ سوچتا ہو گا میرے لئے، پتہ نہیں، وہ کہاں ہو گا اس وقت اپنے روم میں یا پھر دوستوں کے ساتھ، یا کتابیں لے کر بیٹھا ہو گا۔"
"آپ اس سے بات کر لیں، میں چلتا ہوں۔"
"سنو گوہر! پروفیسر نے کہا تھا کہ میرا دل کرتا ہے تمہیں باندھ لوں، کہیں جانے نہ دوں۔"
"مجھے باندھنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔" وہ ان کی بات پر مسکرا دیا۔
"مجھے اندازہ ہے مگر مشکل کو آسان اور ناممکن کو ممکن کرنے کی دھن مجھ پر بھی سوار ہے، اگر وقت اچھا ہوتا اور گھر جانا ضروری نہ ہوتا تو میں تمہیں رسیوں سے باندھ دیتا۔"
"اور میں رسیاں تڑوا کر بھاگ جاتا، کسی کو باندھنا ہو تو دل سے باندھیں، رسیاں ٹوٹنے کے بعد بے کار ہو جاتی ہیں جبکہ دل ٹوٹنے کے بعد اور بھی کارآمد ہو جاتا ہے۔"
"کیا تمہارا بھی دل ٹوٹا ہے علی گوہر؟" وہ بڑے دوستانہ انداز میں پوچھنے لگے۔
"دل ابھی جڑا ہی نہیں، ٹوٹنے کا مرحلہ آگے کا ہے۔"
"دل جوڑنا چاہتے ہو؟" لہجہ وہی تھا۔
"دل جوڑنے سے ڈرتا ہوں بلکہ کہیے پناہ مانگتا ہوں۔"
"پھر بے چین کیوں ہو علی گوہر؟" وہ فنکار تھے چہرہ شناسی کا فن بھی آتا تھا۔
"نہیں معلوم۔" اس نے ایک سرد آہ بھری تھی۔
"غربت سے بے زار ہو؟"
"نہیں، غربت میں خوش ہوں۔"
"پھر کیا چاہتے ہو؟"
"یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا۔"
"نوکری کیوں نہیں ڈھونڈتے، نوکری کرو شادی کرو، خوش رہو۔"
"اچھا، نوکری اور شادی سے بندہ خوش رہتا ہے کیا؟"
"کم از کم ایک نارمل زندگی تو جی ہی سکتا ہے، تمہاری طرح لور لور پھرنے سے بہتر ہے بندہ ٹھکانے لگ جائے ایک جگہ۔"
"آپ نے بڑی اچھی زندگی گزاری ہے لگتا ہے۔"
"پتہ نہیں، مگر علی گوہر میری بے چینیوں نے مجھے ڈھنگ سے جینے ہی نہیں دیا ہے، میں نہیں چاہتا کہ تم ایسے رہو۔"
"میرے لئے اچھا سوچنے کا شکریہ، مگر فی الحال آپ اپنے زخم کا خیال رکھیں، اب اگر اس تہہ خانے میں جانا ہو تو دن میں جایئے گا کیونکہ وہاں کافی پرانے رسالے کتابیں پڑی ہیں، ہو سکتا ہے وہاں کسی کی

ڈائری بھی ہو کسی کی کہانی پڑھ کر آپ کا دل بہل جائے، مگر فی الحال مت جائیے گا وہاں، کیونکہ فی الحال آپ وہاں سے ڈرے ہوئے ہیں۔

"تم نے جو وعدے کیے تھے علی گوہر مجھ سے دو گھنٹے پہلے......"

"یہی کہ آپ کو پورا حیدر آباد گھماؤں گا، تو ضرور اور کیا کہ بجلی کے تار نئے لگاؤں گا ٹوٹے ہوئے بٹن تبدیل کروں گا، آپ کے صحن کی جھاڑیاں کٹواؤں گا، پھولوں کے لئے نئے گملے لاؤں گا اور گھر میں اضافی روشنیاں لگائیں گے، کمرے کی دیوار کی مرمت باقی ہے اور بیٹھ کر آپ سے آپ کی کہانی سنوں گا، مجھے اچھی طرح سب یاد ہے بلکہ یاد رہے گا جب تک میں یہ سارے کام نہیں مکمل کرتا۔"

"سوچ لو بہت وقت چاہیے ہو گا ان سب کے لئے، کیا نکال سکو گے؟"

"نکال لوں گا پروفیسر صاحب! مگر کب، یہ نہیں بتا سکتا۔"

"جلدی آسکتے ہو میرے پاس، اسی شہر میں تو رہتے ہو علی گوہر۔"

"اگر مستقل یہیں رہا تو آجاؤں گا۔"

"اگر یہاں نہ رہے تو کہاں رہو گے؟"

"خود نہیں جانتا، مگر ایک جگہ جانا ہے۔"

"میں تمہارا انتظار کروں گا علی گوہر۔"

"انتظار مت کریئے گا، بہت لوگ انتظار کرتے ہیں میرا، مگر میں آؤں گا ضرور، اپنا خیال رکھیئے گا بہت۔"

"اگر تم برا نہ مانو تو ذرا یہاں آؤ؟" وہ کچھ قریب آکر بیٹھ گیا، انہوں نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

"اللہ تمہارے بخت بلند کرے علی گوہر!" انہوں نے بچوں کی طرح سے اسے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"آپ مجھے باندھ رہے ہیں۔" وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔

"نہیں دیکھو میرے پاس کوئی رسی نہیں ہے۔"

"آپ مجھے دل سے باندھ رہے ہیں، دل کے ہاتھوں باندھ رہے ہیں۔"

"یہ نسخہ تم ہی نے دیا ہے مجھے۔" وہ اس کی بات پر مسکرائے تھے۔

"بہت جلد پریکٹیکل کر دیتے ہیں آپ، زیادہ تجربے کمانے کا ریکارڈ ہو گا آپ کا۔"

"بہت زیادہ، کبھی آنا فرصت میں تو کھاتا کھولیں گے۔"

"ایک دعا کرو گے میرے لئے۔" عجیب التجائیہ انداز تھا۔

"بولیں ضرور کروں گا۔"

"دعا کرو جلدی مر جاؤں، آٹھ ماہ بیچ میں سے غائب ہو جائیں دس دن کے اندر بات تمام ہو جائے، اگلی بار تم مجھے کندھا دینے آؤ، سوچ لو پھر بہت غیر ضروری کاموں سے بچ جاؤ گے۔" کہہ کر وہ یاسیت سے مسکرائے۔

"بہت جلدی ہے جانے کی آپ کو، ایک بات بتاؤں موت کو پکارا نہیں جاتا یہ اپنی مرضی کی مالک ہے، ہماری ایک نہیں سنتی، تب نہیں آتی جب بلایا جائے بلکہ خفا ہو جاتی ہے، تب آجاتی ہے جب پناہ مانگی

جائے اپنی کرنی کر جاتی ہے، مگر اس کے ساتھ کھینچا تانی مت کرو تو یہ بھی آپ کے ساتھ کھینچا تانی نہیں کرے گی، نرمی کے ساتھ پیش آئے گی، مگر یہ کسی کی دوست بننا پسند نہیں کرتی اسے یاد کرتے وقت اسے پچکارا نہ کریں، بے وقوف نہیں ہے یہ۔"

"تم اسے جانتے ہو علی گوہر؟"

"میں اسے جاننا نہیں چاہتا، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے مگر یہ بکھری پڑی ہے زندگی کے ساتھ، چلیں چھوڑیں۔"

"تم کسی راز کو جاننے کے پیچھے پڑے تھے؟" انہیں اچانک یاد آیا۔

"روک لینے کا اک اور بہانہ۔" وہ دل کھول کر ہنسا۔

"میں بس پوچھ رہا تھا۔" وہ ناراض سے انداز میں اسے دیکھنے لگے۔

"کیا آپ یقین کر لیں گے، کہ ایک عمر رسیدہ خاتون ہے، ایک سو بیس سال کے لگ بھگ، وہ جی رہی ہیں، ان کے اندر نئی زندگی پیدا ہو رہی ہے، وہ دوبارہ سے جوان ہو رہی ہے، بال کالے ہو رہے ہیں، دانت نئے آرہے ہیں، آنکھوں کی روشنی تیز ہو رہی ہے، جسم کی چستی بڑھ رہی ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے نارمل سے انداز میں بتانے لگا۔

"تو کیا وہ جینا چاہتی ہیں۔" وہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

"ان کو زندگی مل رہی ہے تو وہ مزے اٹھا رہی ہیں، میں نے انہیں موت کی دعا کرتے نہیں سنا، حالانکہ وہ پچھلے برس کومے میں رہی ہیں، انہوں نے بہت برس ضعیفی اور کمزوری بیماری کے عالم میں گزارے ہیں، مگر پھر بھی، انہوں نے موت کو نہیں پکارا بے زار آکر۔"

"وہ جینا چاہتی ہیں علی گوہر، حیرت ہے اتنا جی لینے کے بعد بھی۔"

"وہ آپ کی طرح نہیں ہیں، آپ کی عمر کیا ہے؟"

"پینسٹھ سال، مگر مجھے بیماریوں نے کھوکھلا کر دیا ہے گوہر۔"

"اتنی زیادہ عمر نہیں ہے یہ، اسی کے بعد انسان کو بے زار ہونا چاہیے، خیر...... میں یہ کہوں گا جتنا جئیں ہنس کر خوش ہو کر، زندگی سے پناہ کسی نے نہیں مانگی، تھوڑا وقت بچی اگر مصروف رہیں گے تو وقت گزر جائے گا، وقت اتنا بھی برا نہیں ہوتا، اسے اچھا اور برا ہم بناتے ہیں اپنے لئے۔"

"ٹھیک کہتے ہو علی گوہر۔"

"اپنے اندر ہمت جمع کریں، آپ کو اپنے لئے آٹھ ماہ دس دن بھی کام کرنا ہے، کھانا کھانا ہے، سونا ہے، جاگنا ہے، اپنا خیال رکھنا ہے، گزر جائیں گے آٹھ ماہ پھر حالار آجائے گا آپ کے پاس، مجھے پروفیسر غفور نے آپ کی بہادری دلیری اور مضبوطی کے بڑے بڑے قصے سنائے ہیں۔"

"پھر تو تم مجھ سے مل کر مایوس ہوئے ہو گے بری طرح۔"

"نہیں، میں مایوس نہیں ہوا مجھے بس افسوس ہے، پر میں مایوس نہیں پر امید ہوں، میں ایک مرتی ہوئی عورت کو چلتا پھرتا دیکھ کر آیا ہوں، کیا اب بھی امید میرے اندر نہیں جاگے گی۔"

"وہ عورت اکیلی ہے علی گوہر؟"

"اس کے ساتھ عائشہ، کلثوم، جویریہ، زینب اور مریم ہیں۔"

''اتنی ساری لڑکیاں اس کے پاس ہیں، تو وہ کیوں نہ جیئے گی، وہ بولے یہ سب نام زینب کے ہیں جو خود کو مریم کہلواتی ہے۔'' وہ ناسمجھی سے اسے دیکھنے لگے۔

''ہمیں اس کا اصل نام نہیں پتہ، وہ کرسچن ہے، کبیر بھائی نے اس سے ملوایا مجھے، کبیر بھائی خود تو غائب ہو گئے۔''

''وہ غائب ہوتے ہیں؟''

''نہیں میرا مطلب ہے کہ وہ کہیں چلے گئے ہیں ہمارے رابطے میں نہیں ہیں، انہیں حسرتوں کی مار پڑی ہوئی ہے، میری طرح لور لور پھرتے ہیں، اب کہ لوٹیں تو ان کی امانتیں لوٹاؤں گا، حسرتوں کی مار، اس کی آنکھوں میں روشنی ہے؟ رنگ سانولا ہے، قد پورا ہے، وہ سر پر رومال باندھتا ہے، ہاں رومال باندھتا ہے یا پھر امامہ، ان کو آپ جانتے ہیں؟'' وہ خود حیران تھا۔

''وہ مجھے ٹرین میں ملا تھا، حسرتوں کی بات ہی کرتا تھا، وہ چلتے وقت چلتی ہوئی ٹرین سے اترا تھا، پھر غائب بھی ہو گیا۔''

''شیور، آپ کی آنکھوں نے دھوکا کھایا ہوگا وہ غائب کیسے ہو سکتا ہے؟''

''وہ غائب ہی ہوا تھا علی گوہر، پتہ نہیں، مگر وہ وہی ہے جو تم بتا رہے ہو، وہ مجھ سے زیادہ عجیب ہے گوہر۔''

''وہ آپ سے زیادہ عجیب ہے، پتہ نہیں، پھر وہ وہاں ضرور جائے گا خیر خبر لینے۔''

''کہاں جائے گا؟''

''وہاں، اپنی دادی کے پاس جو زندہ ہیں۔''

''وہ تمہیں ملے تو مجھے بتانا، اس نے مجھے کہا تھا کہ میں آٹھ ماہ جیوں گا اور دس دن، وہ صوفی ہے گوہر، وہ درویش ہے، اسے حسرتوں کی مار نہیں ہو گی یہ ڈھکوسلہ ہے گوہر، وہ کچھ اور ہے وہ جو نظر آتا ہے وہ نہیں ہے، میری نظر نے کچھ اور دیکھا ہے۔''

''آپ شاید ٹھیک کہتے ہیں، عشاء کا وقت ہو رہا ہے، آج میں عشاء مسجد میں پڑھنا چاہتا ہوں، آپ کو اپنا خیال رکھنا ہو گا، ہو سکتا ہے میں جلدی نہ آسکوں۔''

''اس میرے پاس بھیجو گے نا؟ گوہر بولو۔'' وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اصرار کر رہے تھے۔

''کہہ دوں گا، اللہ حافظ۔'' وہ کھلے دروازے سے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر جا رہا تھا سے بہت جلدی تھی، وہ اسے جاتا ہوا دیکھتے رہے تھے۔

☆☆☆

''رات ہو گئی، وہ نہیں آیا، اس کے نمبر پر پھر فون کرو عمارہ۔''

''اماں اسے آنا ہو گا تو آجائے گا، آپ کھانا کھالیں صبح سے کچھ نہیں کھایا۔''

''وہ آجائے تو پھر کھاؤں گی۔'' وہ مسلسل تسبیح پڑھ رہی تھیں۔

''مرضی ہے آپ کی۔'' وہ لحاف چھوڑ کر کمرے سے باہر جانے لگی۔

''میں ماں ہوں بیٹا، کیا کروں مجبور ہوں، میرا دل نہیں مانتا۔''

''آپ ماں ہیں، میں مانتی ہوں، سب مائیں ایسی نہیں ہوتیں۔'' یہ اس نے آہستگی سے کہا تھا اور

باہر چلی آئی۔

''آپ آج مسجد نہیں گئے؟'' وہ برآمدے میں عشاء پڑھ کر فارغ ہوئے تھے۔

''آج بہت سردی لگ رہی تھی بیٹا، کھانا کھایا تمہاری ماں نے؟''

''وہ آسانی سے کھاتی ہیں کیا؟ کہتی ہیں وہ آئے گا تو کھالوں گی۔''

''تو پھر ٹھیک ہے، ہم بھی تب ہی کھائیں گے۔'' وہ جائے نماز لے کر کے اٹھے۔

''آپ بھی؟ بچوں کی طرح وہ ضد کرتی ہیں مگر آپ تو......''

''میں بھی بوڑھا ہو گیا ہوں کبھی کبھار بچہ بن جانے کو جی کرتا ہے، ہو سکتا ہے وہ آجائے ماں جو کہتی ہے اس کی، چلو اندر چلتے ہیں۔'' وہ اسے لے کر کمرے میں آئے۔

(کتنا خوش نصیب ہے وہ جسے ایسے ماں باپ ملے ہیں) وہ ان دونوں کے ساتھ بیٹھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

''ہم تم سے کم پیار تو نہیں کرتے بیٹا، تم اس گدھے سے زیادہ ہمیں عزیز ہو، تمہاری فکر نہیں ہے کیونکہ تم عقلمند ہو تم میں صبر ہے۔'' ایک نظر اسے دوبارہ دیکھ کر بولے۔

''وہ بے عقل ہے، آوارہ پھرتا رہتا ہے، اس کی فکر ہوتی ہے۔'' وہ جیسے اس کی سوچ پڑھ گئے تھے، اسے ساتھ لگا لیا۔

''مجھے آپ دونوں سے کوئی شکایت نہیں ہے ابا، میرے سب کچھ آپ سب ہی ہیں۔''

''بیٹا ایک بات کہوں، اپنی ماں سے بات کر لیا کرو، وہ بھی ماں ہے فون کرتی ہے تمہارے لئے، بات کرنا چاہتی ہے۔''

''وہ ماں ہے؟ بات کرنا چاہتی ہے، میرا دل نہیں کرتا ابا۔'' وہ ان سے الگ ہو کر بیٹھ گئی۔

''اس بیچاری نے اپنا گھر بسا لیا، یہ اس کا حق تھا، دیکھو اگر وہ تمہیں وہاں لے جاتی اور تم وہاں خوش نہ رہتیں تو بھی تمہیں ملال ہوتا، ہم نے پوری کوشش کی تمہیں گوہر سے زیادہ پیار دیں، تم مجھے بہت عزیز ہو، شاید سگی بیٹی ہوتی تو وہ بھی اتنی پیاری نہ ہوتی، اللہ نے دیکھو بیٹی نہیں دی، تمہیں دے دیا مجھے، میں خوش ہوں۔''

''میں بھی بہت خوش ہوں ابا، مت کہا کریں کہ میری کوئی اور ماں ہے، یا میرا باپ مر چکا ہے، میرے باپ آپ ہیں، میری ماں یہ ہیں، مجھے مت کہا کریں کہ میں کسی اور کو ماں سمجھوں یا بات کروں تکلیف ہوتی ہے ابا۔'' اس نے ان کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔

''میری پاگل بیٹی، تم تو میری پری ہو، میری جان ہو۔''

''میں آپ کی پری ہوں، آپ کی جان ہوں۔'' وہ ان کی بات پر مسکرائی تھی۔

''تب ہی میری کوئی بات نہیں مانتے آپ، کہہ رہی ہوں کھانا کھالیں دیر ہو گئی ہے، آپ کو جلدی بھوک لگتی ہے، مگر مانتے ہی نہیں، اماں تو اماں، آپ بھی کم نہیں ہیں۔''

''اچھا کھا لیتے ہیں، چلو لاؤ کھانا بس۔'' وہ اٹھی ہی تھی کہ دروازہ بجا تھا۔

''دیکھو میرا گوہر ہو گا۔'' وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' وہ کہتے ہوئے اٹھے تھے جب اس نے روک لیا۔

"میں دیکھ لیتی ہوں ابا، کوئی اور ہوگا تو آپ کو بتاؤں گی۔" دروازے کے اس پار وہی تھا، وہ جگہ دے کر آگے سے ہٹ گئی۔

"السلام علیکم! کیسی ہو؟"

"وعلیکم السلام ٹھیک ہوں، اندر آجاؤ۔" اس کا لہجہ کچھ ناراض ناراض سا تھا۔

"میرا گوہر میرا بچہ۔" وہ اٹھ کر اس سے لپٹ گئیں، اس نے جھک کر ان کے پاؤں چھوئے پیار لیا پھر ابا کی طرف بڑھا ان سے ملا۔

"گوہر تو کہاں چلا گیا تھا میری جان، پتہ ہے ماں کتنا انتظار کرتی رہتی ہے تمہارا۔" وہ اسے ساتھ لگا کر بیٹھ گئیں۔

"اماں! میں کہاں جاؤں گا، لوٹ کر یہیں تو آنا ہے مجھے، مجھے پتہ تھا آپ میرا انتظار کر رہی ہونگی۔"

"ابا! آپ ناراض ہیں کیا؟"

"تمہارا تو روز یہی حال ہے گوہر، میں تو ناراض ہو ہو کر تھک جاؤں مگر تم اپنی عادت سے نہیں جھکتے، میں کیا کروں۔" وہ بے بسی سے مسکرائے تھے۔

"ابا! مجھے معاف کردیا کریں۔" وہ پھر سے ان کے پاؤں چھونے لگا۔

"یہی کرتا ہوا آرہا ہوں مگر تم اب سدھر جاؤ یار۔" وہ اسے اٹھا کر چہرے پر ہاتھ پھیرنے لگے سمجھاتے ہوئے۔

"اب سدھر جاؤں گا۔" وہ ہنسنے لگا۔

"تم وہاں کیوں کھڑی ہو؟" عمارہ دروازہ کے بیچ کھڑی تھی۔

"کھانا لاؤں اب ابا؟" وہ اس کی بجائے ان سے مخاطب ہوئی۔

"ہاں بیٹا لاؤ اب کھانا بہت بھوک برداشت کی ہے اتنی دیر سے اب مزید نہیں ہوگی۔"

"ابھی لاتی ہوں۔" وہ کچن کی طرف چلی گئی۔

"مجھے پتا تھا آپ سب میرا انتظار کر رہے تھے نا، مگر اسے کیا ہوا ہے منہ کیوں سجا رکھا ہے۔"

"اسے بھی کئی دکھ ہیں بیٹا، کئی سوچیں ہیں۔" وہ افسوس سے کہتے اٹھے۔

"میں ذرا ہاتھ دھولوں۔" وہ کھانا لے کر اندر آئی، دسترخوان لگایا اور ابا کو آواز دی، مگر خود اٹھ گئی۔

"عمارہ کھانا کھاؤ بیٹا۔"

"ابا میں کھا چکی ہوں۔"

"باپ سے جھوٹ نہیں بولتے، آجاؤ شاباش کھالو۔" ان کے کہنے پر وہ آتو گئی مگر دانستہ گوہر کی طرف دیکھنے سے کترا رہی تھی، اسے اس کا رویہ پہلی بار عجیب سا لگا۔

☆☆☆

"کتنے دکھ کی بات ہے کہ لوگ مرتے ہیں اور ان پر رونے والے ہزاروں ہوتے ہیں ان پر رونے والا صرف میں ہوں۔" انہوں نے اپنی گیلی آنکھوں سے گرتے آنسو صاف کیے تھے۔

"یقین نہیں آرہا یہ سب آپ کہہ رہے ہیں، میں نے سمجھا تھا آپ نہیں روئیں گے۔"

"تم کیوں سمجھتی ہو کہ میں نہیں روؤں گا، تمہیں پتہ ہے میں اپنی بیوی کی موت پہ بھی بہت رویا تھا حالانکہ وہ مجھ سے نفرت کرتی تھی، وہ مجھ سے جان چھڑانا چاہتی تھی، دعائیں مانگتی تھی میرے مرنے کی۔"

"وہ آپ سے نفرت کیوں کرتی تھیں؟"

"میں غیر فطری تھا، میں اور لوگوں کی طرح نہیں تھا، میں نے اس کا خیال نہیں رکھا تھا، کلثوم وہ بہت بے زار تھی مجھ سے، تمہیں پتہ ہے اس کا نام بھی کلثوم تھا۔" وہ اس کا ذکر کرتے ہوئے نرم تھے، لہجہ بھیگا ہوا تھا۔

"میرا نام کلثوم نہیں ہے۔"

"پھر تمہارا نام کیا ہے؟"

"میں بھول چکی ہوں کہ میرا اصلی نام کیا ہے۔"

"تمہاری ذات پر جھوٹ نہیں سجتا، مگر میں مان لیتا ہوں کہ تم اپنا اصل نام بھول چکی ہو، اس سے یہ مراد ہے کہ تم اپنا اصل بھول چکی ہو، ہم سب اپنا اصل بھول چکے ہیں، وہ وعدہ جو اللہ نے ہم سے لیتا ہے، وہ وعدہ کیا ہے؟ جب اللہ نے بتایا کہ میں تمہارا رب ہوں، بندے نے اقرار کیا، اللہ نے وعدہ لیا کہ گواہ رہنا، میں تمہارا رب ہوں۔" کبیر احمد اٹھ کھڑا ہوا مٹی کے ڈھیر سے اور کپڑے جھاڑے، دور سے ہاتھ اٹھا کر قبر کی طرف رخ کر کے فاتحہ پڑھی، با آواز بلند کلمہ طیب پڑھا اور کلثوم کو ساتھ آنے کا اشارہ کر کے آگے بڑھا، اس کے بعد ایک مرتبہ بھی کبیر احمد نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا پیچھے جبکہ کلثوم بار بار مڑ کر دیکھتی رہی تھی، اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے پیچھے سے کوئی اسے دیکھ رہا تھا، اس ویرانے میں ایک ہی قبر تھی اس عمر رسیدہ خاتون کی وہ عمر رسیدہ خاتون جو چند دن پہلے چاک و چوبند تھی اور اپنے کام سرانجام دے رہیں تھیں، ان کی اچانک موت کلثوم کے لئے صدمہ نہیں تھی مگر حیرت کا باعث ضرور تھی اسے پتہ تھا انہوں نے مرنا ہے مگر وہ سمجھ رہی تھی کہ یہ کچھ مہینے یا ایک سال تک جی پائیں گی، حیرت کو ابھی امپر وہ ہونا باقی ہے، مگر تب ہی ایک روز شام کے وقت وہ تھک کر لیٹیں نہا کر وضو کر کے، حیرت کے انہوں نے اپنے لئے سفید جوڑا نکالا تھا، ایک چادر بھی تھی انہوں نے بتایا تھا کہ یہ بڑی سی چادر حج پر اوڑھا ہوا احرام ہے، اسے مسلمان اپنے کفن کے لئے رکھتے ہیں، وہ جب مر جائیں تو کفن یہی دیا جائے، وہ خاموشی سے سب سنتی رہی تھی، پھر وہ لیٹیں اور کلمہ پڑھا، بہت دیر تک بہت دیر تک کلمہ طیبہ کی آواز آتی رہی پھر آواز بند ہوئی۔

اس نے چادر اتاری تو وہ مردہ حالت میں تھیں، نبض چلنا بند تھی سانس رکی ہوئی تھی، جسم ٹھنڈا تھا، اسے پہلی بار زندگی میں خوف آیا اور رونا آیا، وہ کوٹھڑی سے باہر نکل کر ہچکیوں کے درمیان رو رہی تھی، وہ اکیلی تھی، وہ کیسے آگے کا انتظام کرتی، اسے غسل دینا نہیں آتا تھا، نہ کچھ پڑھنا، وہ غیر مسلمہ تھی، وہ زار و زار روتی رہی تقریباً رات ہو گئی تھی اور خوف اس کے درمیان پہرے بٹھا رہا تھا، اتنے دن بھی وہ اسی بیابان میں رہتی ہوئی آرہی تھی مگر رونا کبھی نہیں آیا تھا، خوف کبھی محسوس نہیں ہوا تھا۔

کیونکہ اس کے ساتھ ایک سانس لیتا ہوا وجود تھا، جو پہلے پہل ہلتا تھا حرکت کرتا تھا، پھر وہ اٹھنے لگا، اٹھ کر چل پھرنے لگا، بات کرنے لگا، اسے ڈھارس ہوئی تھی، اسے تسلی تھی، گوہر بھی کچھ دنوں میں چکر لگا ہی لے گا، ہو سکتا ہے جب تک کبیر بھائی بھی آجائیں، اسے امید تھی، مگر اس رات وہ اکیلی تھی، رات دیر

تک وہ رتی رہی جانے کیسے بیٹھے بیٹھے اس کی آنکھ لگ گئی تھی، وہ عجیب وغریب خواب دیکھتی رہی کہ وہ کسی سرنگ میں ہے، جہاں سے وہ نکلنا چاہ رہی ہے، بھاگنے کی کوشش میں اسے چوٹیں لگ رہی تھیں سر میں ایک چوٹ لگی جہاں اسے ہمیشہ سے درد ہوتا تھا، اسی جگہ چوٹ لگی تھی، پھر وہ سر کو سہلاتی ہے، اٹھتی ہے۔

اسی سرنگ میں اسے اپنی دوست نظر آتی ہے جس نے اسے وہ راز سونپا تھا جس کو تکیے کے نیچے رکھ کر وہ سوتی تھی اور اس کا درد ہوا ہو جاتا تھا کچھ دیر کے لئے، مگر پھر وہی درد اٹھتا تھا، اس نے دیکھا سرنگ سے باہر روشنی کا گولہ جگمگاتا تھا مگر وہ سرنگ میں بری طرح سے پھنس چکی تھی، وہ اسی سرنگ میں کبھی آگے دیکھتی ہے دور کبھی پیچھے دیکھتی ہے، اسے صرف یہاں سے باہر نکلنے کی جستجو ہے جس میں اسے کچھ آگا پیچھا نظر نہیں آرہا۔

اس کی آنکھ کھلی تو پسینے میں بھیگی ہوئی تھی، لکڑی کا دروازہ زور زور سے بج رہا تھا، اس نے ایک نظر کوٹھڑی پر ڈالی اور دوسری باہر، پھر اٹھ کر باہر کی طرف لپکی تو کبیر بھائی کو سامنے پایا، ان کو دیکھ کر اسے مزید رونا آرہا تھا۔

''آپ کہاں تھے؟ اتنے دن تک کوئی خبر نہیں لی ہماری۔'' وہی شکوہ جو لبوں پر آنے کے لئے بے تاب تھا۔

''تمہاری شکایت جائز ہے، مگر یہ بتاؤ کہ ان کا غسل ہوا؟''

''آپ کو پتہ ہے ان کی موت کا؟'' وہ بری طرح چونکی تھی۔

''اللہ، رحم کرے ان کی روح پر، مجھے امید ہے وہ بخشی جائیں گی۔'' وہ کہتے ہوئے آگے بڑھے تھے۔

اندر آکر چادر ہٹائی، ان کی پیشانی کو بوسہ دیا، بند آنکھوں پر ہاتھ رکھا، آنکھیں بند ہوئیں، پھر اس کی طرف متوجہ ہوا، جیب سے ایک کاغذ نکالا اس کی طرف بڑھایا۔

''اس پر غسل کا طریقہ لکھا ہے دیکھ لو، پانی میں لا دیتا ہوں۔'' ان کا لہجہ خشک سا تھا، اس نے کانپتے ہاتھوں سے کاغذ لیا تھا اور لکھی عبارت پڑھنے لگی، وہ پانی لے کر اندر آئے۔

''تم ان کو غسل دے کر کفن پہناؤ، جب تک میں باہر تلاوت کرتا ہوں۔''

''میں غیر مسلم ہوں، یہ آیات، یہ ساری چیزیں۔''

''تم انہیں پڑھ لوگی پڑھ لو کوئی حرج نہیں ایک غیر مسلمہ کے منہ سے نکلتے ہوئے بھی یہ باا ثر ہونگی میں سمجھتا ہوں اثر کسی کے منہ میں نہیں ہوتا، بلکہ ان آیات میں ہوتا ہے، میں سمجھتا ہوں تمہارے لئے یہ بہت مشکل گھڑی ہے مگر میرے پاس کوئی چارہ نہیں ہے، تم کاغذ کو دیکھتی جاؤ اور کرتی جاؤ، اللہ تمہاری مدد کرے گا۔'' وہ اتنا کہہ کر کوٹھڑی سے باہر آئے دروازہ بند کیا، بیلچہ اٹھایا اور با آواز بلند سورۃ یٰسین کی تلاوت کرتے ہوئے قبر کھودنے کے لئے جگہ دیکھنے لگے۔

کوٹھڑی سے بہت فاصلے پر ایک خالی میدان جیسی جگہ تھی انہوں نے صفائی کی اور قبر کھودی۔

واپس آئے تو جنازہ تیار تھا، کلثوم کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے، انہوں نے چارپائی دونوں ہاتھوں سے اٹھالی، پائنتی کو کلثوم نے پکڑ رکھا تھا، چارپائی بہت ہلکی تھی، ایسے جیسے ہوا میں اڑی جارہی ہو،

وہ با آواز بلند کلمہ شہادت کہہ رہے تھے، کلثوم پر عجیب کیفیت طاری تھی، قبر کا مرحلہ آیا دونوں نے ساتھ اتارا، قبر ڈھکی، گلاب کے پھول بچھائے، ایک ٹہنی قبر پر رکھی۔

''پودے بھی اللہ کا ذکر کرتے ہیں، پودے بھی مسلمان ہیں۔'' کبیر بھائی کی بات سیدھے دل میں کھب گئی، وہ فجر تک ذکر کرتے رہے، یہ فجر تک ذکر سنتی رہی، فضا میں ایک عجیب سا سحر طاری تھا، وہ سحر جو خدا کے پاک نام کے ذکر سے طاری ہوتا ہے۔

☆☆☆

اس نے سارے کاٹھ کباڑ چھان کر وہ پرانا بیگ نکالا جو سالوں پہلے اس نے اس جگہ چھپا رکھا تھا اور سالوں بعد وہ بیگ اسے اسی جگہ سے ملا تھا۔

ڈھیر ساری فالتو چیزوں اور کاٹھ کباڑ کی تہہ میں، لگ ایسے رہا تھا جیسے سمندر کی تہہ سے وہ تھیلا نکالا ہو، اس سے دھول ہٹا کر صاف کیا اور اسے الٹ دیا اپنے کمرے میں آکر، پھر ایک ایک چیز وہ کھنگالنے لگی، اس کی ادھوری کہانیاں، شعر و شاعری، لطیفے خاکے، ساری چیزیں بکھر گئیں اور وہ ساری چیزوں کو کھنگال کر ان میں سے ایک چیز تلاشنے کی کوشش کرتی رہی تھی، بالآخر تھیلے کے پھٹے پرانے نچلے خانے سے چند تصویریں برآمد ہوئیں، ان تصویروں پر سے گرد جھاڑتے ہوئے وہ چہرے تلاشنے لگی، اس کی تصویر واضح تھی، برابر میں جیجی تھیں وہ پہچان گئی، مگر ان کے چہرے کی جگہ کسی کے ناخنوں کی لکیریں تھیں، تصویر کرچنے کی کوشش میں جو پڑ جاتی ہیں، وہی لکیریں، ہر اک تصویر پر، پھر ایک تصویر جس کو بری طرح سے کرچا گیا تھا، چہرہ مسخ تھا تصویر کا، اس نے آنکھیں بند کر کے چہرہ کھوجنا چاہا مگر بے سود، چہرہ دھندلایا ہوا تھا۔

وہ تصویریں لئے کمرے سے باہر آئی تھی، حسب معمول وہ کچن میں اس کے لئے تازہ روٹی ڈال رہی تھیں۔

''امی! یہ کیا ہے؟''

''کیا ہے؟'' وہ حیرت سے دیکھنے لگیں۔

''یہ تصویریں ہیں آپ کو پتہ ہے۔'' اس نے بمشکل اپنا غصہ دبایا تھا، وہ ماں کے سامنے اونچا بولنا نہیں چاہتی تھی اسے یہ سب نہیں سکھایا گیا تھا، اس کی تربیت اس کی دادی نے کی تھی، اس کی جیجی نے جنہوں نے بچوں کو اخلاقیات گھوٹ گھوٹ کر پلائی تھیں، ان کا پڑھایا ہوا ہر سبق ازبر تھا مگر حالات کا کیا کیا جائے اور ناانصافیوں کا جو انسان کو اور ہی سبق پڑھاتی ہیں۔

''امی ان تصویروں کے ساتھ یہ سب آپ نے ہی کیا ہے، بتائیں مجھے۔'' غصہ جذب کرنے کی کوشش میں بے بسی جھلک رہی تھی لہجے سے بھی چہرے سے بھی۔

''یہ تصویریں کہاں رکھی تھیں امرت؟''

''آپ کو پتا ہے کہ یہ تصویریں کہاں رکھیں تھیں، امی آپ نے کیوں کیا سب۔''

''امرت تم نے یہ چیزیں ابھی تک سنبھال رکھی ہیں، تم کیوں کر رہی ہو ایسا؟'' جواب دینے کی بجائے انہوں نے آگے سے سوال کیا۔

''آپ نے اچھا نہیں کیا امی، ان چہروں کو یہاں سے مسخ کر سکتی ہیں، مگر دل سے کیسے مسخ کریں

گی، کیسے کھرچیں گی میرے دل سے وہ سب، وہ ساری یادیں، وہ رشتے میرے خون سے کیسے نکالیں گی، ان سے کٹ کر بھی میرا تعلق ان سب سے جڑا ہوا ہے، ایسے جیسے پانچ انگلیاں الگ ہوتے ہوئے بھی آپس میں جڑی ہوئی ہوتی ہیں۔" اس کی آنکھیں گیلی تھیں، وہ تصویریں ہاتھ میں لئے وہاں سے چلی گئی۔

"مجھے پتہ ہے، مجھے پتہ ہے یہ لوگ کبھی تمہارے دماغ سے نہیں نکلیں گے کبھی نہیں۔"

"مگر میری محنت کا کیا ہوا امرت، میری ریاضت کا کیا ہوا، میرے دکھوں کا کیا ہوا، امرت، میرا تو سب ضائع گیا۔" وہ بڑبڑاتیں ہوئیں اس کے پیچھے آئیں تھیں۔

"کچھ نہیں کیا آپ نے، آپ سب ایک جیسے ہیں، آپ خالہ سب، سب نے صرف اپنا سوچا زندگی بھر، امی آپ لوگوں کو رشتوں کی کوئی قدر کیوں نہیں ہے۔" وہ چاہ کر بھی یہ سب کہنے سے خود کو روک نہ پائی تھی۔

"تم مجھے طعنے دے رہی ہو امرت، اپنی ماں کو، ارے عمارہ کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی جبھی وہ ایسی باتیں کرتی ہے، تمہارے ساتھ کیا ہوا، تمہیں تو سب کچھ ملا، میں تمہیں ان جنگلیوں کے پاس سے لے آئی۔"

"مت کہیں جنگلی ان لوگوں کو کہنے سے پہلے کچھ تو سوچ لیں، ہاں اگر وہ اتنے ہی برے ہیں تو میں بھی ان ہی میں سے ہوں، ان جیسی ہوں، آپ کو مجھ سے بھی نفرت کرنی چاہیے، اتنی ہی جتنی آپ ان سب سے کرتی ہیں، کریں اتنی نفرت اور مجھے جانے دیں اسی جنگل میں، جہاں سے اٹھا کر لائیں تھیں۔"

"مجھے پتہ تھا، مجھے پتہ تھا تم ایک دن مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی، مجھے اسی دن کا ڈر تھا امرت، اسی دن کا ڈر تھا مجھے۔" وہ مسلسل روئے جا رہیں تھیں۔

"ہر کوئی اپنا ہتھیار آزماتا ہے، روئیں مت امی، رونا مجھے بھی آتا ہے، مگر میں کس کے سامنے روؤں، کس کو دلاؤں احساس، کس سے کروں بات، آپ سے، آپ نے اور آپ کی بہن نے ہمیشہ خود کو ہی مظلوم سمجھا ہے ہمیشہ سے، ہمیشہ اپنی خوشیوں کو ترجیح دی دوسروں پر، اپنے بچوں پر بھی، ان کی زندگیوں پر بھی اور اب وہاں بیٹھے وہ یہی کہتی ہیں اور یہاں بیٹھے آپ یہ کہہ رہی ہیں، کیا کہوں میں آپ کو زبان رک جاتی ہے میری، کہتے کہتے، ڈر لگنے لگتا ہے، اللہ سے ڈرتی ہوں۔"

ڈر کے نام پر دل بھر آتا تھا وہ بھی اللہ کا ڈر ہو تو آنکھیں بھی بھر آتی ہیں، اتنی دیر سے کیا ہوا ضبط پانی کی طرح بہہ رہا تھا، اسے روتا ہوا دیکھ کر وہ جیسے سکتے میں آگئیں تھیں۔

"میں ڈرتی ہوں اللہ سے، میں بہت ڈرتی ہوں اللہ سے۔" وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر بچوں کی طرح رو رہی تھی۔

انہوں نے آگے بڑھ کر اسے چپ کرانا چاہا تھا گلے سے لگا کر سمجھانا چاہا تھا، بتانا چاہا تھا کہ وہ لاکھ بری سہی مگر اس کی ماں ہے۔

مگر یہ بے بسی تھی کہ وہ ہارے قدموں سے کمرے سے باہر نکل آئیں اب انہیں رونا بھی نہیں آ رہا تھا، کیونکہ خود کے دکھوں پر رونا آسان ہے، انسان اپنے دکھ یاد کر کے بڑی آسانی کے ساتھ رو لیتا ہے مگر اللہ کا ڈر سے رونا بڑی مشکل بات ہے۔

☆☆☆

ہوا بہت تیز تھی یا پھر طوفان تھا، وہ لوٹے تو کوٹھڑی کی چھت گر چکی تھی، بانس کی لکڑیاں نیچے کچے فرش پر بکھری تھیں، اس نے تعجب کے ساتھ کبیر احمد کی طرف سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا جیسے اس واردات کے وقت وہ یہیں موجود ہوں۔

"یہاں ہمارا رزق ختم ہوا، ہمیں اب اور جگہ جانا ہے۔"

"ہمیں کہاں جانا ہے اب؟"

"مجھے تو بہت دور جانا ہے، بہت عرصے سے مدینہ پاک جانا چاہ رہا ہوں مگر ویزہ ہی نہیں ملتا، اب سوچ رہا ہوں وہاں جاؤں جہاں سے سفارش ہوتی ہے۔" وہ پرسوچ انداز میں صحن میں رکھی چارپائی پر بیٹھ گئے ہوا اب بھی چل رہی تھی مگر ہلکی ہلکی، پرے حد ٹھنڈ تھی اس ہوا میں، اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا، سردی کی وجہ سے پھر ہوا آ ٹکراتی تو وہ آنکھیں بند کر لیتی حالانکہ آدھا چہرہ ٹھنڈ کی وجہ سے پہلے ہی ڈھکا ہوا تھا۔

"مثلاً کہاں سے سفارش ہوتی ہے؟" وہ کچھ فاصلے پر چوکی پر بیٹھ گئی سر گھٹنے پر ٹکا لیا۔

"گروز شریف کے گروڑی صاحب کی طرف سے سفارش چاہیے، لوگ مدینہ منورہ کی حسرت میں

ان کی طرف جاتے ہیں، سنا ہے بڑی جلدی مدینے کے سرکار بلا لیتے ہیں اسے۔"

"عجیب ہے، ویسے آپ مسلمانوں کا بھی جواب نہیں ہے، مختلف عقائد، کچھ شرک کہتے ہیں ایسی باتوں کو اور کچھ......" وہ کہتے کہتے رک گئی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیسے ایکسپلین کرے۔

"مسلمانوں سے بڑا گہرا واسطہ رہا ہے کلثوم بی بی۔" وہ اتنی دیر میں پہلی بار بے ساختہ مسکرائے تھے۔

"مریم کہنے میں کیا حرج ہے کبیر بھائی۔"

"کوئی حرج نہیں جویریہ مگر مجھے یہ نام اچھا لگتا ہے۔"

"اوہ پھر جویریہ، ٹھیک ہے جو دل میں آئے کہیں، مگر مجھے بتائیں میں کہاں جاؤں گی اب۔"

"تم کہاں جاؤ گی؟ میرے ساتھ چلو گی۔"

"میں جا کر کیا کروں گی وہاں؟"

"ہاں یہ بات بھی ہے کہ تم وہاں جا کر کیا کروں گی، مگر فی الحال یہاں سے آگے نکلتے ہیں، آگے خدا جانے۔"

"تو اب میں کیا کروں؟"

"اٹھو اپنے چار جوڑے باندھو تھیلا اٹھاؤ اور چل پڑو۔" وہ بڑی آسانی سے کہتے ہوئے لیٹ گئے تھے، وہ سر جھٹک کر آگے بڑھی، چھت گرنے کی وجہ سے سارے میں مٹی دھول اڑ رہی تھی، اس نے چار جوڑے اٹھائے ایک گٹھڑی باندھی تھیلا اٹھایا چار چیزیں سمیٹیں اور باہر آ گئی۔

"چلیں کبیر بھائی۔" وہ گہری نیند میں خراٹے لے رہے تھے، چند منٹ میں اتنی گہری نیند۔

"کبیر بھائی سو رہے ہیں؟" اس نے دوسری دفعہ ذرا اونچے سے پکارا۔

"سونے دو مریم بہت لمبا سفر طے کرنا ہے، تھوڑی دیر سونے دو۔"

"جانا کہاں ہے پھر؟" اس نے گٹھڑی وہیں پھینکی بے زاری سے۔

"بہت دور جانا ہے۔" وہ آنکھیں بند کیے بولے بھاری آواز میں جیسے ذہن ابھی نیند کی گرفت میں تھا۔

"لمبا سفر......اوہ......پھر ایک لمبا سفر......کب تک آخر۔"

"مائے گاڈ، سفر کب ختم ہو گا؟"

"لمبا سفر۔" وہ نیند میں بڑبڑائے۔

"سفر حلیہ۔" اس کے بعد دو منٹ بعد ان کے خراٹے گونجنے لگے۔

"سفر حلیہ۔" اس نے لبوں سے دہرایا اور ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"اور میری منزل کیا ہے؟" خود سے وہ سوال تھا جس کا جواب سالوں سے ادھورا تھا، جس کا جواب ڈھونڈتے ڈھونڈتے سال بیت گئے، سال جو صدیاں تیار کرتے ہیں یہ وہی سال تھے۔

(باقی آئندہ)

"اٹھ جاؤ نیند کے مارو، فجر کی نماز کا وقت ہوگیا ہے۔" دادی نے نوید اور ولید کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کر کہا۔

"کیا ہے دادی؟ ابھی تو آنکھ لگی تھی اور آپ لگیں دروازہ پیٹنے۔" نوید نے کسمسا کر آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔

"نماز پڑھو اٹھ کے اذان ہو رہی ہے۔" دادی نے پھر اپنی بات دہرائی، نوید جھنجلا کر اٹھ بیٹھا اور دروازہ کھولے بنا بولا۔

"دادی! سوائے فجر کے نماز کے کوئی نماز پڑھتی ہیں کیا؟ دن رات تو کیبل پر فلمیں، ڈرامے، ناچ گانے کے پروگرام دیکھ کے ٹائم پاس کرتی ہیں، فجر کی نماز پڑھ کر دن چڑھے تک سوئی رہتی ہیں۔"

"یعنی تم نماز نہیں پڑھنے والے۔" دادی کھسیانی سے ہوگئیں، اپنی مصروفیات کی تفصیل پوتے کی زبان سے سن کر۔

"نہیں ہمارے حصے کی بھی آپ ہی پڑھ لیں۔" نوید اٹھ کر کمرے کا دروازہ کھول دیا دادی کمرے میں داخل ہوگئیں اور ان دونوں کو گھورنے لگیں، ولید تو مزے سے سو رہا تھا اب تک، نوید جھنجلایا ہوا بیٹھا تھا۔

"ہاں آں...... تمہارے حصے کا مر بھی میں جاؤں گی قبر میں منکر نکیر آئیں گے تو حساب کتاب بھی میں ہی دے دوں گی تمہاری جگہ...... یاد رکھو بیٹا، تم سب نے اپنی اپنی قبر میں جانا ہے، اپنی اپنی نمازوں کا، سجدوں کا، تسبیحوں کا حساب ہمیں خود ہی دینا ہے۔" دادی نے سپاٹ لہجے میں انہیں احساس دلانے کی کوشش کی۔

"افوہ، صبح صبح درس دینا شروع کر دیا دادی نے، چل یار ولید اٹھ پڑھ لے نماز، اتنے بڑے واعظ کے بعد نیند ویسے ہی اڑ گئی ہے، آنکھ دوبارہ لگ بھی گئی تو فرشتے خواب میں آ، آ کے جرم گنوائیں گے۔" ولید خود کلامی کرتا آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

"سمجھ میں نہیں آتا اس قوم کا آخر قبلہ کب درست ہوگا؟ کاروبار میں رات گئے تک مصروف رہتے ہیں لوگ نماز روزے سے غافل، تہجد کے لئے اٹھا نہیں جاتا کسی سے اور کاروبار کے واسطے راتوں کو اٹھ اٹھ کر میٹنگیں اٹینڈ ہوتی ہیں، حد ہے بے حسی کی ادھر ظہر کی اذان ہوئی ادھر سارا بازار کھل گیا، نماز کے وقت دکانداری کرنے چل پڑے تو برکت کہاں سے آئے گی کمائی میں؟"

"برکت کے لئے آپ جو گھر میں موجود ہیں دادی۔" نوید نے مسکراتے ہوئے کہا ولید وضو کرنے چلا گیا تھا۔

"قبر میں پیر لٹکائے بیٹھی ہیں لیکن نامہ اعمال میں دبنگ تو، دھوم تھری اور ڈرٹی پکچرز اور چکنی چمیلی لکھوا رہی ہیں، واہ دادی، آپ کے تو فرشتے بھی آب آب ہوتے ہوں گے ایسے تھرلنگ، رومینٹک اور میوزیکل اعمال کے احوال لکھتے ہوئے، بلکہ انجوائے کرتے ہوں گے۔"

"فرشتوں کو تو بخش دیا کرو کم بختو! ہر وقت مذاق، کفر بکنے سے توبہ نہ کریو۔" دادی نے غصے سے کہا۔

"بخشے تو ہم جائیں گے فرشتوں کے لکھے پر، اچھے یا برے لکھے پر۔" نوید نے مسکراتے ہوئے کہا دادی ہاتھ میں پکڑی تسبیح کا ایک ایک دانہ بڑی تیزی سے گرا رہی تھیں۔

"اچھے یا برے لکھے پہ نہیں، اچھے یا برے کیے پہ۔"

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے ناری ہے

"ناری سے یاد آیا نہیا کئی دن سے نظر نہیں آ رہی۔" نوید نے ایکدم سے یاد آنے پر متفکر انداز میں کہا۔

"مل گیا ہوگا تجھ سے زیادہ ہینڈسم اور مالدار لڑکا بلکہ مرغا۔" دادی نے مذاق سے کہا۔

"وہ محبت کرتی ہے مجھ سے۔" نوید نے بتایا۔

"او سیمیں۔" ولید نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"سچی اس نے مجھے آئی لو یو بولا تھا۔" نوید نے شرماتے ہوئے بتایا۔

"یا تو اس کی آنکھیں خراب ہیں یا دماغ خراب ہے۔" ولید نے شرارت سے کہا تو دادی بولیں۔

"یہ دوسری والی بات دل کو لگتی ہے۔" اور اس بات پر ولید خوب محظوظ ہو کر ہنسا، نوید نے اسے گھورا۔

"ایک تو بیلنس نہیں ہے میرے موبائل میں صبح ہوتے ہی پہلا کام بیلنس لوڈ کرانے کا کروں گا پھر نہیا کو فون کروں گا، کیسے دل پسند ایس ایم ایس سینڈ کرتی ہے وہ ہائے۔" نوید موبائل اٹھا کر میسج دیکھتے ہوئے مگن انداز میں مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا، دادی کی موجودگی کا اسے خیال ہی نہ رہا تھا جیسے۔

"کبھی قرآن پاک کو بھی اتنے ہی دھیان، شوق اور محبت سے پڑھ کے دیکھو، جتنے دھیان سے ایس ایم ایس پڑھتے ہو، بیلنس لوڈ کرانے جس طرح تیزی سے بھاگتے ہو اسی طرح نماز کے لئے بھی بھاگو تو پتا چلے نا کے تم مسلمان ہو، کبھی بیلنس کی طرح نماز کی فکر بھی کر لیا کرو، موبائل کی رنگ ٹون سن کر سوتے سے جاگ جاتے ہو اذان کی آواز سن کر جاگتے ہوئے موت آتی ہے تمہیں، موبائل کی آواز پہ دوڑے چلے آتے ہیں، اذان کی آواز سنی ان سنی کیے جاتے ہیں، زندگی ہمیشہ نہیں رہے گی بیٹا، زندگی کا نیٹ ورک تو ایک دن فیل ہو ہی جائے گا، یہ نہ ہو کے تم آخرت میں بھی فیل ہو جاؤ، کیونکہ نماز کو چھوڑنا، اللہ کو ناراض کرنا ہے، تمہیں سمجھانا، راہ دکھانا، نماز کے لئے جگانا میرا کام تھا، آگے تم خود سمجھدار ہو، جنت یا جہنم، کنجی تمہارے اپنے ہاتھ میں ہے، یاد رکھو نماز جنت کی کنجی ہے۔"

"جنت کے لالچ میں ہم نماز پڑھیں، چہ چہ، کتنی بری بات ہے نا دادی۔" نوید نے بے نیازی سے کہا۔

"ڈر فٹے منہ تیرا، کوئی کام کی بات تیرے شیطانی دماغ میں نہیں گھسنے کی، تو، تو بس اپنی نیند اور نہیا کی فکر کر، آخرت میں جب سانپ، بچھو کاٹیں گے ناں تب تجھے دادی کی یہ باتیں یاد آئیں گی۔" دادی غصے سے کہتی کمرے سے نکل گئیں اور نوید پھر سے کمبل تان کر لیٹ گیا، دور کی مسجد سے موذن کی آواز اب بھی آ رہی تھی۔

"نماز نیند سے بہتر ہے۔"
"اصلاۃ خیر من النوم۔"
"حی اعلی الفلاح۔"
"آؤ بھلائی کی طرف۔"

☆☆☆

حمید اختر اور صفیہ بیگم کا گھرانہ چھ افراد پر مبنی تھا، حمید اختر، ان کی بیوی صفیہ بیگم، تین بچے بیس سالہ نوید، اکیس سالہ ولید اور بائیس برس کی ذویا، نوید اور ولید دونوں انجینئرنگ یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے، پڑھائی سے زیادہ غیر نصابی سرگرمیوں میں ان کا ٹائم زیادہ گزرتا تھا، ذویا دو سال سے اسکول میں ملازمت کر رہی تھی اور اس کے اے گریڈ میں ایم اے انگلش کیا تھا، بی ایڈ بھی کیا بھی کیا ہوا تھا لہٰذا اسے چند ماہ پہلے ہی سرکاری

اسکول میں ملازمت مل گئی تھی اور وہ ماہانہ بائیس ہزار تنخواہ لے رہی تھی، حمید اختر محکمہ انہار میں ملازم تھے، ان کی تنخواہ میں گھر کے اخراجات بمشکل پورے ہوتے تھے۔

حمید اختر نے ایک دکان کرایے پہ دے رکھی تھی جس کی آمدنی سے نوید اور ولید کی یونیورسٹی کی فیس دی جا رہی تھی اور دیگر اخراجات پورے ہو رہے تھے، ذویا بھی اپنی تنخواہ کا کچھ حصہ گھر میں صفیہ بیگم کو دیتی تھی، اس نے اپنی کالج کی فیس خود اپنی محنت کی کمائی سے ادا کی تھی۔

بی اے سے بی ایڈ اور ایم اے تک ذویا نے اپنے تعلیمی اخراجات خود اٹھائے تھے اور اب صفیہ بیگم اس کی تنخواہ میں سے ہی اس کے جہیز کے لئے کچھ نہ کچھ خرید کر رکھ لیتی تھیں، یوں سب ہی آپس میں شیر و شکر اور خوش تھے مگر کچھ عرصے سے گھر کا نظام کچھ الٹ پلٹ سا ہو گیا تھا، کھانا پکانے سے لے کر گھر کی صفائی ستھرائی تک کوئی بھی کام وقت پر نہیں ہوتا اور کبھی کبھی تو عین ناشتے کے وقت حمید اختر اپنے کپڑے استری نہ کیے جانے پر واویلا مچا رہے تھے، کبھی نوید کو اپنی من پسند شرٹ میلی ملتی تو کبھی ولید کو اپنے موزے نہیں مل رہے، رہی ذویا تو اسے اپنا ہر کام خود سے کرنے کی عادت شروع سے ہی تھی لہٰذا وہ سب سے پہلے تیار ہو کر سب کے لئے ناشتہ بنا کر ٹیبل پر موجود ہوتی تھی، حمید اختر شام میں گھر آتے تھے لہٰذا اب دوپہر کا کھانا بھی ان کے آنے تک بنتا تھا، نوید، ولید کبھی جلد آتے تھے کبھی دیر سے اور ذویا اسکول کی چھٹی کے بعد دو بجے گھر پہنچتی تھی اور اسے شدید بھوک لگ رہی ہوتی تھی مگر کچن میں خالی برتن اس کا منہ چڑا رہے ہوتے اور کئی بار تو صبح کے ناشتے کے برتن بھی اسی طرح گندے پڑے ہوتے اور ان گندے برتنوں پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہوتیں، یہ دیکھ کر ذویا کا دماغ گھوم جاتا۔

گھر میں بدنظمی اور گندگی اس دن سے ہونا شروع ہوئی تھی جس دن سے گھر میں کیبل لگی تھی، پہلے صرف ایک چینل تھا، رات آٹھ بجے ڈرامہ لگتا تھا، نو بجے خبرنامہ آتا تھا، حمید اختر خبرنامہ سنتے ہی سونے کے لئے چلے جاتے اسی طرح گھر کے تمام افراد دس بجے تک اپنے اپنے بستروں میں گھس جاتے تھے، رات کو جلدی سوتے تھے تو صبح جلدی بیدار ہوتے ہیں فجر کے نماز ادا کرتے قرآن پاک کی تلاوت کرتے، آرام کرتے اور ناشتے کے بعد اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے، لیکن جس دن سے کیبل لگی تھی، ہر کوئی ٹی وی کے سامنے بیٹھا نظر آتا، دادی کیا اور صفیہ بیگم کیا، گھر کی عورتیں دن رات ٹی وی کے سامنے بیٹھی رہتیں، نہ گھر کی صفائی کا خیال، نہ کھانا پکانے کی فکر۔

کام والی آ کر جھاڑو پوچا کر جاتی تو کر جاتی ورنہ وہ بھی نہ ہوتا، کپڑوں کا ڈھیر لگ جاتا مگر صفیہ بیگم کو واشنگ مشین لگانے کی فرصت نہ ملتی کے وہ تو مزے سے صوفے پر براجمان انڈین چینلو کے ڈرامے اور شوز دیکھا کرتیں، یہی نہیں دادی بھی ہاتھ میں تسبیح پکڑے ان کے ساتھ ٹی وی دیکھا کرتیں اور جہاں کوئی رومانوی یا فحش سین آتا توبہ توبہ کرنے لگتیں اور استغفار پڑھتی ہوئی تسبیح کے دانے تیزی سے گراتی جاتیں، ڈرامے اور ناچ گانے کے پروگرامز کی لڑکیاں کے مختصر لباس پر اوئی اللہ، ہائے اللہ، "اف کیسی بے شرم ہیں یہ انڈین لڑکیاں، کپڑے تو پہننا پسند ہی نہیں کرتیں۔"

جیسے تبصرے بھی کرتیں جاتیں اور تو اور وہیں بیٹھی بیٹھی مالٹے، سنگترے اور مونگ پھلیاں بھی کھاتی جاتیں اور چھلکے پورے لاؤنج میں بھٹکتے پھرتے، پھوہڑپن اور کام چوری کا ثبوت پیش کرتے نظر آتے تھے، لائیٹ چلی جاتی تو فوراً جنریٹر آن کر لیا جاتا۔

ڈرامے تو ڈرامے انڈین فلمیں تک کئی کئی بار دیکھی جاتیں، دن بھر صفیہ بیگم اور دادی ٹی وی کی جان نہ چھوڑتیں اور شام میں نوید اور ولید کے ہاتھ میں ٹی وی کا ریموٹ آ جاتا وہ اپنی مرضی کے انگلش فلموں کے چینلو اور اسپورٹس چینلو لگا لیتے، نو بجے حمید اختر خبریں سنا کرتے اور دس بجے ریموٹ پھر سے نوید، ولید کے ہاتھ میں ہوتا، کئی بار ان دونوں کے بیچ بھی جھگڑا ہو جاتا، نوید کو اس عمر میں بھی کارٹون چینل دیکھنا ہوتا اور ولید کو کرکٹ میچ دیکھنے کی تمنا ہلکان کر رہی ہوتی تھی۔

رات کے دو تین بجے تک وہ دونوں ٹی وی دیکھتے یا اپنے کمپیوٹر پر کیبل کے چینلو دیکھتے، صفیہ بیگم تو شوہر کی وجہ سے دس بجے اپنے کمرے میں چلی جاتیں، مگر دادی رات گئے ٹی وی دیکھا کرتیں، دادی نمازی بھی پانچ وقت کی تھیں مگر کیبل کے چینل دیکھ دیکھ کر ساری عبادت برابر کر دیا کرتیں، کہنے کو وہ دین اور دنیا ساتھ ساتھ لے کر چل رہی تھیں، حقیقتاً وہ اپنی آخرت کی کمائی کم رہی تھیں وہ بھی نیک کمائی۔

اور صفیہ بیگم شروع شروع میں جب کیبل لگی تھی تو دیکھنے کے شوق اور جنون میں جلدی جلدی سارے کام نمٹا لیا کرتی تھیں تاکہ سکون سے بیٹھ کر ڈرامے وغیرہ دیکھ سکیں لیکن آہستہ آہستہ انہوں نے ہر کام سے ہاتھ کھینچ لیا، ناشتہ ذویا بناتی تھی، گھر آ کر دوپہر کو اکثر روٹیاں بھی اسے ہی پکانی پڑتی تھیں سالن شام کو پکتا تھا، کیونکہ حمید اختر تو رات کو ہی گھر کھانا کھایا کرتے تھے، نوید، ولید جلدی گھر آ گئے تو ایک دن پہلے کا بچا سالن دے دیا ورنہ وہ بھی باہر سے کچھ کھا لیتے کئی بار وہ غصے میں ماں پہ برستے کہ کھانا تک تیار نہیں ملتا ان کو، تب صفیہ بیگم بڑبڑاتی ہوئی تیزی سے ہاتھ چلاتیں اور انہیں تازہ چپاتیاں ڈال دیتیں اور فریزر میں سے کباب نکال کر فرائی کر دیتیں، ذویا کو کباب پسند تھے اس لئے وہ چھٹی کے دن کبھی کبھار کافی سارے کباب بنا کر فریز کر دیا کرتی تھی جو ایسے ناگہانی مواقع میں کافی سہارا دیا کرتے تھے دوسرے لفظوں میں یہ کہنا درست ہو گا کے آگ پر پانی ڈالنے کا کام کرتے تھے، ذویا کو اس ساری صورتحال پر بہت غصہ آیا کرتا تھا مگر ضبط کر جاتی تھی، بھوک سے بے حال ہوتی وہ گھر پہنچتی تھی اور گھر میں کھانا ہی نہیں پکا ہوتا تھا، اس کا دل چاہتا کہ کیبل کٹوا دے یا ٹی وی توڑ ڈالے، مگر سوائے صبر و ضبط کے مظاہرے کے وہ کچھ بھی نہ کر پاتی۔

☆☆☆

ذویا اسکول سے گھر لوٹی تھی، شدید بھوک لگ رہی تھی، چینج کر کے باورچی خانے میں آئی تو کچھ پکا ہوا نہیں تھا وہ وہیں سے صفیہ بیگم کو آواز دے کر پوچھنے لگی۔

"امی! کھانا نہیں پکایا گیا؟"

"کل کا سالن رکھا ہے فریج میں وہ گرم کر لو اور ڈبل روٹی کے ساتھ کھا لو۔" صفیہ بیگم نے لاؤنج میں بیٹھے بیٹھے ہی ٹی وی پر نظریں جمائے جواب دیا۔

"امی! سالن خراب ہو گیا ہے صبح سے تو باہر رکھا تھا نجانے فریج میں کب رکھا ہو گا آپ نے؟" ذویا نے فریج کھول کر سالن کی پلیٹ نکال کر سونگھی تو باسا ند آنے پر منہ بنا کر بولی۔

"صبح بھی ایک کپ چائے کے ساتھ ایک سلائس کھا کے گئی تھی، آخر آپ سارا دن کیا کرتی

ہیں؟"

"ٹی وی دیکھتی ہیں۔" نوید اسی وقت اندر داخل ہوا اس کی بات سن کر بولا، ذویا کچن سے باہر نکل آئی۔

"ایک تو اس کیبل نے ہمیں ہر طرح سے ڈس ایبل کر کے رکھ دیا ہے۔"

"ہاں تو کیا کریں؟ بجلی بار بار جاتی ہے فریج تو جنریٹر پر نہیں چلتا، فریج میں کچھ بھی رکھو خراب ہو جاتا ہے اور ادھر ڈرامے کی قسط بھی نکل جاتی ہے۔" صفیہ بیگم بولیں۔

"امی! ایک ڈرامہ دن میں چار سے پانچ بار ریپیٹ ہوتا ہے، ہر بار دیکھنا فرض ہے کیا؟ جو فرض ہے وہ پانچ بار بھی ادا نہیں ہوتا۔"

"اچھا اب میری ماں بننے کی کوشش مت کرو، دو روٹی ڈال لے تو اپنے لئے۔" صفیہ بیگم نے تلخ اور درشت لہجے میں کہا تو وہ دوبارہ باورچی خانے میں چلی گئی اور چولہا جلا کر توا رکھ دیا، فریزر میں سے آٹا نکالا اور پیڑے بنانے لگی، اس کا موڈ امی کے رویے کی وجہ سے سخت خراب ہو چکا تھا۔

"اب اپنے لئے روٹی پکا ہی رہی ہے تو، ہمارے لئے بھی ایک ایک پھلکا ڈال لیجیو۔" صفیہ بیگم کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تھی اور اس کے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے تھے۔

"مجھے آملیٹ بھی بنا دو بہنا۔" نوید نے ذویا سے کہا۔

"انڈے تو خوب لا رہے ہو آج کل تم، ابو کو پتا چلا نہ تو تمہیں لگ پتا جائے گا، اسٹار پلس کے ڈرامے دیکھ دیکھ کر پیپرز میں اسٹار آنا بند ہو گئے ہیں، یہاں دن میں تارے نظر آنے لگے ہیں اب تو مگر ہماری امی دادی کو پروا ہے نہ احساس، جب سے منحوس کیبل لگی ہے نا ان کے تو مزاج ہی بدل گئے ہیں، دادی کو دیکھو نمازیں بھی پڑھتی ہیں ناچ گانا، فلمیں بھی دیکھتی ہیں۔"

"میٹھا پورا رکھتی ہیں دادی بھی۔" نوید نے ذویا کی بات سن کر مسکراتے ہوئے کہا ذویا نے اسے روٹی اور آملیٹ ٹرے میں رکھ کر دیا، امی اور دادی کے لئے بھی روٹی اور آملیٹ بنایا اور انہیں کھانا وہیں ٹی وی لاؤنج میں کھانا دے آئی۔

"امی! کم از کم دوپہر کا کھانا تو پکا لیا کریں اسکول سے آتی ہوں تو بھوک لگی ہوتی ہے یہ ڈرامے رات میں دیکھ لیا کریں۔"

"رات میں کیا خاک دیکھ لیا کریں، تمہارے ابو وہ نیوز چینل اور ٹاک شوز دیکھنے بیٹھ جاتے ہیں، یہ موئے سیاستدان کم بخت چھ چھ آدمی ایک ساتھ گلا پھاڑتے ہیں کوئی کسی کی نہیں سنتا، ایسے پڑھے لکھے جاہلوں کو سن کر اپنا اخلاق خراب کرنے سے بہتر ہے آدمی کوئی فلم یا ڈرامہ دیکھ لے۔" صفیہ بیگم نے سنجیدگی سے کہا۔

"فلم، ڈرامے کون سا اخلاق سدھار رہے ہیں؟" ذویا نے جل کر کہا۔

"اس میں تو بوڑھی روح حللول کر گئی ہے اب بندہ انٹرٹینمنٹ بھی نہ کرے۔" دادی نے کہا تو نوید ہنس کر بولا۔

"بالکل دادی! انٹرٹینمنٹ کے لئے کچھ بھی کرے گا۔"

"اذان ہو رہی ہے کم از کم اذان کے وقت تو ٹی وی کی آواز بند کر دیا کریں، کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی، نیکی تو کسی سے ہوتی نہیں ہے، گناہوں کا ذخیرہ کیے جا رہے ہیں۔" ذویا نے اذان کی آواز سن کر سر پہ دوپٹہ اوڑھتے ہوئے بیزاری سے کہا اور نماز کے لئے اٹھ گئی، وہ تینوں ایک دوسرے کو دیکھ کر نظریں چرا گئے۔

گھر میں بے ترتیبی اور بدنظمی کی یہی روٹین جاری تھی، شام کو جب حمید اختر کے گھر آنے کا وقت ہوتا تو تب صفیہ بیگم اور دادی ٹی وی کے آگے سے اٹھتیں، صفیہ بیگم ٹی وی لاؤنج میں پھیلا گند سمیٹتیں اور کچن میں جھانکتیں، دادی اپنے کمرے میں جا کر لیٹ جاتیں۔

☆☆☆

ذویا کو آج پھر وہی بے نیازی دکھائی دے رہی تھی، اسکول سے واپسی پر ٹی وی لاؤنج میں چائے کی خالی کپ مونگ پھلی اور سنگترے کے چھلکے بسکٹ کے ریپرز بکھرے دکھائی دیئے تو اسے یقین نہ آیا کہ یہ وہی گھر ہے جو ایک سال پہلے تک صاف ستھرا دکھائی دیتا تھا، ہر چیز ترتیب اور سلیقے سے اپنی صحیح جگہ پر رکھی ہوئی ملتی تھی، کھانا، ناشتہ وقت پر تیار ملتا تھا، مگر ایک سال سے جب سے یہ منحوس کیبل لگوائی گئی تھی تب سے کچھ بھی پہلے جیسا نہ رہا تھا۔

سلیقے اور صفائی میں ماہر صفیہ بیگم اب پھوہڑ پن کاہلی اور کام چوری کی تصویر بنی رہتی تھیں، دادی جو گھر کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹایا کرتی تھیں ان کو نماز، روزے کی تاکید کیا کرتی تھیں، قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتی تھیں، اب انہیں اپنے سوپ ڈرامہ سیریلز کی فکر رہتی تھی، کبھی ہوا صبح کے وقت نوید، ولید کو جگانے پہنچ گئیں کیونکہ تب تک وہ خود بھی ٹی وی دیکھ رہی ہوتی تھیں، اللہ جانے کون کون سے چینل دیکھا کرتی تھیں دادی کے ان کو اپنی وہ پوتی ذویا جو شرقی حسن و حیا کا پیکر دکھائی دیتی تھی، اب وہی ذویا انہیں بوڑھی روح دکھائی دینے لگی تھی، کیبل کے چینل نے ان کے انداز فکر بھی بدل کر رکھ دیئے تھے۔

"امی! آج بھی کھانا نہیں پکایا آپ نے؟" ذویا نے تھکے ہوئے لہجے میں ان سے پوچھا وہ بہت مگن تھیں ڈرامہ دیکھنے میں اس کی جانب دیکھے بنا بولیں۔

"چاول ابالے تھے فریج میں کل کی دال اور چٹنی رکھی ہے وہی ڈال کے کھا لو۔"

"اور ابو کیا کھائیں گے؟" ذویا نے سلگ کر سوال کیا۔

"تمہارے ابو، رات کو ہی آئیں گے جب تب تک تم چکن قورمہ بنا لینا۔" صفیہ بیگم نے اپنی نظریں بدستور ٹی وی پر رکھتے ہوئے جواب دیا تو وہ تپ کر بولی۔

"اور آپ کیا کریں گی؟"

"ڈرامہ دیکھوں گی اور کیا کروں گی دکھائی نہیں دیتا کیا، چلو اب تنگ مت کرو۔" صفیہ بیگم نے مونگ پھلی چھیلتے ہوئے تیز لہجے میں کہا تو جہاں ذویا کا دل دکھ اور غصے سے بھر گیا تھا وہاں دادی نے زچ آ کر کہا۔

"چپ بھی کرو تم دونوں، ڈرامہ سننے دو مجھے۔"

"ان ڈراموں کے پیچھے سارے گھر کا حال بے حال کر رکھا ہے آپ نے، کیا فائدہ ایسے ڈرامے دیکھنے کا جو آپ میں کوئی سدھار ہی نہ لا سکیں اور دادی! آپ بھی اپنی آخرت خوب ہری کر رہی ہیں، فرشتوں کو شیلا کی جوانی کے قصے سنائیے گا۔" ذویا نے تپ کر سپاٹ لہجے میں کہا۔

دادی نے اس کی طرف دیکھا وہ بائیس برس کی سرخ و سفید رنگت، دلکش نین نقوش کی مالک بہت خوبصورت لڑکی تھی، خوابوں کی دنیا میں رہتی ہیں ایسی لڑکیاں اور اس عمر کی لڑکیاں تو دادی کو اس کی سوچ پر حیرت ہوئی وہ صفیہ بیگم سے مخاطب ہوئیں۔

"اے صفیہ! اسے ذویا کو تو، تو کسی اسلامی اسکول یا اسلامی ٹی وی چینل میں بھرتی کروا دے یہ اپنی عمر سے زیادہ اسلامی ہو گی ہے بھئی۔"

"چھوڑیں اماں! آپ ڈرامہ دیکھیں۔" صفیہ بیگم نے بات اڑائی، اسی وقت ڈور بیل بجی تو صفیہ نے ذویا سے کہا۔

"دیکھیو کون ہے باہر دروازے پہ، جو بھی ہو ڈرائنگ روم میں بٹھانا یہاں مت لانا۔"

"ہاں یہاں لا کر شرمندہ تھوڑی ہونا ہے مجھے کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا کہ تین تین عورتیں گھر میں موجود ہیں اور گھر میں صفائی ستھرائی تک نہیں ہوتی ان سے۔" ذویا نے تیزی اور تلخی سے کہا اور دروازہ کی طرف بڑھ گئی، صفیہ بیگم کھسیانی سی ہوئیں اور پھر اگلے ہی پل سر جھٹک کر ٹی وی ڈرامہ کی جانب متوجہ ہو گئیں۔

ذویا نے دروازہ کھولا تو سامنے برابر والی پڑوسن کی بارہ سالہ بچی رمشا ٹرے لئے کھڑی تھی، رمشا کو وہ ٹیوشن پڑھاتی تھی۔

"السلام علیکم باجی!" رمشا نے اسے دیکھتے ہی سلام کیا۔

"وعلیکم السلام! رمشا کیسی ہو؟"

"ٹھیک ہوں ذویا باجی! یہ امی نے آپ کے لئے بریانی اور رائتہ بھیجا ہے۔" رمشا نے ٹرے آگے بڑھا دی۔

"ارے واہ کتنی اچھی ہیں آپ کی امی ان کو میرا اسلام کہنا اور بہت بہت شکریہ کہنا۔" ذویا نے خوش ہو کر مسکراتے ہوئے کہا اور ٹرے اس کے ہاتھوں سے لے لی۔

"ٹھیک ہے باجی! کہہ دوں گی۔"

"آؤ اندر آؤ نا۔"

"نہیں باجی! وہ منا دروازے میں تھا کہیں باہر نہ نکل آئے میں چلتی ہوں برتن شام کو لے لوں گی۔"

"ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی، شکریہ۔"

"اللہ حافظ باجی!" رمشا چلی گئی۔

"اللہ حافظ۔" ذویا دروازہ بند کر کے ٹرے لئے سیدھی کچن میں چلی آئی، چمچ لے کر وہیں میز پر ٹرے رکھی اور بریانی کھانے لگی۔

"شکر الحمدللہ! واہ مالک تیری رحمت تو واقعی بہت بڑا اور بہت اچھا رازق ہے، بھوکوں کو کھانا کھلانے والا ہے، تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے پروردگار کے تو نے میری بھوک مٹانے کے لئے اتنے عمدہ رزق کا اہتمام فرمایا، بہت شکریہ اللہ جی! شکر الحمدللہ۔" ذویا نے فرط مسرت وعقیدت سے تشکر سے نم لہجے میں با آواز بلند اور مزے لے لے کر بریانی کھانے لگی۔

☆☆☆

آج جب ذویا اسکول سے گھر لوٹی تو خلاف معمول گھر میں بہت خاموشی تھی اور گھر پہلے کی طرح خوب صاف ستھرا اور چمکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا، صحن میں لگی الگنی پر دھلے ہوئے کپڑے سوکھ رہے تھے اور تو اور جب وہ فریش ہو کر کھانے کے خیال سے کچن جانے لگی تو یہ دیکھ کر حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کہ ڈائننگ ٹیبل پر کھانا چنا ہوا تھا اور اسی کا انتظار ہو رہا تھا۔

"واہ بھئی آج یہ اہتمام کس لئے امی؟" وہ پوچھے بنا رہ نہ سکی، ٹیبل پر چکن بریانی، کباب، سلاد، رائتہ اور سویٹ ڈش بھی موجود تھی، ذویا کو کیا نوید، ولید اور حمید اختر بھی آج تو اس اہتمام پر حیرت زدہ تھے۔

"ہاں اور یہ ٹی وی کیوں بند ہے آج؟" حمید اختر نے پوچھا۔

"ٹی وی لاؤنج آج ویران ویران سا لگ رہا ہے کیوں امی، دادی کیا ہوا؟" نوید نے شرارت سے پوچھا۔

"کہیں ٹی وی خراب تو نہیں ہو گیا؟" ولید

نے خدشہ ظاہر کیا، دادی اور صفیہ بیگم خجالت سے ایک دوجے کو دیکھ رہی تھیں۔

"ہاں ابھی آج تو ہر چیز چمک رہی ہے اصل وجہ تو بتاؤ؟" حمید اختر نے بیوی کی طرف شوخ نظروں سے دیکھا تو وہ ٹپٹا کر بولیں۔

"وجہ کیا ہوتی ہے وہ موئے کیبل والے کی ماں کا انتقال ہو گیا ہے جس کے سوگ میں اس نے تین دن کے لئے کیبل بند کر دی ہے۔"

"گویا یہ اہتمام صرف تین دن کا مہمان ہے۔" حمید اختر نے مسکین سی شکل بنا کر کہا تو نوید بولا۔

"چار دن کی چاندنی پھر اندھیری رات۔"

"اللہ جنت نصیب کرے کیبل والے کی والدہ مرحومہ کو جن کی وفات کے طفیل آج گھر میں مہینوں بعد ہمیں تازہ اور مزیدار کھانا کھانے کو مل رہا ہے اور وہ بھی صحیح وقت پر، شکر الحمدللہ۔" ذویا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی بیگم! ذویا ٹھیک کہہ رہی ہے جب سے کیبل لگوائی ہے کسی کے پاس آپس میں بات کرنے کا وقت ہی نہیں رہا، ہر کسی نے اپنا ٹائم باندھ رکھا ہے ٹی وی دیکھنے کا، گھر کی فکر، نہ کھانے پکانے کی، نہ پڑھائی کی اور تو اور نماز سے بھی گئے آپ لوگ رات بھر جاگنا اور دن چڑھے تک سونا کاہلی کی علامت ہے، برکت اٹھ جاتی ہے گھر سے، آپ لوگ رات رات بھر کیبل دیکھتے ہیں اور عین نماز فجر کے وقت سونے کے لئے لیٹ جاتے ہیں، جس وقت رزق تقسیم ہو رہا ہوتا ہے ہم سو رہے ہوتے ہیں اور پھر شکوہ بھی کرتے ہیں کہ ہماری دعائیں قبول نہیں ہو رہیں، کمائی میں برکت نہیں رہی، یہ ناچ گانا فلمیں وغیرہ دیکھنے کے لئے آپ لوگ رات بھر جاگتے ہیں، جانتے ہیں کیوں؟ کیونکہ یہ کانٹوں کا بستر ہے اور کانٹوں کے بستر پہ کبھی نیند نہیں آتی، عبادت، ذکر الٰہی اور تسبیح ومناجات میں سکون ملتا ہے نیند آنے لگتی ہے کیونکہ یہ پھولوں کا بستر ہے۔"

"اچھا اب آپ واعظ چھوڑیں کھانا شروع کریں ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" صفیہ بیگم نے اپنی خفت مٹانے کو ان کا دھیان بٹاتے ہوئے کہا تو وہ ہنستے ہوئے اپنی پلیٹ میں بریانی نکالنے لگے۔

"یہ ہم سب کا آپس میں مل بیٹھنا، ایک ساتھ کھانا کھانا، ایک دوسرے سے بات کرنا، اچھی بات کرنا، اچھی بات سننا ایک دوسرے سے اپنی بات کہنا، اپنا احوال کہنا یہی تو اصل خوشی ہے ایک فیملی کی، ایک گھر کے افراد کی، ہر چیز میں اعتدال ضروری ہے، میانہ روی سے سب کام سہل ہوتے چلے جاتے ہیں، کسی بھی چیز کی انتہا اور شدت پسندی ہمیشہ انتشار اور بگاڑ کا باعث بنتی ہیں اور وہ آپ خود تجربہ کر کے دیکھ چکی ہیں بیگم صاحبہ! ہر وقت ٹی وی دیکھتے رہنے سے گھر کی کیا حالت ہو رہی ہے، ہر کام التواء میں پڑا تھا، آج ٹی وی بند ہے تو کیسے سب کام بخوبی انجام پا گئے ہیں۔" حمید اختر نے بریانی کھاتے ہوئے کہا۔

"حی علی الفلاح۔"

"آؤ بھلائی کی طرف۔"

"کتنا آسان ہے نا ابو اگر غور کیا جائے، سمجھا جائے تو۔" ذویا نے حمید اختر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹا! بھلائی کے کام کرنا، بھلائی کی طرف آنا اور بھلائی کی طرف بلانا بھی نیکی ہے اور اللہ تعالیٰ تو ہمیں دن میں پانچ بار بلاتے ہیں، اذان کے ذریعے، پکارتے ہیں اس سیدھے سچے اور صحیح راستے کی طرف جس میں ہم سب کی نجات ہے، مجبوری میں گناہ چھوڑنا، برائی سے

منہ موڑنا الگ بات ہے، دل سے اور روح سے نیت اور ارادے سے برائی، گناہ اور غلط راستے کو چھوڑنا، ترک کرنا ہی اصل نیکی اور بھلائی ہے، جو انسان اللہ کے رستے پر چلا وہ یقیناً فلاح پا گیا، کسی انسان کے کہنے پر ہم نہیں چلتے وہ تو اللہ ہے ہمارا رب کیا ہم اس کی پکار پر بھی لبیک نہیں کہیں گے؟ وہ جو ہمیں دن اور رات کے مختلف اوقات میں بلاتا ہے ہمیں کہتا ہے کہ آؤ بھلائی کی طرف حی اعلی الفلاح، حی اعلی الفلاح۔"

☆☆☆

حمید اختر رسانیت سے بول رہے تھے اور سب خاموشی سے سن رہے تھے اور شرمندگی بھی محسوس کر رہے تھے کہ وہ کس راستے پر چل نکلے تھے، جہاں صرف وقتی سرور اور لمحاتی تسکین ملتی تھی، جہاں سب کچھ عارضی تھا، وہ اعلیٰ اور حقیقی خوشی، سرور اور سکون کی راہ کو چھوڑ کر اس مصنوعی راہ کو ترجیح دے رہے تھے، ایک غیر مسلم مالک کے چینلز کو اس کا کلچر کو دیکھ رہے تھے جو اپنے ہر پروگرام، ڈرامے اور ہر شو میں اپنے بھگوان کو دکھاتے ہیں، جو اپنے بتوں کے سامنے ہاتھ جوڑتے نظر آتے ہیں وہ اپنے ڈراموں میں اپنے مذہب کا پرچار کرتے نظر آتے ہیں، اپنے بھگوان، کالی ماتا، گنیش جی کے معجزات ان کی طاقت اور اثر دکھاتے ہیں اور ہم ایسے کمزور عقیدے کے لوگ ہیں کے بہت شوق سے بیٹھ کر یہ سب دیکھتے ہیں اور ان سب کے پیچھے اپنی نماز تک بھول جاتے ہیں، اپنے اہم کام تک نظر انداز کر دیتے ہیں، جب اذان کی پکار آتی ہے کہ "حی اعلی الفلاح، حی اعلی اصلاۃ"

"آؤ بھلائی کی طرف۔"

"آؤ نماز کی طرف۔"

"تو ہم برائی دیکھنے میں مگن ہوتے ہیں اپنے دین اور عقیدے کی نفی کیے، غیروں کے عقیدے اور پوجا پاٹ دیکھ رہے ہوتے ہیں، اپنی اصل بھول کر دوسروں کی نقل کرنے کی کوشش میں ہم آدھے تیتر آدھے بٹیر بن رہے ہیں، ایک مسلمان کا راستہ تو صرف اس کے اللہ کا راستہ ہے اور جسے اللہ خود بھلائی کے راستے پہ بلاتا ہے اس کی راہ میں خواہ کتنے بت، کتنے ہی رنگین راستے آئیں وہ انسان کبھی بھٹکتا نہیں ہے ہمیشہ بھلائی کے رستے پر ہی رہتا ہے، خواہ وہ کتنی ہی مشکلات میں گھر جائے، کتنی دور نکل جائے لوٹ کر اپنے اصل کی طرف ہی آتا ہے، اپنے رب کی طرف ہی آتا ہے کیونکہ وہ رب اسے ہر پل پکارتا ہے، ہر لمحہ اس سے کہتا ہے۔"

"حی اعلی الفلاح۔"

"حی اعلی الفلاح۔"

اور نوید، ولید، صفیہ بیگم اور دادی بھی بھلائی کے رستے پر واپس لوٹ آئے تھے، انہیں سمجھ آ گئی تھی کہ اعتدال اور میانہ روی زندگی میں توازن برقرار رکھتے ہیں اور اپنی اساس، اپنا اصل، اپنا عقیدہ بھول کر دوسروں کے نقش قدم پر چلنے یا دوسروں کے رسوم و رواج سے متاثر ہونا دراصل اپنی زندگی اور زندگی سے جڑے رشتوں کو متاثر کرنا ہے اور بھلائی صرف اللہ کے رستے پر چلنے میں ہے دوسروں کو بھلائی کی طرف بلانے میں ہے، ہم دوسروں سے کیوں متاثر ہوتے ہیں؟ ایسا طرز عمل کیوں نہیں اپناتے جس سے دوسرے ہمارے مذہب، عقیدے اور تہذیب سے متاثر ہوں؟

☆☆☆

''سنبل باجی ارے کہاں بھاگی جا رہی ہیں آپ؟ بھئی آپ اتنی تیز رفتار سے واک کرتی ہیں ماشاءاللہ آپ کا Stamina تو ہم سے بھی اچھا ہے اور دیکھیں تو اس ہلکے لیمن کلر میں وائٹ دوپٹے کے ساتھ اللہ، کتنی پیاری لگ رہی ہیں، یہ اونچی پونی ٹیل، چاندنی میں بھیگی بالکل چاندنی جیسی، بالکل سولہ سال کی لڑکی کا گمان ہو رہا تھا، میں آپ کے پیچھے تھی میں نے تو پہچانا ہی نہیں۔''

فرزانہ ہانپتی کانپتی بھاگتی ہوئی ٹریک پر مجھ سے آملی اور حسب معمول تیز تیز بول رہی تھی اور میری تعریف میں اچھی خاصی مبالغہ آرائی سے کام لے رہی تھی، میرا چہرہ پل بھر کو شرم سے سرخ ہوا لیکن تو یہ ہے کہ اپنی تعریف کسے اچھی نہیں لگتی اور دو بچوں کی ماں کو ادھیڑ عمری میں اگر سولہ سالہ لڑکی سے تشبیہ دی جائے تو کس کافر کو بری لگے گی، گو کہ مجھے یہ بھی پتہ تھا کہ وہ اچھی خاصی مبالغہ آرائی سے کام لے رہی تھی اور یہ کہ وہ ہمیشہ سے مجھے پسند کرتی آئی تھی اور موقع ملنے پر میری کھل کر تعریف کرنے میں کبھی بخل سے کام نہیں لیتی تھی اور اکثر مجھے شرمسار کرتی تھی اور ان لوگوں کو بھی جو بے شک آپ کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوں مگر تعریف کرنے میں بخیل ہوں، کبھی میر خوش لباسی پر کبھی لب و لہجے پر کبھی میری جلد و فگر پر غرض اسے میری تعریف کا کوئی نہ کوئی موقع درکار ہوتا۔

تیس بتیس کے قریب فرزانہ پکا سا رنگ چھوٹی سی آنکھیں بھدے نقوش تنگ پیشانی، بھدا فربہ بدن،، تیز بات دار کراری آواز، کافی صاف گو منہ پھٹ کچھ حد تک غصیلی و بدتمیز فرزانہ آج سے تقریباً سات برس پیشتر پارک یا پھر شاید قریبی مسجد کے کسی اجتماع میں میری اس سے ملاقات ہوئی تھی اور پہلی ملاقات میں اس نے مجھے کہا تھا۔

''سنبل باجی کتنا پیارا نام ہے آپ کا اور آپ پر آپ کی شخصیت سے کتنا میل کھاتا ہے۔'' اتنی کھلی تعریف کے باوجود اگلی چند باتوں میں، میں نے دل میں کہا۔

''خالی بجتا ڈھول۔'' اور آنے والے دنوں نے ثابت کیا کہ میرا اندازہ اس کے بارے کیسا درست اور سچا تھا، وہ بغیر علم و جانکاری کے ہر معاملے میں اپنی رائے کے اظہار کے عادی تھی، کم علمی کبھی اپنی بات کہنے میں اس کے آڑے نہیں آئی تھی، چاہے دنیاوی ہوتا یا دینی، وہ اپنی رائے کا بڑھ چڑھ کر اظہار کرتی۔

پچھلے سات سال سے میں اسے ایسے ہی دیکھ رہی تھی جیسی وہ آج نظر آتی تھی اگر وہ مجھے نہ بتاتی تو شاید پہلی ملاقات میں ہی میں اس سے پوچھ بیٹھتی کہ تمہارے کتنے بچے ہیں مگر جب اس نے مجھے بتایا کہ وہ غیر شادی شدہ ہے تو میں نے اپنی حیرت دبالی۔

پہلی ملاقات میں ہی حالانکہ اس نے مجھے دل کھول کر سراہا تھا مگر وہ توصیف مجھ پر اس لئے اتنی اثر انداز نہیں ہوئی تھی کہ اول تو اس قسم کے جملے مجھے سننے کو ملتے رہتے ہیں، دوئم میری رائے خود اس کے بارے میں مثبت نہیں بن سکی تھی اگلی ہی ملاقات میں وہ مجھ سے پوچھ بیٹھی۔

''سنبل باجی ایک بات تو بتائیں آپ اتنی اچھی با اخلاق اتنی دیندار ہیں شوق سے عبادت کرتی ہیں تو کیا وجہ ہے کہ پردہ نہیں کرتیں؟'' میں نے حیرت سے اس کے چہرے کو دیکھا وہ ذرا سا گڑبڑائی۔

''میرا مطلب ہے کہ...... وہ دیکھیں نہ، آپ اتنی خوبصورت ہیں کہ آپ کو دیکھ کر تو اچھے خاصے بندے کا ایمان خراب ہو جائے تو، وہ آپ

کو پردہ تو کرنا چاہیے نہ۔'' پھر تناؤ کو کم کرنے کے لئے بولی۔

''دیکھیں نہ آپ کے حسن کو کسی کی نظر نہ لگے، اس لئے کہہ رہی ہوں۔'' میں نے اپنی ناگواری چھپاتے ہوئے کہا۔

''مگر میں تو پردہ کرتی ہوں مگر اتنا جتنا میرے نقطہ نظر سے ہونا چاہیے۔'' وہ دوبدو بولی۔

''تو کیا آپ چہرے کے پردے کو نہیں مانتی حالانکہ......'' میں اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔

''تم اتنا تو جانتی ہو گی کہ پردے کے بارے میں مختلف آرا ہیں مسلم فقہ میں تو کیا مجھ اپنی رائے رکھنے کا حق ہے؟'' مگر وہ اپنی دھن میں مگن بولے گئی۔

''دیکھیں نہ باجی چہرہ ہی تو فتنہ پھیلاتا ہے ساری کہانی آنکھوں کے رستے شروع ہوتی ہے۔'' اب میرا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا مگر میں نے تحمل سے ہی کہا۔

''دیکھو اپنے عقیدے کے حق میں دلیلیں تو میرے پاس بھی ہیں بہت سی ہیں کہ بات آنکھوں سے شروع ہوتی ہے تو مرد کو اسی لئے نگاہ جھکانے کا حکم ہے اور بھی بہت کچھ کہنے کو ہے مگر بات یہ ہے کہ میرا عقیدہ تمہارے لحاظ سے غلط ہی سہی مگر اپنی رائے کا حق ہے یا نہیں مجھے یا یہاں تم طالبان کا اسلام چاہتی ہو؟''

میرے لہجے کی ناگواری کو وہ پا گئی تھی اسی لئے بات کا رخ بدل گئی مگر اگلی تمام ملاقاتوں میں، میں نے یہی دیکھا کہ اس کا رویہ خدائی احکام کے بارے میں بہت جنونی تھا اور نہ صرف یہ کہ اس کے رویے میں بہت کٹرپن تھا، یہ شدت تو میں نے پہلے بھی محسوس کی تھی مگر جب تک وہ دوسروں کو تنقید کا نشانہ نہ بناتی یہ اس کا قطعی ذاتی مسئلہ تھی اور اپنی رائے رکھنے میں وہ قطعی آزاد تھی میرے نزدیک۔

رہی میں سنبل چوہدری تو مجھے خود پہ فخر تھا کہ نہ میں بائیں بازو والوں میں نہ دائیں میں، میرا رویہ بڑا متعدل بلکہ میرے رویے میں اک سیال پن تھا بہاؤ تھا اور سچائی مجھے کہیں بھی ملتی کسی بھی فرقے یا مسلک میں، میں اسے لے لیتی تھی، علوم کے رویوں پر غور کرنا میرا مزاج تھا، میں کسی بھی علم یا مذہب کو مطلق رد کرنا غیر علمی فعل گردانتی تھی اور اپنی اسی سوچ پہ خود پہ ناز کرتی تھی۔

☆☆☆

پارک میں اس دن واک کرتے ہوئے فرزانہ جب میرے پاس سے گزری تو حسب معمول اس کا بھونپو کافی بلند تھا اور جب اس کی ساتھی خاتون نے اسے بتایا کہ میرے بھائی کی شادی محرم صفر کو نکال کر ربیع الاول کو طے پا گئی ہے تو حسب معمول فرزانہ موقع محل کی نزاکت کو بھانپے بغیر با آواز بلند بولی۔

''مگر آنٹی جی میں نے تو سنا ہے محرم میں شادی کرنا بڑا ثواب ہوتا ہیں ڈاکٹر اسرار نے تو اپنے بیٹے کی......'' وہ خاتون اس کی بات پر بھڑک اٹھیں اور اچھی خاصی بحث دو مسالک کے درمیان چھڑ گئی، میں جو ان کے پیچھے چلی آ رہی تھی رہ نہ سکی اور فرزانہ کو آواز دی۔

''فرزانہ بات سنو میری۔'' وہ ذرا سا رکی چلتے چلتے۔

''جی باجی سنبل کہیے۔'' میں نے کہا۔

''چلو مذہب مسلک ہر چیز کو چھوڑو، مجھے صرف ایک بات بتاؤ؟'' وہ بولی۔

''وہ کیا؟'' میں نے کہا۔

''اگر تمہارے پڑوس میں تمہارا بھائی رہتا ہو یا چلو صرف پڑوسی ہی ہو اور وہ حالت سوگ

میں ہو، ماتم ہو ان کے گھر تو کیا تم اپنے گھر میں خوشی کر لو گی؟'' وہ سوچ میں پڑ گئی اور دھیرے سے بولی۔

''شاید نہیں۔'' میں نے پھر کہا۔

''پھر ذرا سوچنا غور کرنا کہ تعصب کی عینک اتار کر اگر ہم انسانی قدروں کا ہی احترام کر لیں تو بہت سے مسائل سے بچ جائیں۔'' وہ کچھ نادم سی محسوس ہوئی مگر جلد ہی اپنی جون میں آ گئی، وہی فرزانہ تھی اور وہی اس کی باتیں، میں نے چند قدم آگے بڑھ کر سوچا۔

''کچھ لوگوں کے اندر کا حیوان اتنا بیدار ہوتا ہے کہ پھر اسے قابو کرنے کے لئے صرف مذہب ہی کی لگام درکار ہوتی ہے اور پھر یہاں سے جو دین برآمد ہوتا ہے اس کے مزاج میں صرف تشدد ہوتا ہے۔'' مجھے دیکھ کر اس نے دور سے ہانک لگائی۔

''سنبل باجی۔'' میں نے کوفت سے سوچا۔

''اب ایک گھنٹہ برباد ہو گا۔'' بظاہر خوشدلی سے بولی۔

''کیسی ہو فرزانہ دو دن سے نظر نہیں آ رہی تھی؟ کہیں گئی ہوئی تھی؟'' وہ بولی۔

''ہاں اپنے آبائی شہر گئی ہوئی تھی خالہ کے پاس اور کچھ میرے شناختی کارڈ کا مسئلہ تھا۔'' میں نے حیرت سے دیکھا۔

''کیا مسئلہ تھا؟'' وہ بولی۔

''دراصل میرا شناختی کارڈ نہیں بنا نہ ابھی تک اور اب تو عمرے پہ جانا ہے اس لئے ضروری ہے۔'' میں اپنی حیرت چھپا نہ سکی۔

''ابھی تک تمہارا آئی ڈی کارڈ نہیں بنا؟'' وہ قدرے برا مانتے ہوئے بولی۔

''تو پھر کیا ہوا بہت لیٹ تو نہیں ہوا۔'' میں نے بات بدل کر پوچھا۔

''تو کیا تم نے اب تک کسی الیکشن میں ووٹ نہیں ڈالا۔'' وہ پھر ذرا کپے سے منہ سے بولی۔

''نہیں اس سے پہلے ایک الیکشن ہی تو مس ہوا ہے۔'' میں اس کے سفید جھوٹ پر حیران رہ گئی، پیچھے مڑ کر اس کی چھوٹی بہن کو دیکھا جو کم از کم چھبیس ستائیس برس کی ہو گی، اس سے بڑے اس کے بھائی تھے پھر فرزانہ کا نمبر تھا اور وہ مجھے کہہ رہی تھی کہ......

میں نے دل میں سوچا بظاہر صوم وصلوٰۃ کی پابند باپردہ، ہر وقت خدا رسول کی باتیں اور سفید جھوٹ، اس سفید جھوٹ نے مجھے اس کے رویوں کو کھوجنے کی راہ دکھلا دی اور میں نے غیر محسوس انداز میں لاشعوری طور پر اس کے کردار رویے اور مزاج کو جانچنا شروع کر دیا۔

میں نے محسوس کیا وہ اچھی خاصی بدمزاج، منہ پھٹ، جھگڑالو تھی، عموماً بیٹھی پارک میں کسی نہ کسی کے بخیئے ادھیڑ رہی ہوتی تھی، وہ تمام لوازم جو کہ عمر رسیدہ کنواریوں میں پائے جاتے ہیں، رشتوں کی تلاش میں سرکردہ اک عجیب چھینا جھپٹی والا رویہ۔

''تو کیا مذہب کا ظاہری چولا پہن لینے سے باطن پھر بھی کورے کا کورا رہ جاتا ہے باطن لبادہ کب اوڑھتا ہے شریعت کا؟ کیا کچھ انسانی کجیاں رویے کا جھل ہر مسلک مذہب سے ماورا ہوتا ہے؟ پھر ان کے لئے کیا الگ سے کوئی شریعت آئے گی؟'' میں نے اسے حقارت سے دیکھا اور اپنی سوچ کی ندرت سے پیار کیا کہ اصل دین تو سچ وحق کی تلاش ہی ہے اور اپنے تئیں خود کو زیادہ صحیح مسلمان تعبیر کیا۔

☆☆☆

اس واقعہ کے بعد اک کھد بدی لگ گئی مجھ کو، میں نے فرزانہ کو اردگرد لوگوں کو ان کے مسالک اور رویوں کے حساب سے جانچنا شروع کیا، مجھ پہ عقدہ کھلا کہ زیادہ تر تو بحث اسی گنتی کی تھی کہ وہ سات تھے آٹھواں کتا تھا یا وہ پانچ تھے اور چھٹا...... اس گنتی نے اندر کا دروازہ سختی سے بند کر دیا تھا اور تہہ خانے کو جاتی سیڑھیوں کی گنتی جاری تھی، تہہ خاہ ہنوز بند تھا۔

وہ آنٹی جن کے میاں سے ان دن فرزانہ بحث کر رہی تھی وہ اپنے گھر ہر ماہ گیارویں کا ختم دلواتی تھیں ساری نیاز رشتہ داروں میں تقسیم ہو جاتی بچا کچھا غریبوں میں تقسیم ہو جاتا دراصل تو یہ اک ایسی ٹی پارٹی تھی جہاں مہنگی بوتیکوں سے لائے سوٹوں کی نمائش کا اعلیٰ انتظام تھا۔

اک دن اس ٹی پارٹی میں جانے کا مجھے بھی اتفاق ہوا فرزانہ نے اسے حرام کہہ کر معذرت کر لی تھی میرے ساتھ اس قسم کا کوئی مسئلہ نہیں تھا اس لئے میں نے بصد احترام ان کی دعوت قبول کر لی، اس محفل میں آنٹی کی دیورانی سے بھی ملاقات ہوئی میں نے انہیں پہچان لیا یہ میرے بچوں کی سکول ٹیچر تھیں، بڑا اچھا لگا بڑی باتیں ہوئیں کہ اچانک اک لمبی داڑھی ماتھے پہ میراب سر پہ دستار ٹخنوں سے اونچی شلوار اک مولوی صاحب نے دروازے پر کھڑے ہو کر کرخت آواز سے پکارا۔

''سائرہ او سائرہ اب اٹھ بھی جاؤ، بہت گپ شپ ہو گئی۔'' سائرہ میرے پاس سے ہڑبڑا کر اٹھی اور معذرت سے بولی۔

''میں چلتی ہوں میرے میاں صاحب آواز دے رہے ہیں۔'' اور باہر مولوی صاحب بغیر لحاظ بڑبڑا رہے تھے۔

''ایک تو ان عورتوں کی لن ترانیاں، گپیں ہانکنے کے لئے وقت ہی وقت اور گھر میں ہر وقت تجربے اور نوکری کا رعب، ارے ہزار بار کہا ہے مجھے تمہاری چند ہزار کی نوکری کی ضرورت نہیں گھر بیٹھو مگر نہیں......''

مولانا صاحب کا بے عزتی و عزت نفس کو کچلتا واعظ جاری تھا، سائرہ کی رنگت خفت سے سفید پڑی تھی اور میں مولانا کے سفید جھوٹ و ڈھٹائی پر ششدر تھی کیونکہ سائرہ کو اچھی طرح بطور ٹیچر جانتی تھی اس نے ایک دو دفعہ ''مدرڈے'' پہ تذکرہ کیا تھا مجھ سے کہ میاں کے کاروبار میں نقصان کے باعث اس نے جاب شروع کی تھی اور یہ کہ ابھی اسے ٹیچنگ کا اتنا تجربہ نہیں، بے تکلف سی طبیعت تھی اس کی بہت سی باتیں بتا گئی یا پھر یہ کہ وہ کسی واقعی ایسے کندھے کی تلاش میں تھی جہاں پر کچھ گھٹن نکالی جا سکے۔''

بہرحال مولانا کے کردار کا تضاد کھل کر میرے سامنے آ گیا، اک اور مکمل جامع شرعی لبادہ مگر باطن کی سیاہی و برہنگی ہنوز ویسی ہی تھی، جیسی لات و منات کے مکہ والوں کی تھی۔

☆☆☆

بڑے طویل عرصے کے بعد چھوٹی بہن مجھ سے ملنے آئی تھی تمام دن مہمانداری میں گزر گیا، شام کے وقت فراغت نصیب ہوئی تو بچے شور مچانے لگے۔

''چلیں مما، خالہ چلیں نہ پارک میں چلتے ہیں وہاں چل کر آنکھ مچولی کھیلیں گے۔''

بہن بھی اصرار کرنے لگی تو میں اپنے اور اس کے بچوں کے ساتھ پارک چلی گئی کچھ دیر میں اور بہن باتیں کرتے رہے اور پھر میں ٹریک پر چہل قدمی کرنے لگی اور بہن بچوں کے ساتھ مصروف ہو گئی، فرزانہ نے حسب معمول مجھے دیکھ کر دور سے ہانک لگائی اور بلند آواز سے کہا۔

''السلام علیکم سنبل باجی، کہاں غائب تھیں،

WWW.PAKSOCIETY.COM

دو تین دن آئیں نہیں؟" میں نے کہا۔

"کچھ طبیعت اچھی نہیں تھی اور کچھ مہمان آئے ہوئے تھے۔" وہ فوراً تجسس سے بولی۔

"کون آیا تھا؟" میں نے بیزاری سے کہا۔

"بہن آئی ہوئی ہے لاہور سے۔" وہ فوراً بولی۔

"تو ساتھ لے آتیں نہ۔" میں نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

"ہاں آئی ہوئی ہے ادھر پارک میں ہی ہے بچوں کے ساتھ۔" وہ بچوں کے سے اشتیاق سے بولی۔

"مجھے ملوائیں نہ آپ سے بہت تذکرہ سنا ہے میں نے۔" میں بادل نخواستہ اس کو بہن سے ملانے چل پڑی، فرزانہ، میری بہن کنول سے بڑی گرمجوشی سے ملی۔

"سنبل باجی سے آپ کا بہت ذکر سنا ہے، آپ بھی بہت پیاری ہیں۔" وہ باتیں کرنے لگیں تو بچے اِدھر اُدھر ہو گئے اور میں ان کے پیچھے بھاگی، ان کو یکجا کر کے میں واپس تیزی سے ان دونوں کی طرف آئی دھڑکا تھا کہ فرزانہ کچھ الٹی سیدھی نہ ہانک دے میں نے فوراً آواز دی۔

"کنول چلو آؤ گھر چلیں۔" بہن نے بھی میرے گریز کو سمجھا اور فوراً اسے چھوڑ کر چل پڑی۔

گھر واپس ہوئے تو بہت سے کام منتظر تھے، ڈنر پھر چائے کا دور بچوں کے فیڈر وغیرہ سے ہم بہنیں فارغ ہوئیں تو پھر باتوں و یادوں کی اک لڑی پروئی جانے لگی، وہ ہنس کر بولی۔

"بچے اکٹھے ہیں تو کتنے خوش ہیں پارک میں بھی، انہوں نے خوب مزا کیا۔" مجھے یاد آیا تو اس سے پوچھا۔

"فرزانہ سے بڑی گپ شپ، ہو رہی تھی کیا کہہ رہی تھی وہ تمہیں؟" وہ سادگی سے بولی۔

"کچھ نہیں آپ کی تعریفیں کر رہی تھی اچھا......" میں تمسخرانہ لہجے میں بولی جس میں حقارت ہی حقارت تھی۔

"ہاں تعریفیں تو وہ کرتی ہے میری کہ باجی آپ بہت پیاری ہیں مگر میرے اسلام کو ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھتی ہے خود کو بڑا پکا سچا مسلمان سمجھتی ہے اور باقی سب کو غلط، کئی بار میں اسے دلیل سے غلط ثابت کر چکی ہوں مگر......"

بہن نے کچھ کہنا چاہا مگر میرے اندر کے ابال نے اسے بولنے کی اجازت نہیں دی۔

"بنتی بہت ہے بڑے لبادے اوڑھتی ہے مگر اچھی خاصی بدتمیز جھوٹی ہے فضول گوئی کی عادت، ہر کسی کی دل شکنی، چغلی اور ہر وقت ضرورت رشتہ کا اشتہار ہاتھ میں لئے بعض اوقات اچھی مضحکہ خیز ہو جاتی ہے اور دعویٰ دیکھو پکی مسلمانی کا، کیا فائدہ ایسے لبادے اوڑھ لینے سے جن کا اثر باطن پہ نہ جائے، انسانی قدروں کا احترام کر لیا جائے کیفیت کو سمجھ کر اندر کی کمی پوری کی جا سکتی ہے، اے انسان تو پہلے انسانیت کے تخت پر تو بیٹھ پھر مسلماں ہو کر مسالک کی فکر کرنا۔"

میرا لیکچر ختم ہوا تو بہن نے بڑی عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔

"نہیں باجی وہ تو بے چاری کچھ بھی نہیں کہہ رہی تھی آپ کی تو اتنی تعریف کر رہی تھی کہ کیا بتاؤں، سنبل باجی بہت اچھی عادات و اخلاق کی مالک ہیں ماشاءاللہ عالم ہیں پوری اور سارا وقت بس آپ کی تعریفیں ہی کرتی رہی۔"

مجھے یک لخت چپ لگ گئی، مجھے لگا کہ میرا چاک گریباں مجھے صدا دے رہا تھا کہ ادھر بھی جھانک لوں۔

☆☆☆

"ہائے عشال! کیا پروگرام ہے بھئی اس بار تمہارا ویلنٹائن پر؟" اسد نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"تھنگ اسپیشل! وہ ہی ہمیشہ کی طرح سب فرینڈز کے ساتھ مل کر آؤٹنگ کا پروگرام بنائیں گے، سب کو فلاورز اور چاکلیٹس دیں گے، گفٹس ایکسچینج کریں گے، شام کو لبرٹی چوک میں سب مل کر انجوائے کریں گے اور پھر......"

"اوہ! کم آن عشال تم کیا ابھی تک ٹین ایجرز کی طرح بچگانہ حرکتیں کرتی رہتی ہو ہر ایونٹ پر، بھئی اب ہم Adults ہیں اور ہماری ایکٹیوٹیز بھی میچور ہو جانی چاہیں، اب او کے۔" ماہی نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی اسے اس بری طرح ٹوکا کہ وہ صرف اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"او کے تو مس ماہی، چلیں آپ بتا دیں پھر کہ آپ کیا کریں گی چودہ فروری کو؟" اسد کو اس کا عشال کو ٹوکنا اور وہ بھی اس برے طریقے سے بالکل بھی نہ بھایا تو اس نے کافی چبھتے انداز میں اس سے پوچھا۔

"ویل میں تم لوگوں کو یہ ہی بتانے آئی تھی، بلکہ میں تم سب کو انوائیٹ کرنے آئی ہوں، برو (بھائی) نے اس ویلنٹائن کو بھی نیو ایر نائٹ کی طرح یادگار اور شاندار بنانے کے لئے ایک زبردست پارٹی ارینج کی ہے پورے شہر کی کریم ہو گی وہاں، انجوائے منٹ کے سب پروگرامز رکھے گئے ہیں اور میں چاہتی ہوں کہ میرے تمام فرینڈز اور کلاس فیلوز اس "اسپیشل لو ایونٹ" کو بہت اسپیشل انداز سے منائیں، اسی لئے گائیز، میں آپ سب کو 14th-feb کی ویلنٹائن پارٹی کا انویٹیشن دے رہی ہوں۔" ماہی نے اک ادا سے اپنے ایمو لیسر کٹ بالوں کو جھٹکے سے ایک شانے سے دوسرے شانے پر منتقل کرتے ہوئے کہا۔

"واؤ ڈیٹس گریٹ، تمہارے برو (بھائی) کی ارینج کی گئی پارٹیز تو واقعی اوسم ہوتی ہیں یار اور پھر جو بالی ووڈ اور لالی ووڈ کے اسپیشل مہمان وہ بلواتے ہیں، آمیزنگ یار، میں تو ضرور آؤں گا اور کوئی آئے یا نہ آئے۔"

"ارے یہ تو کچھ بھی نہیں لالی ووڈ اور بالی ووڈ تھیسم تو پرانی ہو چکی، اس بار تو برو (بھائی) کے اسپیشل ترک گیسٹ، بہلول، بھیسر، نہال کے علاوہ اور بھی کئی آرٹسٹ آ رہے ہیں اور آئم شیور کہ تم لوگ بھی ضرور ان سے ملنا چاہو گے، اسی لئے میں نے برو سے اسپیشل انویٹیشنز لئے ہیں تم لوگوں کے لئے، اینڈ بلیو می، تم لوگوں کو بہت مزہ آئے گا۔" فہد کے چٹخارہ لے کر کہنے پر ماہی نے مسکراتے ہوئے اپنے شولڈر بیگ سے ان سب کے دعوت نامے نکالتے ان کے شوق کو مزید ہوا دینے والے انداز میں کہا۔

"واہ ماہی! تم تو تم، تمہاری تو ساری فیملی ہی گریٹ ہے، بھائی مجھے تو بہت شوق تھا نہال وغیرہ سے ملنے کا، کیا تم میری ملاقات کروا دو گی ان سے اور ایک فوٹو شوٹ بھی پلیز۔" اس کے ہاتھ سے اپنا کارڈ لیتے فہد نے کانوں تک باچھیں چیرتے ہوئے کہا تو اسد کوفت سے سر جھٹک کر رہ گیا۔

"وائے ناٹ یار! تم لوگ میرے بیسٹ فرینڈز ہو اور تم لوگوں کی خوشی کے لئے تو میں کچھ بھی کر سکتی ہوں، ڈونٹ وری، سب کا فوٹو سیشن بھی ہو گا اور آٹو گراف بھی جتنے چاہو لے لینا، کوئی مسئلہ نہیں اور اسد تم میرے اسپیشل گیسٹ ہو، تمہیں میں اسپیشلی انوائٹ کر رہی ہوں۔" بہت خوبصورت کھلتے گلاب کی شکل کا کارڈ اسے پکڑاتے اس کی آنکھوں میں دیکھتی وہ بڑی دلکشی

اور لگاوٹ سے بولی تو عشال الجھن بھری نگاہوں سے دونوں کو دیکھنے لگی، جبکہ اسد نے مسکراتے ہوئے کارڈ ماہی کے ہاتھ سے لیا اور بغیر دیکھے اپنے ہاتھ میں پکڑی کتاب میں رکھ لیا۔

☆☆☆

اسد کا تعلق بیورو کریٹس خاندان سے تھا، اس کے ننھیال میں پولیٹیشنز اور پارلیمنٹیرینز کی بھرمار تھی تو ددھیال بیورو کریٹس سے بھرا پڑا تھا، وہ تو خود شہر کی کریم تھے، ان کے لئے ایسی پارٹیز بہت معمولی بات تھیں، عشال اس کی بیسٹ فرینڈ تھی اور فرسٹ کزن بھی۔

بچپن سے وہ دونوں ساتھ تھے، اپنی فطری سادگی اور معصومیت کی وجہ سے وہ اسد کو شروع سے ہی بہت پسند تھی، خود اس کا مزاج بھی بڑا قلندرانہ سا تھا، اس طرح کی ایلیٹ کلاس پارٹیز میں وہ شامل ضرور ہوتا تھا مگر ان کے رنگ میں کبھی رنگا نہ جا سکا تھا، جانے کیوں نہ تو وہ صحیح طرح سے بیورو کریٹ بن پایا تھا اور نہ ہی سیاستدان اور اس کا یہ ہی مزاج اور ایسی درویشانہ عادات بقول ڈیڈ اور بھائی اسے اپنی کلاس میں مس فٹ کرتی تھیں، مگر اسے کوئی فرق نہ پڑتا تھا، وہ کھلم کھلا سب سے کہتا۔

"میں جیسا ہوں، ویسا ہی رہوں گا، آپ مجھ پر اپنی انرجی اور ٹائم ویسٹ کرنے کی بجائے کوئی نیا پروجیکٹ شروع کر لیں اور اپنا قیمتی وقت اسے بڑھانے پر لگائیں، ڈبل پرافٹ کمائیں گے۔" اور کچھ یہی حال عشال کا بھی تھا۔

وہ اپنے بھائیوں اور بہن سے چھوٹی تھی اور چھوٹے بچے عموماً یا تو بہت زیادہ لاڈلے ہوتے ہیں یا پھر بری طرح نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں عشال بھی دوسری قسم میں شمار ہوتی تھی، نہ تو مام کے پاس وقت تھا اس کے لئے اور نہ ہی ڈیڈ کو فرصت، لہٰذا وہ بھی اپنے بہن بھائیوں کی طرح غیر ملکی پڑھی لکھی تمام ایٹی کیٹس سے مالا مال گورنسز کے زیر سایہ پل بڑھ گئی، خودرو پودے کی طرح، مگر عشال کا نصیب اچھا تھا شاید کہ اس کے حصے میں جو گورنس آئی تھیں، وہ اس کے لئے گورنس سے زیادہ اس کی ماں بن گئیں تھیں، وہ خود اپنی اولاد کی جدائی کا دکھ ایک طویل عرصے سے سہہ رہی تھیں، عشال کی معصومیت اور بھولا پن ان کے من کو ایسا بھایا کہ انہوں نے اپنی ساری ممتا، ساری محبت سارا خلوص اس پر لٹا دیا اور اسد چونکہ اس کا بیسٹ فرینڈ تھا لہٰذا آنٹی کی محبتوں اور شفقتوں میں وہ بھی برابر کا شریک تھا۔

☆☆☆

ماہی کے ڈیڈ کے فارم ہاؤس میں چلنے والی پارٹی اپنے عروج پر تھی، ویلنٹائن کے حوالے سے سرخ اور سفید رنگ ہی ہر طرف چھایا ہوا تھا، سرخ رنگ، خون کا رنگ، جنون کا رنگ، جذبات بلکہ بھڑکتے جذبات کا رنگ۔

اور اس محفل میں یہ دونوں رنگ ہی نمایاں تھے، اتنے نمایاں کہ باقی سارے رنگ جیسے ماند سے پڑ گئے تھے، ان کے تمام دوست اور پارٹی میں موجود تمام مہمان ترکی سے آئے حسین و جمیل فنکاروں اور بھارت سے آئے شوخ و شنگ اور بولڈ ترین مہمانوں کی میزبانی میں بچھے بچھے جا رہے تھے، میوزک، ڈانس، مووی، فوٹو شوٹ، آٹو گراف، باتیں، ملاقاتیں سب گڈمڈ ہوا جا رہا تھا، اس پر ام الخبائث کا کھلم کھلا استعمال، محفل کا رنگ اور ماحول ہی کم تھا حواس گم کرنے کے لئے کہ ان برانڈڈ مشروبات نے بھی چار چاند لگا دیئے تھے۔

"عشال تم کیا بوڑھوں کی طرح کونے میں گھسی بیٹھی ہو بور لڑکی آؤ ڈانس فلور پر چلو ہمارے

ساتھ، ڈانس کرتے ہیں یار، ایسا موقع اور ایسا ماحول روز روز تھوڑی ملتا ہے، کم آن، آجاؤ تم بھی ہمارا سارا گروپ وہیں پر ہے۔" فہد اور ردا بانہوں میں بانہیں ڈالے جھومتے ناچتے اسے بھی اپنے ساتھ اس بے ہنگم اچھل کود کا حصہ بنانے چلے آئے تھے، مگر وہ تو پہلے ہی اس ماحول سے اکتائی بیٹھی تھی، اس لئے نرمی سے انہیں ٹال کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی، اس سے چند ٹیبلو چھوڑ کر اسد بظاہر اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا باتیں کر رہا تھا مگر اس کا پورا دھیان عشال کی طرف بھی تھا۔

"عشال چلیں اب، آئی ہوپ تم نے ماہی کی پارٹی خوب انجوائے کر لی ہو گی، آخر کو تمہیں شوق بھی تو بہت تھا ناں یہاں آنے کا۔" اسد نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے اسے چھیڑا تو وہ غصے سے اسے دیکھنے لگی، کیونکہ وہ تو سرے سے اس پارٹی میں آنا ہی نہیں چاہتی تھی، یہ تو ماہی کا اسد کو اسپیشلی انوائٹ کرنا اور پھر خود اسد کا اسے بضد اصرار اپنے ساتھ آنے پر مجبور کرنا تھا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی آ گئی تھی اور اب بھیسٹر نہال، بہلول سمیت انڈین اور پاکستانی ماڈل گرلز، ایکٹرز، جھکوں سے بری طرح بیزار ہو چکی تھی۔

"اسد! میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ ماہی کے "اسپیشل چیف گیسٹ" بن کر اس دھما کے دار پارٹی میں آؤ اور ساتھ میں مجھے بھی گھسیٹ لاؤ، سخت عاجز آ گئی ہوں میں اس شور و غل اور ہنگامے سے، میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ جا کہاں رہے ہیں کیسے لوگ ہیں ہم، حکمران ہمارے کشکول نہیں چھوڑتے اور ہم...... ہم یہ اللے تللے، اب تم خود دیکھو ناں، اس ایک پارٹی پر اس غریب عوام کا خون چوس کر بنایا بے شمار پیسہ کس بے دردی سے لٹا رہے ہیں ماہی کے برو (بھائی) اور پیرنٹس، یہ جو پڑوسی ممالک سے انہوں نے فنکار بلوائے ہیں اپنی پارٹی کی شان بڑھانے کے لئے، جن کے ایک دیدار ایک آٹو گراف کے لئے ہماری ینگ جنریشن پاگل ہوئی جا رہی ہے، تو بھلا کتنا خرچہ آیا ہو گا اس لگژری پر، ذرا حساب لگا کر دیکھو، میرے تو ہوش اڑ گئے، یقیناً تمہارے بھی قائم نہیں رہیں گے۔" اس کے ساتھ ساتھ قدم سے قدم ملا کر باہر کی طرف چلتی عشال کی زبان بھی قینچی کی طرح چل رہی تھی اور اس کی باتیں سن کر اسد کے روشن چہرے پر مسکراہٹ گہری ہوتی جا رہی تھی۔

"ہیلو گائیز! ابھی تو پارٹی عروج پر آئی ہے، ابھی تم لوگ کہاں چل دیئے، ابھی تو آگے بھی بہت سے سرپرائزز آرگنائز کر رکھے ہیں برو کے اور ویسے بھی ابھی تم لوگوں کو آئے زیادہ دیر تو نہیں ہوئی۔" جانے کہاں سے ایک دم ماہی ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی اور انہیں یوں ایک دوسرے میں گم پارٹی چھوڑ کر باہر جاتے دیکھ کر سلگ ہی تو گئی تھی۔

یونیورسٹی کے پہلے دن سے ہی وہ اسد کو اپنی طرف مائل کرنے کی سر توڑ کوششوں میں مصروف رہی تھی، کیونکہ وہ تھا ہی اس قابل کہ واقعی اس کی چاہ کی جا سکے، مگر اس کا رویہ ماہی سمیت سب ہی کلاس فیلوز کے ساتھ ایک جیسا ہی تھا، اگر اس کی خاص توجہ کا مرکز کوئی تھا تو وہ صرف عشال ہی تھی اور اس کی وجہ سے ہی وہ ماہی سمیت کئی لڑکیوں کی آنکھوں میں خار کی طرح کھٹکتی تھی۔

"سوری ماہی! اٹس ٹو لیٹ ناؤ، ہم نے تمہارا دعوت نامہ قبول کیا اور اپنے پروگرام کو چھوڑ کر تمہیں اور تمہاری پارٹی کو ٹائم دیا اور سچ کہا تھا تم نے، یہاں انجوائے منٹ اور انٹرٹیمنٹ کے لئے واقعی بہت کچھ ہے ہم تمہیں اور تمہارے برو (بھائی) کو بہت بہت Thanx کہتے ہیں، اتنی

اچھی پارٹی آرگنائز کرنے کے لئے اور خاص طور سے ہمیں بہلول نہال اور بھیسٹر سے ملوانے کے لئے، تم ان تک ہماری بیسٹ وشز پہنچا دینا اور اب ہمیں اجازت دو، ہمیں ابھی اور بھی کہیں جانا ہے۔" اسد نے اپنے مخصوص انداز میں نرمی سے کہتے ہوئے عشال کا ہاتھ پکڑ کر باہر کی راہ لی اور ماہی صرف انہیں دیکھتی ہی رہ گئی۔

☆☆☆

اس وقت خاصی رات بیت چکی تھی، پچھلی رات بارہ بجے سے شروع ہونے والا ویلنٹائن کا بخار اب قدرے ہلکا پڑنا شروع ہو چکا تھا، اس بدیسی تہوار نے پچھلے کچھ سالوں سے ان تمام دیسیوں کو اس طرح اپنی گرفت میں لیا تھا کہ اس بھیڑ چال میں سب ہی شامل ہو چکے تھے۔

"محبت کا عالمی دن" "محبتوں کا پیغام بر" "ویلنٹائن ڈے" محبت کی آڑ میں بے راہ روی پھیلاتا، معصوم اور کچے ذہنوں کو آلودہ کرتا اپنے اختتام کی طرف گامزن تھا اور ایسے میں شہر بھر میں جابجا ان محبتوں کے پھیلاوے، کچرے کی صورت ڈھیر ہوئے پڑے تھے، مرجھائے، مسلے اور کچلے ہوئے پھول، سرخ سنہری، روپہلے دلوں والے پھٹے روندے ہوئے گفٹ پیپرز، چاکلیٹ اور کینڈیز کے ریپرز اور پھٹے ہوئے غبارے، ہر سڑک، ہر گلی کے کسی نہ کسی کونے پر ان ہی خرافات کا ڈھیر لگا تھا، عشال اسد کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھی معروف شاہراؤں کا حال دیکھ دیکھ کر اظہار افسوس کر رہی تھی جبکہ اسد حسب معمول اس کی باتیں مسکراتا ہوا سن رہا تھا۔

"اوہو بھئی، اب کہاں لے جا رہے ہو مجھے؟ اگر ماہی کی پارٹی جیسی ہی کسی اور پارٹی کا پروگرام ہے تو پلیز مجھے گھر ڈراپ کر دو، میرا اس وقت کہیں بھی جانے کا موڈ نہیں ہے۔" اسے کسی انجان راستے کی طرف مڑتے دیکھ کر وہ تقریباً چلا ہی اٹھی تھی، مگر اس نے جواب دیئے بغیر سامنے بنی بڑی سی عمارت کے گیٹ پر گاڑی روک کر ہارن دیا، گیٹ فوراً ہی کھل گیا اور اسد مڑے سے اندر لے گیا گاڑی۔

"اسد بھیا! آپ آ گئے، ہم شام سے آپ کا انتظار کر رہے تھے آپ نے اتنی دیر کر دی، اب تو ہم مایوس ہو گئے تھے کہ اب آپ نہیں آئیں گے۔" ان کے اندر آتے ہی جانے کہاں سے بہت سارے بچے نکل کر اس سے لپٹ گئے تھے۔

"ارے بھئی! میں نے وعدہ کیا تھا کہ میں ضرور آؤں گا تو بھلا کیسے نہیں آتا، دیکھ لو تم لوگوں کی خاطر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلا آیا ناں تمہارا بھیا اور دیکھو میرے ساتھ تمہاری عشال آپی بھی آئی ہیں تم لوگوں سے ملنے۔" اس نے بڑے پیار سے ان بچوں کو ساتھ لگاتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی عشال کا تعارف بھی کروا دیا۔

"عشال! یہ SOS ولیج کے معصوم بچے ہیں، میں اپنا ہر اہم دن اور ہر تہوار ان کے اور ان جیسے بہت سے پیارے پیارے دوستوں کے

ساتھ منانا پسند کرتا ہوں، تمہاری طرح یہ سب بھی میرے بچے اور اچھے دوست ہیں۔" اسد نے ایک چھوٹے سے بچے کو گود میں اٹھا کر پیار کرتے ہوئے کہا تو عشال بھی بچوں کو پیار کرنے لگی، جلد ہی وہ بچوں سے گھل مل گئی، پھر ان دونوں نے ڈھیروں تحائف ان بچوں میں بانٹے جو اسد کے فون کرنے پر اس کے آدمی لے کر آئے تھے۔

"اسد! تم نے مجھے آج تک بتایا ہی نہیں کہ تمہارے اتنے چھوٹے چھوٹے اور پیارے پیارے دوست بھی ہیں، اگر تم مجھے پہلے ان سے ملوا دیتے تو میں بھی بہت پہلے ان سے دوستی کر لیتی۔"

"صرف چھوٹے چھوٹے ہی نہیں، میرے تو بہت بڑے بڑے دوست بھی ہیں، ملو گی ان سے بھی، اچھا لگے گا تمہیں ان سے بھی مل کر۔" واپسی پر عشال نے بڑی معصومیت سے اس سے کہا تو اس نے مسکراتے ہوئے ایک اور عمارت کے سامنے گاڑی روک دی تو وہ بھی مسکرا دی۔

☆☆☆

"اسد! آج میں بہت خوش ہوں، یقین کرو میرا آج کا ویلنٹائن صحیح معنوں میں ویلنٹائن ہوا ہے تم ٹھیک کہتے ہو، محبتوں کے اصل حق دار یہ لوگ ہی ہیں جن میں تم صبح سے محبتیں بانٹتے پھر رہے ہو، باقی تو جو سب کچھ محبت کے نام پر ہو رہا ہے بس اللہ ہی معاف کرے، یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے، کیا میڈیا، کیا عوام اور کیا خواص سب کے سب بنا سوچے سمجھے ایک ہی سمت سرپٹ دوڑے چلے جا رہے ہیں، یہ سوچے بغیر کہ اس اندھی دوڑ سے ہماری اقدار و روایات کا کس قدر شدید نقصان ہو رہا ہے، تمہیں یاد ہے ناں، ہمیں آنی نے ہمیشہ انسان اور انسانیت سے پیار کرنا ہی سکھایا، یہ آنی کی تربیت اور اللہ کا خاص کرم ہی تو ہے کہ ہم پاور، پوزیشن اور اسٹیٹس کانشس ہونے کی بجائے اللہ اور اس کی مخلوق سے محبت کرتے ہیں، یہ ہی اللہ کا حکم بھی ہے اور یہ ہی اس کے نبی کا فرمان بھی، لیکن ایک افسوس ہے اسد، کہ کاش ہماری آج کی نوجوان نسل کو بھی اس بات کا احساس ہو جائے، وہ جن محبتوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر مارے مارے پھر رہے ہیں، جھوٹی سچی محبتوں کی چاہ میں اِدھر اُدھر مارے مارے پھرنے کی بجائے اگر ان جیسے مستحق لوگوں میں اپنی اس انمول دولت کا کچھ حصہ بانٹ دیں تو معاشرے کے آدھے دکھ تو ویسے ہی کم ہو جائیں۔" اس کے ساتھ کئی اولڈ ہاؤسز، یتیم خانے اور اسپتالوں میں بے شمار محبتوں کے ساتھ بہت سے تحائف بانٹنے کے بعد رات گئے وہ گھر لوٹ رہی تھی، اس کے چہرے پر سچی خوشی کی چمک اور ایسا سکون پھیلا ہوا تھا جس نے اس کی معصومیت اور خوبصورتی میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو عشال، مگر مجھے پورا یقین ہے کہ جلد ہی وہ دن ضرور آئے گا جب ہم ان بدیسی تہواروں اور مانگے تانگے کی خوشیوں سے خوش ہونا چھوڑ دیں گے، آج ہم نے دیا جلایا ہے ان شاء اللہ جلد ہی ایسے بہت سے دیئے جلیں گے اور دیکھنا تم ہمارے جیسے نوجوان ہی ان ہائی فائی پارٹیز کو چھوڑ کر ہماری ہی طرح ان دیئوں سے دیئے جلاتے جائیں گے، ان شاء اللہ۔"

"ان شاء اللہ۔" عشال نے بھی اس کی طرف دیکھتے ہوئے دل کی گہرائیوں اور جذب سے کہا اور اس بات کا تو انہیں بھی پورا یقین تھا کہ اپنے حصے کے دیئے تو وہ جلا ہی رہے تھے اب ان سے اور کتنے دیئے جلیں گے، یہ تو آنے والا وقت ہی جانتا تھا۔

☆☆☆

شگفتہ شاہ

منی کہانیوں کا سلسلہ

اعتراض

"صفیہ!"

"جی!"

"تمہاری بڑی بہن کے رشتے والی بات کہاں تک پہنچی؟"

"وہ تو ختم ہو چکی۔"

"ارے! کیوں بھئی؟"

"لڑکے کو اعتراض؟ وہ تو اتنی پیاری اور سلیقہ مند لڑکی ہے، جیسی صورت پیاری ہے اس کی ویسی سیرت بھی۔"

"ریحانہ! تم تو جانتی ہو کہ پہلے ہمارے خاندان میں لڑکیوں کو زیادہ پڑھانے کا رواج نہ تھا اس لئے ادی کو پانچ درجے پڑھانے کے بعد گھر بٹھا دیا گیا اور اسے سلائی، کڑھائی، کھانا پکانا اور گھر داری کے دوسرے ہنر سکھائے گئے جبکہ لڑکا اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اس لئے اس کا خیال تھا کہ وہ ان کے ساتھ چل نہیں پائے گی، اسے تو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ماڈرن لڑکی چاہیے جو اس کے شانہ بشانہ چل سکے اور جاب کر کے گھر کی ذمہ داریوں میں بھی ہاتھ بٹا سکے۔"

"اوہ، آئی سی!"

☆

"صفیہ!"

"جی!"

"تمہارے رشتے کی جو بات چیت چل رہی تھی اس کا کیا ہوا؟"

"وہ معاملہ تو ختم ہو گیا۔"

"ارے...... کیوں؟"

"لڑکے کو اعتراض تھا۔"

"اسے کیوں اعتراض تھا؟ تم تو اتنی پڑھی لکھی اور سلجھی ہوئی لڑکی ہو۔"

"ریحانہ! تم تو جانتی ہو کہ ادی نوری کا رشتہ کم تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے مناسب جگہ ہو نہ پایا تو اس بات سے سبق سیکھتے ہوئے میرے والدین نے مجھے اعلیٰ تعلیم دلوائی اور میں خاندان کی پہلی لڑکی ہوں جو یونیورسٹی لیول تک گئی، یہی بات لڑکے کے لئے قابل اعتراض ہے کیونکہ اس کا خیال ہے کہ جو لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ پڑھتی ہیں وہ آزاد خیال ہوتی ہیں اور ان کا کردار ٹھیک نہیں ہوتا اور وہ بے حد چالاک اور تیز ہوتی ہیں، وہ شوہروں پر اپنی تعلیم کا رعب ڈالتی ہیں اور اگر جاب کرتی ہیں تو پھر گھر کی ذمے داریاں ٹھیک سے سنبھال نہیں پاتی اس لئے وہ کسی سادہ کم پڑھی لکھی اور گھریلو لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

"او آئی سی۔"

بوجھ

اپنی ساتویں اور آخری بہن کے فرض سے فارغ ہو کر اس نے تھکے ہوئے لہجے میں بھائی سے کہا۔

"بھائی صاحب! سات بہنوں کی شادیوں کے فرائض سے ابھی فارغ ہی ہوئے ہیں کہ بیٹیاں جوان ہو گئیں۔"

اسٹینڈرڈ

"سلمیٰ! تمہارے رشتے کی بات چیت

کہاں تک پہنچی؟"
"وہ تو ختم ہوگئی۔"
"کیوں؟"
"ہم نے انکار کر دیا کیونکہ وہ ہمارے اسٹینڈرڈ کے نہیں تھے۔"

☆

"سلمیٰ! تمہارے رشتے کی بات دوسری جگہ چلی تھی وہ معاملہ کہاں تک پہنچا؟"
"وہ بات تو ختم ہو چکی۔"
"کیوں بھئی؟"
"انہوں نے انکار کر دیا کیونکہ ہم انکے اسٹینڈرڈ کے جو نہیں تھے۔"

شناخت

قیمتی عروسی جوڑے میں ملبوس اور سونے کے بھاری زیورات سے لدی پھندی حسین دلہن نے نکاح نامے پر سائن کر کے کسی کی "مسز" بننے سے پہلے اپنی قابلیت کے اعلیٰ سرٹیفکیٹ، میڈلز اور اعزازات اپنے میکے کے اسٹور روم کی پرانی الماری میں بند کر کے انہیں لاک کر دیا تھا کیونکہ کچھ ہی دیر بعد اسے ایک سطحی ذہنیت رکھنے والے شخص کی دلہن بن کر اور ایک روایت پسند گھرانے کی بہو بن کر جانا تھا، جہاں عورت کی ذاتی شناخت کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

پناہ

وہ ایک سیدھی سادی معصوم لڑکی تھی جو گھر کے اندر اس پر ہونے والے ظلم اور پابندیوں کی وجہ سے پناہ حاصل کرنے کے لئے ایک مرد کے ساتھ گھر سے نکل پڑی تھی، جس نے اپنے خوبصورت مستقبل کے سپنے دکھائے تھے، وہ اس کے ساتھ ایک گاؤں سے نکل کر بڑے شہر کی وسعتوں میں گم ہوگئی تھی، وقت گزرنے کے ساتھ جب وہ آبلہ پا ہوگئی اور لوگوں کی منافقتوں اور ان کے اندر کی بدصورتیوں کو پرکھ چکی تو اسے احساس ہوا کہ۔
"معاشرے میں......"
پھر......وہ قدم قدم پر ملنے والے بھیڑیوں سے زخم زخم ہوتی رہی یہاں تک کہ اسے اب موت میں ہی پناہ نظر آئی اور پھر اس کے جیون کے کتاب میں جو دریا کی بے رحم موجود میں بہتی اس کے لاش کے ساتھ ملی اس کی زندگی کا آخری باب دوسرے دن کی اخباروں میں یوں لکھا گیا۔
"کل ایک نا معلوم عورت نے دریا میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی، اس کی شناخت نہ ہونے کے سبب اسے لاوارث قرار دے کر دفن کر دیا گیا۔"

قلم اور قلمدان

ایک بڑے اور اہم عہدے کا خوبصورت اور نفیس "قلم دان" سنبھالنے سے پہلے وہ بہت مقبول قلم کار تھا جس نے عوامی مسائل پر بہت شاہکار تخلیق کیے تھے اور ناانصافیوں اور کرپشن کے خلاف آواز اٹھائی تھی، آج وہ خود اس کرپٹ سسٹم کا بہت اہم مہرہ بن چکا تھا، مگر اب تو اسے اتنی فرصت بھی نہیں کہ یہ دیکھ سکے کہ جس قلم سے اس نے کئی شاہکار تخلیق کیے تھے اس کی نوک کو کب سے زنگ لگ چکا تھا۔

انتقام

برسوں کی خدمت، وفا اور پیار کے بدلے جب اس کے شوہر نے اس سے بیوفائی کی نہ اس نے بھی مرد ساتھی آفس ورکرز اور "رانگ نمبرز" سے آفر ہونے والی دوستیوں کو قبول کر لیا ہے۔

☆☆☆

کتاب نگر سے

سیمیں کرن

میڈ اسائیں

مصنفہ: تہمینہ درانی

مذکورہ کتاب کے آغاز میں کتاب اور مصنفہ کا تعارف کروایا گیا ہے، تہمینہ درانی غلام مصطفیٰ کھر کے ساتویں بیوی تھیں، ان دونوں کی عمروں میں بیس برس کا فرق تھا، نہ صرف یہ کہ ان دونوں کے درمیان عمروں کا فرق بھی تھا بلکہ سماجی تفاوت کی بھی اک خلیج حائل تھی، کھر جاگیردارانہ نظام کا اک نمائندہ اور تہمینہ درانی کی پرورش جدید خطوط میں بڑے نظم و ضبط کے ساتھ ہوئی، 1975ء میں ان دونوں کی شادی ہوئی، یہ ان دونوں کی ہی پہلی شادی نہ تھی، تہمینہ کی بھی دوسری شادی تھی۔

لیکن یہ شادی تہمینہ درانی کے لئے کانٹوں بھری سیج ثابت ہوئی، تہمینہ کے لئے یہ وقت بے سروسامانی، اذیت، ذلت عدم تحفظ و جسمانی و ذہنی تشدد کا تھا، اس کے چار بچوں کی ماں بن کر اس کے جیل چلے جانے کے بعد تہمینہ کی تمام تر وفاداریوں کے باوجود غلام مصطفیٰ کھر باطنی طور پر بالکل تبدیل نہ ہوا حتیٰ کہ اس کا معاشقہ اس کی چھوٹی بہن عدیلہ سے بھی چلتا رہا اور جب سب کشتیاں جل گئیں تو اور تہمینہ کھر سے بالکل مایوس ہوگئیں تو علیحدگی و طلاق کا مطالبہ کر دیا۔

یہ دراصل تہمینہ درانی کی داستان حیات ہے اور بقول تہمینہ۔
"مصطفیٰ کھر یہ وہ خود سوانح ہے جو تم کبھی نہ لکھو گے۔"

1990ء میں تہمینہ نے بڑی جرأت مندی سے اس داستان کو رقم کرنا شروع کیا اور بڑی بے باکی و دلیری سے اپنے جاگیردار شوہر کے مظالم کی داستان کو رقم کیا۔

تہمینہ اک حساس ذہن اور آرٹسٹک ذہن کی حامل خاتون، کانچ سے نازک احساس کی مالک اک جاگیردار کے ظلم و ستم کے ہاتھوں کرچی کرچی ہوئی تو خود کو سمیٹنے کی کوشش کچھ اس بے باکی سے کی اور سوانح حیات کو تحریر کرنے کا وہ مقام تعین کر دیا جہاں تک آنے میں پرواز کرنے میں بہت سے پروں کے جل جانے کا خدشہ ہے۔

تہمینہ درانی نے انتہائی بے باکی سے اپنی نجی حیات کے گوشوں کو بڑی مہارت سے بے نقاب کیا ہے اور بغیر کسی رشتے کو چاہے وہ بہن ہو یا ان کی والدہ، کسی کو کوئی رعایت دیے بغیر اس طرح تحریر کیا ہے کہ معاشرتی برائیوں اور مختلف پہلوؤں کا احاطہ ہو گیا، سیاست دانوں، سازشوں اور تاریخی واقعات کا ذکر بھی بھرپور انداز میں ہے، یہ صرف تہمینہ اور مصطفیٰ کھر کی داستان حیات و سوانح عمری ہی نہیں بلکہ اک مخصوص عہد کی سچی تصویر بھی ہے، ظلم و جبر کے خلاف اک بھرپور و موثر آواز ہے۔

اس کتاب کا سرورق تہمینہ درانی جو خود اک آرٹسٹ بھی ہیں کی اک تصویر "سایوں" سے لیا گیا ہے۔

اس کا پیش لفظ محترمہ عاصمہ جہانگیر صاحبہ نے لکھا ہے جو کہ طلاق کے مقدمہ میں ان کی وکیل تھیں۔

اس کتاب کے انتساب کو اہل وطن کے نام کرتے ہوئے تہمینہ درانی لکھتی ہیں۔

"یہ کتاب جس مواد پر مبنی ہے وہ صرف ایک کتب خانے میں دستیاب ہے میں نے بار بار اس کتب خانے سے رجوع کیا ہے میری مراد ہے ذہن سے ہے، میں اس کتاب کا انتساب کرتی ہوں اہل وطن کے نام جنہوں نے بار بار اپنے رہنماؤں پر بھروسہ کیا، ان کی حمایت کی اور اس کے بدلے میں ان رہنماؤں نے ان بھوکے، ستم رسیدہ اور ناشاد و نامراد جوم در جوم عوام سے اپنے ذاتی مفادات کو آگے بڑھانے کا کام لیا۔"

یہ داستان نہ صرف تہمینہ درانی کی نجی زندگی جو انہوں نے مصطفیٰ کھر کے ساتھ گزاری بلکہ شادی سے پہلے جو زندگی انہوں نے والدین کے گھر گزاری اس کی بھی ہے ان کی پہلی شادی جو فقط اٹھارہ سال کی عمر میں انہیں سے ہوئی اور کس طرح وہ مصطفیٰ کھر کے عشق میں مبتلا ہوئیں یہ تمام تذکرہ بڑی ایماندارانہ بے باکی اور اک کہنہ مشق ادیبہ کی طرح سامنے رکھا ہے نہ صرف یہ کہ نجی زندگی بلکہ اس وقت کے سیاسی واقعات و جزیات کو بڑے موثر انداز میں داستان حیات کا حصہ بنایا ہے کچھ اس طرح کہ حرف آخر تک دلچسپی برقرار رہتی ہے اور قاری دم بخود خود کو پڑھنے پر مجبور پاتا ہے۔

کتاب کے کل نو ابواب ہیں قائد، کھر بمقابلہ کھر جہنم کے نشیب و فراز، سیاسی حیوان، ماتا بھی ہے ستم ایجاد کیا مینڈا سائیں، دیکھا جو تیر کھا کے، اندھیرے دور ہوتے ہیں بے وفائی۔

اس کتاب میں تہمینہ درانی کی مصطفیٰ کھر اپنے چاروں بچوں کے ساتھ اور دیگر اہل خانہ کی یادگار تصویریں بھی شامل ہیں۔

کتاب کا آغاز مستقبل سے ماضی کی طرف ہے، اس جدوجہد کا آغاز جو تہمینہ کھر اور مصطفیٰ کھر نے کی، جیل کی صعوبتوں و آزمائشوں کا ذکر ہے اور تہمینہ کھر کی آورش پسندی نکھر کر سامنے آتی ہے اور بطور لکھاری یہ تہمینہ کھر کی بہت بڑی کامیابی ہے کہ وہ اپنے اور قاری کے درمیاں کوئی پردہ نہ رکھتے ہوئے اپنی تمام تر لغزشوں گناہوں کا اعتراف کر لینے کے بعد بھی اپنے لئے ہمدردانہ گوشہ تخلیق کر لینے میں انتہائی کامیاب رہی ہیں۔

"اسے معلوم تھا کہ میں آورش پسند ہوں، اس نے اپنی توجہ میری آورش پسندی کو جلا دینے پر مرکوز کر دی، میرے اپنے بھی عزائم تھے لیکن وہ کسی نہ کسی طرح مصطفیٰ کی ذات اور اس کی سیاست میں اس طرح پیچ در پیچ پیوست تھے کہ انہیں الگ نہ کیا جا سکتا تھا مجھے اس کی شہرت کا سہارا درکار تھا میں عملی سیاست میں صرف اس کی بیوی کی حیثیت سے قدم رکھ سکتی تھی میرے لئے اور کوئی راستہ نہ تھا میں زندگی میں کوئی ایسا کام کر جانا چاہتی تھی جو وقیع اور قابل قدر ہو۔"

"جہنم کے نشیب و فراز اس باب میں تہمینہ درانی اپنی ازدواجی ناچاقیوں، اس بہیمانہ تشدد سے پردہ اٹھاتی ہیں جس کا انہیں سامنا کرنا پڑا اور اپنے سابقہ شوہر کے اپنی بہن سے ناجائز تعلقات کو بھی بلا کم وکاست انہوں نے بیان کر دیا ہے۔"

"ماضی میں میری ٹھکائی میری پہلی شادی کے بہانے کی جاتی تھی وہ مجھ پر الزام لگاتا کہ میں اپنے سابقہ شوہر کے عشق میں مبتلا ہوں۔"

یہ کسی عام جاہل مرد کی بات نہیں ہو رہی، اک ایسے شخص کی بات ہے جو گورنر پنجاب کے عہدے پر متمکن رہا۔

اور اپنی بہن عدیلہ اور مصطفیٰ کے تعلق پر وہ لکھتی ہیں۔

عدیلہ اور مصطفیٰ میں کوئی بات بڑی عجیب سی تھی، یوں لگتا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا مجھے محسوس ہو رہا تھا دو خبیث ذہن ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہو گئے ہیں، زیادہ عمر والا ذہن جسے اک نوخیز شکار ہاتھ آ گیا تھا۔

ان حالات میں مسلسل تشدد، بہن سے ناجائز تعلقات نے تہمینہ کو توڑ پھوڑ دیا اور انہوں نے خودکشی کی کوشش کی لیکن وہ بچ گئیں غلام مصطفیٰ کھر سے وہ چار بار علیحدہ ہوئیں مگر پھر اپنی شادی کو بچانے اور قائم رکھنے کو موقع دینے کو واپس ہو گئیں مگر آخر کار یہ شادی اپنے انجام کو پہنچی۔

لیکن اس داستان کے دوران تہمینہ درانی اپنی تمام تر لغزشوں انسانی کوتاہیوں کے امکانات کے ساتھ اک مضبوط اور طاقتور عورت کے طور پر ابھرتی ہیں اک آورش پسند انسان جس کے عزائم ہیں اپنی سوچ ہے اور اس کے باوجود وہ اپنی شادی کو بچانے کے لئے اک مرد کے بہیمانہ تشدد و جبر کے آگے ڈٹ جاتی ہے اور ہر مشکل میں اس کے شانہ بہ شانہ کھڑی ہے، سیاست سے نابلد ہوتے ہوئے اس بات پر شرمندہ بھی نظر آتی ہے کہ وہ اس کو چھوڑ دینے کے بعد عوام کا سامنا کیسے کرے گی۔

"ایک ایسے مرد کے ساتھ پاکستان واپس جاتے ہوئے مجھے خجالت محسوس ہونے لگی، جسے میں اخباروں میں "راسپوٹین" کے نام سے یاد کر چکی تھی میں اس پریس کا سامنا کیسے کروں گی جس نے ہمارے ازدواجی لڑائی جھگڑے کو رقت آمیزی اور جذباتیت سے چڑھا ہوا ڈرامہ بنا دیا تھا، مصطفیٰ مسکرایا "شرمندہ مجھے ہونا چاہیے، تمہیں نہیں، تم مجھے چھوڑ کر چلی گئی تھیں، میں نے تمہیں واپس آنے پر مجبور کیا، تمہیں اپنی پوزیشن کی صراحت کرنے کی ضرورت نہیں، تم نے وہی کیا جو درست تھا عوام بھیڑ بکریوں کی طرح ہیں ان کو ہر وہ شخص ہانک سکتا ہے جسے راستے کا علم ہو، میری سمجھ میں آنے لگا کہ سیاستدان کی کھال موٹی ہی ہونی چاہیے، وہ اپنے پر کیچڑ اچھالے جانے کا عادی ہوتا ہے۔"

"مینڈا سائیں۔" مصطفیٰ کھر سے شادی کے بعد کیسے اس کے زیر نگین اور نفسیاتی طور پر اس سے دب جانے کی داستان ہے مارشل لاء، بھٹو سے مصطفیٰ کے تعلقات اس کی سیاسی زندگی کا احاطہ بھی کیا گیا ہے۔

"دیکھا جو تیر کھا کے۔" باب میں مصطفیٰ کھر کے قبیلے کھرل اور اس کی اک شاخ کھر کا پس منظر بیان کیا گیا ہے، اسی طرح "ماتا بھی ہے ستم ایجاد کیا" اک ایسا باب ہے جہاں انہوں نے اپنی والدہ کے خاندان اور والد کے خاندان کے پس منظر کو بیان کیا ہے اپنی والدہ سے اپنے تر تلخ تعلقات کو بڑی سچائی و دلی کیفیات سے سامنے رکھا ہے۔

پوری خود سوانح میں تہمینہ درانی نہ صرف اک مضبوط طاقتور عورت کے طور پر نکھر کر سامنے آتی ہیں بلکہ اک منجھی ہوئی ادیبہ کے طور پر بھی خود کو منواتی ہیں جو اس بات پر قادر ہے کہ اپنی دلی کیفیات و روداد کو اک پر اثر اور متاثر کن انداز میں پیش کر سکے، بلاشبہ یہ اک منفرد سوانح عمری و داستان حیات ہے اور سچائی و بے باکی اس کا وہ وصف ہے جس کی داد قاری کو دینی پڑتی ہے۔

☆☆☆

حاصل مطالعہ

تحریم محمود

حدیث نبوی ﷺ

ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا۔
''اللہ تعالیٰ کا خیال رکھ وہ تیری حفاظت کرے گا، جب تجھ کو مانگنا ہو تو اللہ تعالیٰ سے مانگ اور یقین کرلے کہ اگر تمام گروہ اس بات پر متفق ہو جائیں کہ تجھ کو کسی بات کا نفع پہنچا دیں ہر گز تم کو نفع نہیں پہنچا سکتے، بجز ایسی چیز کے جو اللہ نے تیرے لئے لکھ دی ہے، اگر وہ سب اس پر متفق ہو جائیں کہ تجھ کو کسی بات سے ضرر پہنچا دیں تو تجھ کو ہرگز ضرر نہیں پہنچا سکتے بجز ایسی چیز کے جو اللہ نے تیرے لئے لکھ دی ہے۔'' (ترمذی شریف)

سعدیہ جبار، ملتان

کام کی باتیں

- O زندگی میں وہ راہیں اپناؤ جہاں سے کچھ حاصل کرسکو۔
- O بیل کی طرح سہارا مت ڈھونڈو بلکہ درخت کی طرح سہارا بنو۔
- O دوست ہزار بھی کم ہیں دشمن ایک بھی زیادہ ہے۔
- O اگر روٹی سے عقل حاصل ہوتی تو دنیا کے بے وقوف بھوکے مر جاتے۔
- O چھوٹے چھوٹے اخراجات کا خیال رکھو کیونکہ معمولی سوراخ پورے جہاز کو ڈبو دیتا ہے۔
- O اس خوشی سے دور رہو جو کل غم بن کر دکھ دے۔
- O محبت کرنا اور محبت کو کھو دینا محبت نہ کرنے سے بہتر ہے۔
- O عقلمند کہتا ہے میں کچھ نہیں جانتا مگر بے وقوف کہتا ہے میں سب کچھ جانتا ہوں۔
- O کسی کو اتنا بھی نہ چاہو کہ بھلانا چاہو تو بھلا نہ سکو۔
- O جو اپنے محسن کا ناشکرا ہے وہ اپنے اللہ کا ناشکرا ہے۔

آنسہ ممتاز، رحیم یار خان

طلبا کی نفسیات

☆ ایسے طلباء جو لیکچر کے دوران پین کو عموماً بند رکھتے ہیں وہ عام طور پر مغرور ہوتے ہیں مگر تنہائی پسند ہوتے ہیں۔
☆ ایسے طلباء جو لیکچر کے دوران پین کو کھولتے اور بند کرتے رہتے ہیں وہ عموماً نالائق ہوتے ہیں مگر گھریلو مسائل بڑی خوبصورتی سے حل کر لیتے ہیں۔
☆ ایسے طلباء جو لیکچر کے دوران پین کھول کر رکھتے ہیں مگر لکھتے کم ہیں وہ عموماً ذہین ہوتے ہیں مگر وہ دوسروں کو اچھا مشورہ نہیں دیتے۔
☆ ایسے طلباء جو لیکچر کے دوران پین کی نب جان بوجھ کر دوسروں کو چبھوتے ہیں وہ عموماً حاضر جواب ہوتے ہیں مگر انہیں زندگی میں کامیابی بڑی دیر بعد ملتی ہے۔
☆ ایسے طلباء جو لیکچر کے دوران پین کو خواہ مخواہ استعمال کرتے رہتے ہیں اور الٹی سیدھی لکیریں کھینچتے رہے ہیں، وہ عموماً حاضر جواب ہوتے ہیں مگر ان کی پڑھائی میں دلچسپی کم ہوتی ہے۔
☆ ایسے طلباء جو لیکچر کے دوران پین کو بار بار منہ میں رکھتے ہیں وہ عموماً ہوشیار ہوتے ہیں مگر کسی کی چیز کو حفاظت سے نہیں رکھتے۔
☆ ایسے طلباء جو لیکچر کے دوران پین کا ڈھکنا دوسرے ہاتھ میں رکھتے ہیں وہ عموماً لیکچر کو سمجھ لیتے ہیں، مگر ان کے جذبات سرد ہوتے ہیں۔
☆ ایسے طلباء جو کسی مسئلے کو حل کرتے وقت پین کو بار بار کتاب پر مارتے ہیں وہ ریاضی میں کمزور ہوتے ہیں مگر بہترین وکیل ثابت ہو سکتے ہیں۔
☆ ایسے طلباء جو لیکچر کے دوران صرف خاص خاص باتیں نوٹ کرتے ہیں وہ عموماً امتحان میں اچھے نمبر حاصل کر سکتے ہیں مگر وہ کسی کے صحیح دوست نہیں ہوتے۔
☆ ایسے طلباء جو لیکچر کے دوران پنسل کو دانتوں میں دباتے رہتے ہیں وہ عموماً آرٹ میں ماہر ہوتے ہیں مگر وہ جذباتی حوالے سے بڑے حساس ہوتے ہیں۔

فریال امین، ٹوبہ ٹیک سنگھ

قابل غور

۱۔ گر جانا بزدلی کی بات نہیں بلکہ گر کر نہ اٹھنا بزدلی ہے۔
۲۔ کسی شہنشاہ کے تاج سے زیادہ قیمتی موتیوں سے زیادہ چمکدار اور چاندنی رات سے زیادہ پرکشش کوئی چیز ہے تو وہ 'وفا' ہے۔
۳۔ شاعر وہ سپیرا ہے جس کی پٹاری میں سانپوں کی بجائے انسانوں کے دل بند ہوتے ہیں۔

نازیہ کمال، حیدر آباد

بڑی باتیں

- O سخاوت بہشت کا ایک درخت ہے جس کی شاخیں زمین پر جھکی ہوئی ہیں، جس نے اس کی شاخ کو تھام لیا وہ اسے جنت میں لے جائے گی۔ (حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)
- O تعجب ہے اس شخص پر جو خدا تعالیٰ کو جانتا ہے اور پھر غیروں کا ذکر کرتا ہے اور ان پر بھروسہ بھی کرتا ہے۔ (حضرت عثمان غنیؓ)
- O زبان کو شکوہ سے روک، خوشی کی زندگی عطا کی جائے گی۔ (حضرت ابوبکر صدیقؓ)
- O جو شخص اپنی قدر آپ نہیں کرتا اس کی قدر کوئی دوسرا نہیں کرتا۔ (حضرت علیؓ)
- O سب سے زیادہ عقلمند شخص وہ ہے جو اپنی بات کو اچھی طرح ثابت کر سکے۔ (حضرت عمر فاروقؓ)

مریم رباب، خانیوال

سوچنے کی باتیں

☆ سورج کی طرح اپنی شخصیت بناؤ جو ہمیشہ روشنی بکھیرتا ہے۔
☆ اپنا زخم اس کو مت دکھاؤ جس کے پاس مرہم نہ ہو۔
☆ ہمت ایک ایسا ہتھیار ہے جو بزدل کو بھی بہادر بنا دیتا ہے۔
☆ بوڑھے آدمی کا مشورہ جوان کی قوت بازو سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔
☆ جو نام دل کی ڈائری پر نقش ہوا سے کاغذوں کی ڈائری پر تحریر کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔
☆ کسی کا دل نہ دکھاؤ ہو سکتا ہے اس کے آنسو

تمہارے لئے سزا بن جائیں۔

☆ زندگی خدا کی نعمت ہے اسے دوسروں کے وقف کردو۔

☆ ایسا پھول مت بن جو خوش نما ہو مگر اس میں خوشبو نہ ہو۔

ام خدیجہ، شاہدرہ لاہور

بے چارہ سماج

اگر اسی طرح ہر بات میں غریب سماج کو قصووار ٹھہرایا گیا تو وہ دن دور نہیں جب کسی کو بخار چڑھے گا تو وہ منہ بسور کر کہے گا کہ یہ سماج کا قصور ہے کوئی کمزور ہوا تو کہے گا کہ یہ سماج کی برائی ہے اور اگر کوئی بہت موٹا ہو گیا تو بھی سماج کو ہی کوسا جائے، نالائق طالب علم امتحان میں فیل ہونے کی وجہ سماج کی کھوکھلی بنیادوں کو قرار دیں گے، یہاں تک کہ گالیاں بھی یوں دی جائیں۔

خدا کرے تجھ پر سماج کا ظلم ٹوٹے، یا اللہ اسے سماج کے پنجے میں کر، یہ ماں تمانے چاہا تو سماج سر پر چڑھ کر بولے گا اور دعائیں بھی اس قسم کی ہوں گی، پیسہ دیتا جا بابا، خدا تجھے سماج سے بچائے، یا میرے اللہ مجھے سماج کی ظالم ہوا سے بچائیو، وغیرہ۔

ثناء حیدر، سرگودھا

اللہ کی رسی

سورۃ آل عمران کی آیت 103 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

''اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہو اور فرقوں میں نہ بٹ جاؤ۔''

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو نصیحت فرمائی ہے کہ اس رسی کو مضبوطی سے تھام لو جو اللہ نے قرآن حکیم اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صورت میں عطا فرمائی ہے، اس رسی کو مضبوطی سے تھامنے کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان انفرادی اور اجتماعی سطح پر خدا کے وحدہ لاشریک ہونے پہ دل کی پوری صداقت سے ایمان لائیں اور اس ایمان پر راسخ رہیں غیر اللہ کو وہ مال و دولت ہو کہ اقتدار اہل وعیال کی محبت ہو کہ جابر حکومت کا خوف، خود پر غالب نہ آنے دیں ہر چیز ان کے ایمان باللہ ک تابع رہے گی، وہ اللہ ہی کی عبادت کریں گے صرف اس کی امداد و استعانت پر بھروسہ کریں گے راہ حق میں ہر سختی، ہر آزمائش کو صبر اور استقامت سے برداشت کریں گے سابقہ امتوں کی طرح فردعات میں الجھ کر فرقوں میں بٹ کر نہیں رہ جائیں گے۔

درثمن، میاں چنوں

اقوال زریں

- O محبت جب وفا میں ڈھلتی ہے تو امر ہو جاتی ہے۔
- O خاموشی سے وقار میں اضافہ ہوتا ہے۔
- O خوش رہنا چاہتے ہو تو دوسروں کو خوش رکھو۔
- O محبت وہ سلطنت ہے جہاں کوئی حکمران نہیں ہوتا۔
- O مقصد کے بغیر زندگی ایسی ڈولتی کشتی ہے جسے اپنے ساحل کا پتہ نہ ہو۔
- O جھوٹا سب سے پہلے اپنے آپ کو نقصان پہنچاتا ہے۔
- O غصے میں ایسی بات نہ کرو جس سے بعد میں ندامت ہو۔
- O دنیا میں ہر شخص اچھے آدمی کی تلاش میں رہتا ہے لیکن خود اچھا آدمی نہ بنتا۔

آسیہ وحید، لاہور

☆☆☆

بیاض

تسنیم طاہر

فائزہ قاسم ---- سکھر

اگر ہوں پھول پردیسی تو مت چھو بیوفا ہوں گے
وطن کے ہوں اگر کانٹے تو بھر لے اپنے دامن میں

....

تیز بارش کا مزہ لوٹنے والوں پہ نہ جا
وہ تیری خستہ مکانی کو سمجھتے کب ہیں

....

وقت کے سامنے تصویر بنے بیٹھے ہیں
آئینہ گردش دوراں کو دکھانے والے

نعیم امین ---- کراچی

اب میں یہ کہہ سکتا ہوں
ہجر کے صدمے سہہ سکتا ہوں
تو بچھڑا تو میں نے جانا
میں تنہا خوش رہ سکتا ہوں

....

احباب کو رہی میری عیوب کی جستجو
میں پرخلوص ان کے ہنر تولتا رہا

....

چاہ کر تم کو ہر خوشی گنوا دی ہم نے
زندگی تم کو سمجھا تو زندگی لٹا دی ہم نے
خواب تیرا سجایا پلکوں میں جب
پتلیوں سے آنکھ کی روشنی گنوا دی ہم نے

ہما رائے ---- کراچی

لمحہ موجود کے اندر بھی لمحہ امکان رہتا ہے
مجھے اکثر خود سے بھی بڑھ کر اس کا دھیان ہے
جو سرشاریاں عطا کرتا ہے ذہنوں کو
میرے پاس آ کر وہ کیوں بے جان رہتا ہے

....

یاد آتا ہے اس سے متعارف ہونا
خوشبو کا ہوا سے تعارف ہونا
دکھ کے آنسو کیوں بہتے ہیں غزل
ارماں تھا دل کا محبت سے واقف ہونا

....

ویران ہے تیرے بغیر یہ گھر
آ جاؤ کہ زندگی ہے مختصر
لوٹ کے پھر کب آیا ہے انجم
وقت گیا ہے جو اک بار گزر

نبیہ آصف ---- قصور

تو جو مل جائے تو زندگی سنور جائے
نہ کرو ستم اتنے کہ کوئی مر جائے

....

تیرا ملنا اک خواب جیسا
اور جینا ہے عذاب جیسا

....

اس طرف سمندر کے خوفناک تیور ہیں
اور ہم گھروندوں میں سیپیاں سجاتے ہیں
وحشتوں کے صحرا میں کون یہ بتائے گا
کس کو یاد رکھتے ہیں کس کو بھول جاتے ہیں

ثمینہ رفیق ---- کورنگی کراچی

میں نے پوچھا زندگی کیا ہے
ہنس پڑے پھول رو پڑی شبنم

....

نہ دنیا سے نہ دولت سے نہ گھر آباد کرنے سے
تسلی دل کو ہوتی ہے خدا کو یاد کرنے سے

....

یہ سوچ میں ڈوبا ہوا ٹھہرا ہوا انداز
جیسے کبھی آپس میں تعلق نہ رہا ہو
مجھ سے تو نہیں رکتے یہ بہتے ہوئے آنسو
کیا بات ہے کیا ہو گیا کیوں مجھ سے خفا ہو
رمشہ ظفر ---- بہاولپور
تنہائی سے باتیں کرتے شام گزاری ہے
لمحہ لمحہ جیتے مرتے شام گزاری ہے
وہ جانے کس گھر آنگن کی رونق بن بیٹھا
جس کی یاد میں آہیں بھرتے شام گزاری ہے

....

اے میری جان برسات کے موسم میں روٹھا نہ کر
موسم اور بھی بہت ہیں روٹھنے کے لئے

....

اگر آؤ تو عجب سا پتہ ہے میرا
دل سے لینا اجازت اور چل پڑنا
عاصمہ سرور ---- وہاڑی
تنہائی کا زہر پینا ہے مجھے
تجھے ماں یاد کرکے رونا ہے مجھے
دنیا کی باتیں جو میرے دل پہ گہرا زخم ہیں
کہ اس زخم کو بھی پینا ہے تجھے

....

تو جو رہتا نہ تھا کہ اک پل بھی میرے بغیر
مدت ہو گئی ہے اب تجھ سے ملے ہوئے

....

آنکھوں میں آنسو مٹتے نہیں
لوگ زخم لگانے سے باز آتے ہیں
رابعہ ارشد ---- فیصل آباد
ہوا مت مری گلیوں میں آیا کرو
آؤ تو اس کی خوشبو بھی لایا کرو
مت اتنا شور کر مت اتنا تیز چلو
اسے تو محسوس ہونے دیا کرو

....

تیرے حسن کے شعلوں سے جلتی ہوں مدتوں
پھر بھی تیرے قرب کی تلاش میں رہتی ہوں

....

اوراق پریشاں کے شعلوں کے دہکنے سے
چڑیوں کے چہکنے سے پھولوں کے مہکنے سے
ذہن کے گلستاں میں یہ بات ہے آئی
شاید کہ بادصبا نے لی ہے انگڑائی
مسرت مصباح ---- لاڑکانہ
تمام عمر تعلق سے منحرف رہے
تمام عمر اسی کو مگر بچایا ہے
ہر اعتراض پہ گہری خاموشی
یہی تو وصف مرے ہمسفر بچایا ہے

....

لہجہ تھکا تھکا ترا پلکیں جھکی جھکی تری
اتنی خفیف سی خوشی کتنی صعوبتوں کے بعد
خوشبو چراغ شاعری یہ ہدیہ تیرے نام ہوں
تو بھی نہ آسکا اتنی نشانیوں کے بعد

....

ہم تو یوں اپنی زندگی سے ملے
اجنبی جیسے اجنبی سے ملے
ہر وفا ایک جرم ہو گویا
دوست کچھ ایسی بے رخی سے ملے
سعدیہ جبار ---- ملتان
تمام شب جہاں جلتا ہے ایک اداس دیا
ہوا کی راہ میں اک ایسا گھر بھی آتا ہے
وفا کی کون سی منزل پہ اس نے چھوڑا تھا
کہ وہ تو یاد ہمیں بھول کر بھی آتا ہے

....

تم نے پھر بھی زمانے کے چلن سیکھ لئے
میں تو کچھ بھی نہیں کر پایا محبت کے سوا

☆☆☆

حنا کی محفل

عین غین

راحیلہ سمیع ---- ملتان
س: حنا کی محفل میں شرکت چاہتی ہوں پلیز اجازت دیجیے؟
ج: اجازت ہے۔
س: حصول رزق حلال عبادت ہے آج کل کیسے سمجھایا جائے؟
ج: نوٹ دے کر۔
س: جو لوگ حسد کی بھٹی میں جلتے ہیں ان کا علاج بتائیں؟
ج: ان کو جلنے دو جب جل جائیں گے تو خود ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔
س: آپ کے پاس سے جلنے کی بو کیوں آرہی ہے سچ سچ بتاؤ کون ہے وہ؟
ج: تم ہی تو ہو جو جل رہی ہو۔
س: میں نے سنا ہے آپ کی عینک بہت موٹی ہے، ویسے کیا نمبر ہے؟
ج: کیا تم اپنی عینک گھر بھول آئی ہو جو میری لگانا چاہتی ہو۔

آنسہ ساجد ---- رحیم یار خان
س: سکون بھی خواب ہوا نیند بھی ہے کم کم، کیوں؟
ج: بدہضمی کی وجہ سے ہے۔
س: کیوں جان پر بن آئی ہے بچھڑا ہے اگر وہ؟
ج: اس سے بھی پوچھو کہ تم سے بچھڑ کر وہ کتنا خوش ہے۔
س: شعر کا جواب دیں۔
سب کو فکر ہے مگر اپنے آپ کی
مجھے فکر ہے تو صرف اس کی
ج: جواب حاضر ہے۔
یہ راہ محبت کہتے ہیں پر خار بھی ہے اور دور بھی ہے
لیکن دل مضطرب کیا کیجیے مشتاق بھی ہے مجبور ہے

فریال امین ---- ٹوبہ ٹیک سنگھ
س: کبھی لمحے صدیوں جتنے ہو جاتے ہیں
کبھی سال یہ لمحوں میں کٹ جاتے ہیں
ج: دنیا بے ثبات میں ہر شے ہے تیز گام
ہر دن کے ساتھ رات ہے اور صبح کی ہے شام
س: کبھی آنسوؤں سے ہتھیلیوں پر پڑے چھالے
کبھی کوئی بے بسی سے انہیں چھپالے
ج: نازک خیال اب بھی ہیں موجود اے فلک
خالی رہا نہیں کبھی دریا حباب سے

نازیہ کمال ---- جھنگ
س: انسانیت کی معراج کیا ہے؟
ج: انسان بننا۔
س: دنیا کا مشکل مرحلہ کیا ہے؟
ج: آدمی کا انسان بننا۔
س: تدبیر اور تعبیر میں کتنا فاصلہ ہے؟
ج: بہت تھوڑا۔

مریم رباب ---- خانیوال
س: یہ چلتے چلتے رک کیوں گئے؟
ج: تم نے آواز جو دی۔
س: سوچ لو پھر نہ کہنا؟
ج: سوچ بھی لیا کچھ نہیں کہوں گا۔

ام خدیجہ ---- شاہدرہ لاہور
س: یہ دنیا والے بڑے بے وفا ہوتے ہیں؟

ج: مجھے تو دنیا والوں میں شامل نہ کرو۔
س: کل میں نے اسے ڈانٹا تو بہانے بنانے لگا؟
ج: چھوٹا بھائی ہے پیار سے بھی بات کریں اس بیچارے سے۔
س: میں جب بھی اس کی طرف دیکھتی ہوں تو نظریں جھکا لیتا ہے؟
ج: ابتدائے عشق جو ہے نا۔
س: میرا دل زور زور سے ہنسنے کو چاہتا ہے؟
ج: بڑی خطرناک علامت ہے۔

شاہ حیدر ---- سرگودھا

س: چپ چاپ میری بات سنو؟
ج: شکر ہے کچھ سنانے کا خیال تو آیا۔
س: یہ روگ مجھے اس جوگی سے لگا ہے؟
ج: سانپ کی چال نہ چلیں کیونکہ جوگی پڑ لیتے ہیں۔
س: یہ زندگی افسانہ ہے ناول ہے یا ناولٹ؟
ج: سچی کہانی بھی ہو سکتی ہے۔

درثمن ---- میاں چنوں

س: میں کیا کروں مجھ سے کچھ نہیں ہو پاتا؟
ج: سارا دن لیٹے رہنا یہی حال ہوگا۔
س: میں نے سنا ہے کہ وہ؟
ج: کیا سنا ہے اس کے بارے میں۔
س: میں بھی کتنی نادان ہوں؟
ج: چلو اب پتہ چل گیا۔

آسیہ وحید ---- لاہور

س: لوگ آسمان سے کیا چاہتے ہیں؟
ج: گرمیوں میں بارش اور سردیوں میں دھوپ۔
س: یہ دنیا والے محبت محبت تو کہتے ہیں لیکن محبت کرنے والوں کے دشمن ہوتے ہیں؟
ج: اسے فعل اور قول میں فرق کہتے ہیں۔
س: اب میرے پاس پوچھنے کے لئے کچھ بھی نہیں؟
ج: لیکن میرے پاس جواب دینے کو بہت کچھ ہے۔

جویریہ ناصر ---- گلبرگ لاہور

س: یہ بزرگ لوگ ہر وقت اپنے جوانی کے قصے کیوں سناتے ہیں؟
ج: اس کے سوا ان کے پاس اور ہوتا ہی کیا ہے۔
س: وہ پہلے سے آیا کچھ نہ کہا اور چلا گیا؟
ج: اس نے کسی کے آنے کی آہٹ سن لی ہوگی۔
س: میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتی ہوں کروں یا نہ کروں چلو نہیں کرتے آپ بھی کیا یاد کریں گے کسی رئیس سے پالا پڑا تھا؟
ج: اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی کوشش نہ کرو۔
س: عین غین جی تم آخر ہو کیا شے؟
ج: بس عین غین ہوں جو سمجھنا ہے سمجھ لو۔

ام ایمن ---- گوجرانوالہ

س: میں اب تک یہ سمجھ نہیں سکی کہ آپ سوالوں کے جواب کیا دیتے ہیں؟
ج: جواب سمجھنے کے لئے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔
س: چلو جی مان لیتے ہیں کہ آپ بڑے عقلمند ہیں لیکن ہم بھی کسی سے کم نہیں؟
ج: یہ میں نے کب کہا ہے آپ کسی سے کم نہیں میں تو میں ہی ہوں۔
س: سنو سنو اے دنیا والوں عین غین کی امر کہانی؟
ج: آپس کی باتیں دوسروں کو نہیں بتاتے۔

☆☆☆

میری ڈائری سے

صائمہ محمود

مسرت مصباح: کی ڈائری سے ایک نظم

"دستخط"

جب سے میرے
دل کے کورے کاغذ پر
تو نے دستخط کیے ہیں

تب سے
میں نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ
یہ میری نفرت کی ربڑ سے
مٹ جائیں، ختم ہو جائیں
لیکن میں ناکام ہو چکی

نہ یہ مٹتا ہے اور
نہ کسی اور کا نام اس پر لکھا جاتا ہے

سعدیہ جبار: کی ڈائری سے خوبصورت نظم

میں اپنی ذات
انا اور خودداری کے سپرد کیے
منزل بہ منزل چلتی جا رہی تھی
یہ سوچے بنا کہ
کبھی کبھی ذات کی حفاظت کے لئے
انا اور خودداری بھی قربان کرنا پڑتی ہے
کبھی اک لمحہ کی خوشی کی خاطر
ہزار لمحوں کی غموں کی مسافت
بھی طے کرنا پڑتی ہے

آنسہ ممتاز: کی ڈائری سے ایک غزل

تم بن لیتے ہو ریشمی خواب
دھاگے کچے بھی ہوا کرتے ہیں
کہتے ہیں ناں چند لوگ محبت کو دغا
جذبے سچے بھی ہوا کرتے ہیں
اک جھوٹ قائم نہیں دنیا ساری
لوگ سچے بھی ہوا کرتے ہیں
مانا کہ ٹوٹا کرتے ہیں وعدے پیار کے
بندھن پکے بھی ہوا کرتے ہیں
بدنام تو زمانے نے کیا انہیں آنسہ
دل والے اچھے بھی ہوا کرتے ہیں

فریال امین: کی ڈائری سے خوبصورت نظم

"مشورہ"

اپنی سب خواہشوں کا گلا گھونٹ کر
جسم و جاں کو نئی زندگی بخش دے
وقت یونہی نہ رو رو کے ناشاد کر
یوں نہ اپنی جوانی کو برباد کر
بیتے لمحوں کو ہر پل نہ اب یاد کر
خدا کی یاد سے دل کو آباد کر
مجھ سے بہتر ملے گا تجھے ہمسفر

اے میری جان جاں!
گر نہ ہوتیں مرے پاؤں میں بیڑیاں
بنا کے دلہن تجھے لاتا میں اپنے گھر
اے مری دلربا اب نہ آنسو بہا
بیتے لمحوں کو جان وفا بھول جا
بیتے لمحوں کو جان وفا بھول جا
یوں سمجھنا کہ ماضی اک خواب تھا
اک حسین خواب تھا

نازیہ کمال: کی ڈائری سے ایک نظم

تم سے اچھا تو یہ چاند ہے
جو نظر نہ آتا ہے
تم سے اچھے تو یہ ستارے ہیں

جو دل کی بات تو سنتے ہیں
تم سے اچھے تو یہ آنسو ہیں
جو سدا آنکھوں میں رہتے ہیں
تم سے اچھی تو تمہاری یاد ہے
جو بھولتی ہی نہیں
مگر پھر بھی دل کہتا ہے
کہ تمہارے جیسا کوئی بھی نہیں
اس جہاں میں تمہیں بھی نہیں

مریم رباب: کی ڈائری سے وصی شاہ کی غزل

اپنے احساس سے چھو کر مجھے صندل کر دو
میں کہ صدیوں سے ادھورا ہوں مکمل کر دو
نہ تمہیں ہوش رہے اور نہ مجھے ہوش رہے
اس قدر ٹوٹ کے چاہو مجھے پاگل کر دو
تم ہتھیلی کو مرے پیار کی مہندی سے رنگو
اپنی آنکھوں میں مرے نام کا کاجل کر دو
اس کے سائے میں مرے خواب دمک اٹھیں گے
مرے چہرے پہ مہکتا ہوا آنچل کر دو
دھوپ ہی دھوپ ہوں میں ٹوٹ کے برسو مجھ پر
اس قدر برسو میری روح میں جل تھل کر دو

اُم خدیجہ: کی ڈائری سے ایک غزل

باندھ لیں ہاتھ پہ سینے پہ سجا لیں تم کو
جی میں آتا ہے تعویذ بنا لیں تم کو
پھر تمہیں روز سنواریں بڑھتا دیکھیں
کیوں نہ آنگن میں چنبیلی سا لگا لیں تم کو
کیا عجب خواہش اٹھتی ہیں ہمارے دل میں
کر کے منا سا ہاتھوں میں اچھالیں تم کو
کبھی خوابوں کی طرح آنکھ کے پردے میں رہو
کبھی خواہش کی طرح دل میں بلا لیں تم کو
اس قدر ٹوٹ کے تم پہ ہمیں پیار آتا ہے
اپنی بانہوں میں بھرے مار ہی ڈالیں تم کو

ثناء حیدر: کی ڈائری سے ایک خوبصورت نظم

سوچ نگر کے باسیو
مت مرا دل پریشان کرو
وہ لوٹ نہیں آئے گا
مت دل میں چراغ جلایا کرو
وہ آیا بھی تو
دہلیز سے لوٹ جائے گا
جب بھی مرے نگر آئے گا
مرا دل بھی اب تو ہے
قید و بند پنجرے میں
وقت کی فصیل کا
لگا ہے تالا سا
وہ لوٹ نہیں آئے گا
مت چراغ امید جلایا کرو

دُر ثمن: کی ڈائری سے ایک نظم

اسے اپنے قرار کی فکر تھی
وہ جو میرا واقف حال تھا
وہ جو اس کی صبح عروج تھی
وہ ہی میرا وقت زوال تھا
میری بات کیسے وہ مانتا
میرا حال کیسے وہ جانتا
وہ تو خود منزل کے سفر میں تھا
اسے روکنا بھی محال تھا
کہاں جاؤ گے مجھے چھوڑ کر
میں پوچھ پوچھ کر تھک گئی
وہ جواب مجھے نہ دے سکا
وہ تو خود سراپا سوال تھا
کیا اس کا ہیبت حسن تھا
کیا اس کا رنگ جمال تھا
وہ ستارہ کہاں کھو گیا
جو اپنی مثال آپ تھا
وہ ملا تو صدیوں بعد بھی
میرے لب پہ کوئی گلہ نہ تھا
میری چپ نے اسے رلا دیا

جسے گفتگو میں کمال تھا

جویریہ ناصر: کی ڈائری سے ایک غزل

عکس خوشبو ہوں بکھرنے سے روکے کوئی
اور بکھر جاؤں تو مجھ کو نہ سمیٹے کوئی
کانپ اٹھی ہوں میں یہ سوچ کر تنہائی میں
میرے چہرے پہ تیرا نام نہ پڑھ لے کوئی
جس طرح خواب میرے ہو گئے ریزہ ریزہ
اس طرح سے نہ کبھی ٹوٹ کے بکھرے کوئی
میں تو اس دن سے ہراساں ہوں کہ جب حکم ملے
خشک پھولوں کو کتابوں میں نہ رکھے کوئی
اب تو اس راہ سے وہ شخص گزرتا بھی نہیں
اب کس امید پہ دروازے سے جھانکے کوئی
کوئی آہٹ کوئی آواز کوئی چاپ نہیں
دل کی گلیاں بڑی سنسان ہیں آئے کوئی

اُم ایمن: کی ڈائری سے ایک نظم

کبھی ایسا ہو
تجھ سے ملن کی
کوئی صورت نہ ہو
مایوسی آ کر آخری حد ہو
جب دعائیں بے اثر لگیں
آنکھیں ویران ہوں
وجود ریگزار ہوا ایسے
میں اچانک مجھے تیری طرف سے
I miss you
کا کارڈ ملے اور سارا وجود
تیرے جذبوں کی خوشبو سے
مہک اٹھے

عابدہ سعید: کی ڈائری سے ایک خوبصورت نظم

جو میری آنکھوں سے خواب دیکھو
تو ایک بھی شب نہ سو سکو گے
کہ لاکھ چاہو نہ ہنس سکو گے
ہزار چاہو تو رو سکو گے
کہ خواب کیا ہیں عذاب ہیں یہ
مری دکھوں کی کتاب میں یہ
رفاقتیں ان میں چھوٹتی ہیں
محبتیں ان میں روٹھتی ہیں
پنپتی ہیں ان میں وحشتیں سی
اذیتیں ان میں پھوٹتی ہیں
انہی کے ڈر سے خزاں میں جذبے
انہی سے شاخیں سی ٹوٹتی ہیں
غموں کی بندش میں ہیں خواب میرے
دکھوں کی بارش ہیں خواب میرے
ابل رہا ہے دکھوں کا لاوا
رہن آتش ہیں خواب میرے
خیال سارے جھلس گئے ہیں
سلگتی خواہش ہیں خواب میرے
اکھڑتی سانسیں ہیں زندگی کی
لہو کی سازش ہیں خواب میرے
جو میری آنکھوں سے خواب دیکھو
تو ایک بھی شب نہ سو سکو گے

فرح عامر: کی ڈائری سے ایک نظم

"اک سپنا"

خیالوں کی بستیوں میں دور نکل جائیں
خوابوں کے تتلیوں سے من کو بہلائیں
آنکھوں میں سپنے لے کر تم بھی جب
میرے راستے سے گزرو تو میرے
ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر پگڈنڈی پر
مل کر چلیں اور اس زمانے سے
دور، بہت دور اک ایسے
دیس میں نکل جائیں جہاں
یہ زمانہ یہ سماج یہ دستور
میرے اور تیرے قریب نہ آئیں
جہاں جنگلی پھولوں کا کنج ہو

☆☆☆

رنگ حنا

بلقیس بھٹی

نکتہ چیں

ایک شخص کو بیوی کے کاموں میں نکتہ چینیاں کرنے کی عادت تھی، ایک روز وہ دفتر سے لوٹا تو اس کی بیوی نے انڈہ ابال کر دیا جس پر اس نے کہا۔

"آج تو میں نے آملیٹ کھانا تھا؟"

دوسرے روز بیوی نے آملیٹ بنا دیا تو وہ بولا۔

"میں نے تو ابلا ہوا انڈہ کھانا تھا۔"

تیسرے روز بیوی نے سمجھداری سے کام لیتے ہوئے ایک ساتھ آملیٹ اور ابلا ہوا انڈہ پیش کیا جس پر شوہر ناراض ہونے لگا۔

"کر دیا ناں ستیاناس جس انڈے کا آملیٹ بنانا تھا اسے ابال دیا اور جسے ابالنا تھا اس کا آملیٹ بنا دیا۔"

جویریہ ناصر، گلبرگ لاہور

فکر

لیکچر روم میں پروفیسر صاحب لیکچر دے رہے تھے کہ ایک بات پر بحث شروع ہو گئی کہ انسان کے مرنے کے بعد روحیں نہیں مرتیں، بلکہ زندہ رہتی ہیں۔

کچھ شاگردوں کا نظریہ تھا کہ روحیں مرنے کے بعد کسی دوسرے جسم میں داخل ہو جاتی ہیں، اسی دوران ایک لڑکے نے اٹھ کر سوال کیا کہ۔

"اگر میرے مرنے کے بعد میری روح کسی گدھے کے جسم میں چلی گئی تو پھر کیا ہوگا؟"

پروفیسر صاحب اطمینان سے بولے۔

"تم فکر مت کرو روحیں کبھی اپنے پرانے جسم میں واپس نہیں جاتیں۔"

ام ایمن، گوجرانوالہ

شجرہ نسب

ابن انشاء اپنے شجرہ نسب پر روشنی ڈالتے ڈالتے ایک پتے کی بات کر جاتے ہیں کہ آدمی کے لئے کیا ایک ہی حوالہ کافی نہیں کہ وہ ابن آدم ہے وہ لکھتے ہیں۔

"پروفیسر محمد ایوب قادری ایک محقق آدمی ہیں، شجرہ نسب مانگ رہے تھے ہمارے ہاں کہاں سے آتا۔"

ہم نے کہا کہ "بزرگوں میں ہمیں اپنے والد کا نام دیا ہے ایک اور مورث اعلیٰ کا کہ اپنے زمانے کے مشہور پیغمبر تھے، بولے کون؟"

ہم نے حضرت آدم کا نام بتایا تو عقیدت سے ادھ موئے ہو گئے۔ (ابن انشاء کی تصنیف "خمار گندم" سے)

عابدہ سعید، گجرات

گھاٹا

کرتے کرتے وہ یہ بات بھی کر گیا
مری محبت میں اسے گھاٹا پڑ گیا
پچھلے سال تھا جیب میں لاکھ روپیہ
سال کے بعد جیب میں سناٹا پڑ گیا
پچھلے سال چلتا تھا سپر اسٹور
اب کے سال ٹھیلہ فٹ پاتھ پر پڑ گیا
کل تک کھاتا تھا میں برگر فائیو اسٹار کے
آج مجھ کھانا لنگر سے پڑ گیا

مری کوٹ پتلون سب گئی ہیں بک
فقط مرے پاس کرتا رہ پجامہ گیا
گھر کر دیا جب سے میں نے تیرے نام
سونا مجھے جب سے سڑک پر پڑ گیا

فرح عامر، جہلم

ماہر امراض نسواں

ڈاکٹر صاحب ایک مریض کو دیکھتے ہی بولے۔

"آپ کو تو عینک کی بہت عرصے سے ضرورت ہے لیکن آپ آج نظر چیک کرانے آئی ہیں۔"

مریض نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے، آپ کو یہ بات میرا معائنہ کرنے سے پہلے ہی معلوم ہو گئی، آپ تو یقیناً تجربہ کار ڈاکٹر ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

"تجربے کی تو اس میں کوئی بات نہیں ورنہ آپ بورڈ پڑھ لیتے، میں ماہر امراض نسواں ہوں۔"

فائزہ قاسم، سکھر

مناسب موقع

اسٹیج ڈرامے کے دوران ایک کارندہ ہانپتا ہوا دوڑا دوڑا پروڈیوسر کے پاس پہنچا، پروڈیوسر اس وقت ڈریسنگ روم میں ہیروئن کے ساتھ کولڈ ڈرنک پی رہا تھا۔

"کیا بات ہے اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟"

"سر وہ ہیرو نے ولن کو گولی مار دی ہے لیکن ولن نے چپکے سے ہاتھ بڑھا کر مجھے یہ چٹ تھما دی ہے۔"

کارندے نے ایک چٹ پروڈیوسر کو دے دی، اس پر لکھا تھا۔

"میرے بقایا جات پچھلے پردے کے پیچھے سے دے جاؤ ورنہ میں گولی کھانے کے باوجود نہیں مروں گا۔"

نعیم امین، کراچی

نشے باز

ایک شرابی نشے کی حالت میں ایک عورت سے ٹکرا گیا، عورت غصے کی ذرا تیز تھی، گالیوں کے ساتھ ساتھ اس نے شرابی کے دو ہاتھ بھی جڑ دیئے، شرابی کو بھی جواباً غصہ آ گیا اور وہ جل کر گویا ہوا۔

"میں نے پوری زندگی میں تمہارے جیسی بدصورت عورت نہیں دیکھی۔" عورت شرابی کے اس جملے پر بولی۔

"میں نے بھی اپنی پوری زندگی میں تمہارے جیسا گھٹیا نشے باز نہیں دیکھا۔"

"میرا نشہ۔" شرابی ذومعنی انداز میں مسکرایا۔

"میرا نشہ تو صبح تک اتر جائے گا۔"

ہما رائے، کراچی

حقیقت

ایک ماہر نفسیات بہت زور و شور سے اپنی خوبیاں بیان کر رہے تھے۔

"میں کسی بھی شخص پر صرف ایک نظر ڈال کر یہ بتا سکتا ہوں کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہا ہے۔"

"لیکن یہ جان لینے کے بعد تو آپ کو کوئی شرمندگی ہوتی ہوگی۔"

ایک آدمی انہیں ٹوکتے ہوئے بولا۔

عاصمہ سرور، وہاڑی

☆☆☆

حنا کا دسترخوان

افراح طارق

چکن جیلفریزی

اشیاء

چکن (بغیر ہڈی)	آدھا کلو
گرم مصالحہ	چوتھائی کھانے کا چچ
ادرک پسا ہوا	آدھا کھانے کا چچ
لہسن پسا ہوا	آدھا کھانے کا چچ
کالی مرچ پسی ہوئی	آدھا کھانے کا چچ
سویا ساس	دو کھانے کے چچ
پیاز کٹی ہوئی	تین عدد
ٹماٹر کٹے ہوئے	تین عدد
ہری مرچ	تین عدد
شملہ مرچ ٹکڑوں میں کٹی ہوئی	ایک عدد
شنگریلا سفید سرکہ	دو کھانے کے چچ
چلی سوس	ایک چائے کا چچ

ترکیب

تیل گرم کرلیں اور مرغی کو اس میں فرائی کر لیں، براؤن ہو جانے پر مرغی کو نکال کر زائد تیل کاغذ میں جذب کرلیں، پھر کسی برتن میں ڈال کر ہلکی آنچ پر چولہے پر رکھ دیں پھر اس میں ادرک، لہسن، پیاز، ٹماٹر، شملہ مرچ ڈال کر تھوڑی دیر پکائیں اس میں نمک، کالی مرچ اور ہلدی پاؤڈر بھی ملا دیں اس کے بعد ٹماٹر پیسٹ، سرکہ اور سویا سوس اور چلی سوس شامل کر کے دس منٹ تک مزید پکائیں، چولہا بند کرنے کے بعد اوپر سے پسا ہوا گرم مصالحہ چھڑک دیں۔

لیجئے مزیدار چکن جیلفریزی تیار ہے، کھانے کی لذت بڑھانے کے لئے چلی سوس کا استعمال ضرور کریں۔

چکن اور براؤن اسپیگیٹھی

اشیاء

چکن بغیر ہڈی کے	آدھا کلو
چکن یخنی	تین کپ
پیاز	دو عدد کٹی ہوئی
ٹماٹر پیسٹ	ایک کپ
پنیر	Grated
سفید سرکہ	آدھا چچ
سویا سوس	ایک چچ
کالی مرچ پسی ہوئی	ایک کھانے کا چچ
ادرک پسی ہوئی	ایک چائے کا چچ
نوڈلز	ایک پاؤ کا پیکٹ
مکھن	پاؤ کپ
میدہ	آدھا پاؤ
گاجر کٹی ہوئی ابلی ہوئی	ایک عدد
مٹر ابلے ہوئے	آدھا کپ
شملہ مرچ کٹی ہوئی	دو عدد
نمک	حسب ذائقہ
چائنیز سالٹ	ایک چائے کا چچ

ترکیب

تیل کو گرم کرلیں اور حسب ذائقہ پسی ہوئی ادرک ڈال کر بھون لیں تاکہ وہ براؤن ہو جائے، اس میں مرغی ڈال کر براؤن ہونے تک فرائی کریں، آنچ ہلکی رکھیں تاکہ مرغی گل جائے۔

اس کے بعد ساری سبزیاں، کالی مرچ، چائنیز سالٹ، مکھن، یخنی اور ٹماٹر پیسٹ مرغی میں شامل کر دیں اور اس کو مسلسل چمچے سے ہلاتی رہیں اور اس وقت تک پکائیں جب تک پانی خشک نہ ہو جائے۔

نوڈلز کو علیحدہ سے پانی میں ابال لیں اور ٹھنڈا ہونے پر مرغی اور سبزیوں کے ساتھ مکس کر لیں اور تھوڑی دیر میں کسی برتن میں نکال لیں۔

برتن میں نکالنے کے بعد اس کے اوپر Grated پنیر ڈالیں اور پانچ سے سات منٹ کے لئے اوون میں رکھ دیں۔

لیجئے مزیدار چکن اسپیگیٹھی تیار ہے مزید ذائقہ حاصل کرنے کے لئے سویا ساس کے ساتھ پیش کریں۔

چکن/شاشلک

اشیاء

چکن	آدھا کلو
نمک، مرچ	حسب ذائقہ
کالی مرچ، لال مرچیں	حسب ذائقہ
سفید سرکہ	ایک کھانے کا چچ
سویا ساس	ایک کھانے کا چچ
تیل	دو کھانے کے چچ
ٹماٹر	آدھا کلو
پیاز	آدھا کلو
شملہ مرچ	آدھا کلو
چائنیز سالٹ	ایک کھانے کا چچ
ادرک پیسا ہوا	ایک کھانے کا چچ
لہسن پسا ہوا	ایک کھانے کا چچ

ترکیب

چکن کو ایک کھانے کا چچ لہسن اور ادرک کا پیسٹ ڈال کر ابال لیں، پیاز، شملہ مرچ اور ٹماٹر کو ایک سائز کے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ لیں، تیل گرم کر کے مرغی کا ہلکا فرائی کریں پھر اس میں نمک، کالی مرچ، چائنیز سالٹ، لال مرچیں، شنگریلا سرکہ اور شنگریلا سویا ساس ڈال دیں اور ہلکا براؤن کرلیں پھر اس میں کٹی ہوئی سبزیاں بھی شامل کرلیں اور تھوڑی دیر تک پکائیں

لیجئے مزیدار چکن شاشلک تیار ہے، گرما گرم پیش کریں۔

چکن فرائیڈ رائس

اشیاء

چاول	آدھا کلو
مرغی بغیر ہڈی کے ابلی ہوئی	سو گرام
انڈے	دو عدد
سویا ساس	پانچ کھانے کے چچ
سفید سرکہ	دو کھانے کے چچ
گاجر کٹی ہوئی	دو عدد چھوٹی
چائنیز سالٹ	آدھا چائے کا چچ
نمک	حسب ذائقہ
کالی مرچ پسی ہوئی	آدھا چائے کا چچ
ہری پیاز	دو عدد کٹی ہوئی
بند گوبھی	آدھی کٹی ہوئی

ترکیب

چاول ابال کر الگ کرلیں خیال رہے کہ چاول آدھے کچے اور آدھے ابلے ہوئے ہوں، تیل گرم کریں اور انڈے تل کر اس کے چھوٹے ٹکڑے کرلیں، چکن کے ٹکڑے، ہری پیاز، بند گوبھی، گاجر، کالی مرچ، نمک، چائنیز سالٹ، سویا سوس، سرکہ یخنی میں ملائیں اور پانچ سے سات منٹ تک پکائیں، چاول شامل کر کے دم آنے تک چھوڑ دیں، چکن فرائیڈ رائس تیار ہیں، سلاد اور چلی سوس کے ساتھ نوش فرمائیں ذائقے کو بڑھائے گا

چکن کارن سوپ

اشیاء

مرغی ابلی ہوئی	ایک پاؤ

یخنی	تقریباً بیس کپ
کارن فلور	ایک کپ
نمک	حسب ذائقہ
سویٹ کارن	ایک کپ
انڈے	دو عدد

ترکیب

سویٹ کارن کو اچھی طرح گرائینڈ کرلیں، یخنی کو چولہے پر درمیانی آنچ پر رکھیں پھر اس میں سویٹ کارن ڈال دیں اور چکن کے ریشے بھی ڈال دیں، ریشے تقریباً چار سے پانچ منٹ تک پکائیں، اس کے بعد اس میں کارن فلاور (پانی میں گھول کر) ڈال دیں اور چمچہ چلاتے ہوئے گاڑھا ہونے دیں، اس کے بعد انڈے پھینٹ کر ڈال دیں، انڈے ڈالتے وقت کانٹا استعمال کریں تاکہ اس کی ایک تار سی بنتی جائے، پانچ منٹ پکانے کے بعد چولہے پر سے اتار لیں۔

مزیدار چکن کارن سوپ تیار ہے، سویا سوس، چلی سوس اور سرکہ کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

نوٹ: ہری مرچوں کو باریک باریک کاٹ کر سفید سرکے میں ملالیں اور پھر دیکھیں کہ آپ ذائقے کی انتہا کو پہنچ جائیں گے۔

چکن چائنیز رول

اشیاء

میدہ	دو کپ
انڈے	دو عدد
مرغی بغیر ہڈی	ایک پاؤ چھوٹے
سفید سرکہ	آدھی پیالی
سویا ساس	آدھی پیالی
نمک	حسب ذائقہ
دودھ	ایک کپ
گاجر ابلی ہوئی	دو عدد
ہری پیاز ابلی ہوئی	دو عدد
مٹر	آدھی پیالی
شملہ مرچ ابلی ہوئی	ایک عدد
چائنیز سالٹ	دو چائے کے چمچ

ترکیب

میدہ، دودھ اور انڈے ملا کر پیسٹ بنالیں اور چپاتی کی صورت میں ہلکا سا تل لیں۔

چٹخریلا سرکہ اور چٹخریلا سویا ساس میں مرغی، نمک، چائنیز سالٹ اور تمام سبزیاں ڈال لیں اور مکس کرلیں، چپاتی پر یہ تیار شدہ آمیزہ ڈالیں اور اس کو رول کرلیں، میدہ کا پیسٹ لگا کر رول کے کناروں کو بند کردیں اس کے بعد ہلکی آنچ پر ڈیپ فرائی اس وقت تک کریں جب تک رول گولڈن براؤن نہ ہو جائیں، چلی سوس کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

نوٹ: بازار سے بنے بنائے رول کے پرت بھی استعمال کرسکتے ہیں، سبزیاں باریک کٹی ہوئی استعمال کریں۔

ٹماٹر کی چٹنی سادہ

اشیاء

ٹماٹر	آدھا پاؤ
لہسن	دو جوئے
نمک	حسب ذائقہ
مرچ	حسب ذائقہ
سرخ مرچ	تین عدد

ترکیب

ٹماٹر دھو کر صاف کریں اور سل پر لہسن اور نمک مرچ، سبز مرچ باریک پیس لیں، اب ٹماٹر کے ٹکڑے کرکے اس میں ملادیں اور تھوڑا سا پیس لیں، بہت مزیدار چٹنی ہوگی اور دو منٹ میں دال وغیرہ کے ساتھ پیش کرنے کو تیار ہو جائے گی۔

☆☆☆

کس قیامت کے یہ نامے

فوزیہ شفیق

السلام علیکم!

فروری کے شمارے کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہیں، آپ سب کی محبت و سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ۔

دھند میں لپٹے ہوئے موسم میں جیسے سارے ہی منظر دھندلائے ہوئے ہیں، کچھ بھی واضح نہیں ہو رہا، جتنا بھی سوچیں جس طرف بھی دیکھیں کوئی تسلی، کوئی خوش آئند جواب نہیں ملتا، دنوں کے حساب سے بڑھتی مہنگائی، خوف، دہشت گردی کے سائے دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں، امن و امان تو جیسے خواب ہو کر رہ گیا ہے، جن کی جنگ کو اپنی جنگ کہہ کر ہم اپنے گھر تک لے آئے ہیں، اب وہی بے حسی سے ہماری تباہی کا تماشا دیکھ رہے ہیں، شدید مایوسی، خوف اور بے یقینی کے گرداب سے نکلنے کی کوئی صورت نہیں بن پا رہی، بلکہ ہر گزرتا دن اس میں اضافہ ہی کر رہا ہے۔

زندگی کا سب سے قیمتی لمحہ وہ ہوتا ہے جب انسان اپنی غلطیوں کا ادراک کرے اور ان کو سنوارنے کی کوشش کرے، تبدیلی کے عمل کا آغاز یہی سے ہوتا ہے، کہ زندگی خوابوں اور خواہشوں سے نہیں عمل سے بدلتی ہے، وہ انفرادی ہو یا اجتماعی۔

زندگی میں اچھے برے وقت آتے رہتے ہیں، وقت کیسا بھی بہرحال گزر ہی جاتا ہے، جو زندگی، دیانت، سچائی اور انصاف کے اصولوں پر استوار کی جائے جلا پاتی ہے، اسی طرح قوموں کی بقا اور ترقی بھی دیانت داری، انصاف اور سچائی سے مشروط ہے، یہی سیدھا اور سچا راستہ ہے، اللہ تعالیٰ کے حضور دعا گو ہیں کہ وہ اپنے پیارے حبیب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدقے ہمارے ملک کو دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھے آمین۔

آپ کے خطوط کی محفل میں پہنچنے سے پہلے ایک بار پھر خود کو یہ باور کروالیں کہ ہم نے درود پاک، کلمہ طیبہ اور استغفار کے ورد کو اپنی زندگی کا معمول بنانا ہے، اپنا خیال رکھیئے گا اور ان کا بھی جو آپ کا خیال رکھتے ہیں۔

لیجئے یہ جو پہلا خط ہمارے سامنے آیا ہے وہ ہے نزہت زیدی کا جو سیالکوٹ سے ملا ہے، نزہت اپنی رائے کا اظہار کچھ یوں کر رہی ہیں۔

میں پہلی مرتبہ حنا کی اس محفل میں شرکت کر رہی ہوں اس امید پر کہ جگہ ملے گی۔

اس مرتبہ حنا کافی لیٹ ملا، ٹائٹل پسند نہیں آیا، سالگرہ کے حوالے سے، حمد و نعت سے فیضاب ہونے کے بعد پیارے نبیؐ کی پیاری باتوں کو پڑھا، معلومات میں اضافہ ہوا، جزاک اللہ، سب سے پہلے مکمل ناول پڑھا، فرحت عمران کی تحریر نئے سال کے حوالے سے پسند آئی، ہر کردار کے ساتھ انصاف کیا گیا، عموماً فرحت عمران تحریر لکھتی ہیں اور اچھا لکھتی ہیں، ناولٹ میں روبینہ سعید کا "شام سے پہلے" اگرچہ موضوع پرانا تھا لیکن مصنفہ کے لکھنے کا انداز اسے منفرد بنا گیا، جبکہ "کاسہ دل" سندس جبیں نے اسٹارٹ

جتنا اچھا اور فاسٹ لیا تھا اب اتنا ہی یکسانیت کا شکار ہو گیا ہے، پانچویں یا چھٹی قسط میں مصنفہ نے بتایا تھا کہ شاہ بخت کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اس کا چہرہ اچھا خاصا خراب ہو گیا، لیکن آگے چل کر بھی کہیں اس بات کا ذکر نہیں پلیز سندس جبیں کہانی میں تھوڑی تیزی لائیں، افسانوں میں سب سے بہترین تحریر عابی ناز کی لگی، کتنی دیر تو ہم یہ ہی سوچتے رہے کہ کیا یہ وہی عابی ناز ہیں جو اپنی تحریر کے ذریعے سطر سطر میں قہقہے بکھیرتی تھی، ویلڈن عابی بہت اچھا لکھا آپ نے، جبکہ نسرین خالد اور مبشرہ ناز کی تحریر بھی پسند آئی، ثمینہ بٹ متوقع بلدیاتی الیکشن کے حوالے سے آپ کی تحریر بہت خوب رہی، قرۃ العین آپ نے بھی حقیقت کے قریب ترین لکھا، اب بات ہو جائے سلسلے وار ناولوں کی وہ بھی تین عدد، واہ۔

"وہ ستارہ صبح امید کا" کی یہ قسط ناول کے اختتام کا اعلان کرتی نظر آئی، فوزیہ جی آپ کا یہ ناول بے حد اچھا تھا، ماریہ جوزف سے عائشہ تک کا سفر بے حد معلوماتی تھا، دوسرے مذاہب کے بارے میں ہمیں معلومات ملیں، بس افسوس ہے تو اریبہ کا، جس کو کچھ بھی نہ ملا، وہاج حسن کے ایک غلط رویئے نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا، آخری قسط کا شدت سے انتظار رہے گا، ام مریم کا "تم آخری جزیرہ ہو" میں پرنیاں کی ہٹ دھرمی اور جہان کی بے نیازی ایک آنکھ نہ بھائی، زینب کے ساتھ ام مریم نے ٹھیک کیا، خود پرستی کی سزا ایسی ہونی چاہیے تھی، سدرۃ المنتہیٰ ایک بڑا نام "اک جہاں اور ہے" کے ساتھ حنا کے صفحات پر جگمگایا، ابھی تک کہانی کچھ سمجھ نہیں آئی، یقیناً آگے چل کر سدرہ جی کسی انوکھے جہاں سے متعارف کروانے والی ہیں قارئین کو۔

مستقل سلسلے میں کتاب نگر تو میرا فیورٹ سلسلہ ہے، یسی صاحبہ کا مطالعہ خاصا وسیع ہے، شکریہ یسی جی، بقیہ تمام سلسلے بھی پسند آئے، جبکہ ایک دن حنا کے نام میں تحسین اختر کے شب و روز دلچسپ لگے، فوزیہ غزل جی پلیز اس سلسلے میں نسرین خالد، درنجف اور فرحت عمران سے بھی ملوائیں شکریہ۔

نزہت زیدی خوش آمدید اس محفل میں، جنوری کے شمارے کو پسند کرنے کا شکریہ، ٹائٹل کے سلسلے میں آپ کی شکایت اس ماہ دور کر دی جائے گی بتایئے گا کہ فروری کا ٹائٹل آپ کو پسند آیا، آپ کی فرمائش نوٹ کر لی ہے انشاء اللہ جلد پوری کریں گے، اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیے گا شکریہ۔

ثناء وحید: ساہیوال سے لکھتی ہیں۔

اس ماہ کا سرورق پسند آیا، اسلامیات سے دل و ذہن کو منور کرنے کے بعد انشاء جی کے لئے پروین شاکر کے تاثرات کو پڑھا، بہت خوب کرن اجالا نے بھی انشاء جی کے لئے اپنے احساسات کا اچھے انداز میں اظہار کیا، اس کے بعد تحسین اختر سے ملے اور ان کی ثابت قدمی اور ہمت کو داد دی، اس کے بعد اپنے پسندیدہ سلسلے وار ناول کی طرف بڑھے۔

"تم آخری جزیرہ ہو" اچھا جا رہا ہے، جبکہ فوزیہ غزل نے بڑی خوبصورتی سے کہانی کو سمیٹنا شروع کیا ہے کبھی بھی کوئی تشنگی نہیں چھوڑی ان کے لکھنے کا انداز اتنا خوبصورت ہے کہ ناول حقیقت کے قریب لگتا ہے، سچ پوچھیں تو میں بہت کم سلسلے وار ناول پڑھتی ہوں، اکثر بوریت ہونے لگتی ہے مگر یہ دونوں ناول اتنی خوبصورتی سے آگے بڑھ رہے ہیں کہ سارا مہینہ انتظار رہتا ہے، ام مریم اور فوزیہ غزل دونوں ہی اچھا

لکھ رہی ہیں۔

فرحت عمران کا مکمل ناول، "سال نو" بے حد پسند آیا جبکہ ناولٹ میں "کاسہ دل" تو ہے ہی پسندیدہ اس مرتبہ روبینہ سعید کی تحریر بھی دلچسپ لگی ان کے انداز بیان نے کہانی کو دلچسپ بنا دیا، افسانوں میں شاعری اور میں پڑھ کر آہ بھر کر رہ گئے، ثمینہ بٹ کی تحریر نے کافی مزہ دیا، ثمینہ آپ نے بڑی خوبصورتی سے بتایا کہ سیاسی قائدین سب اندر سے بیچ در بیچ ایک دوسرے سے وابستہ ہوتے ہیں جس چائے کی پیالی پر یہ ایک دوسرے کی ذات پر تنقید کرتے ہیں اسی پر رشتے ناطے بھی جوڑتے ہیں، قرۃ العین سچ کہا آپ نے ذائقہ کھانے میں نہیں خلوص میں چھپا ہوتا ہے۔

مستقل سلسلے کے بارے میں کہا کہوں ہر سلسلہ ایک سے بڑھ کر ایک ہوتا ہے، دستر خوان موقع کی مناسبت سے سجا ہوتا ہے، جبکہ ساتھ ہی یسی کرن جی بھی اسٹیکس کے طور پر کسی بہترین کتاب پر بڑے منفرد انداز میں اظہار خیال کر رہی ہوتی ہیں۔

آپی پلیز جلدی سے ہمیں قرۃ العین رائے، عابی ناز، فرحت عمران سے بھی ملوائیں ہم شدت سے منتظر ہیں اور یہ بتائیں کہ کیا اس سلسلے میں عام قاری بھی اک دن حنا کے ساتھ گزار سکتا ہے یا نہیں۔

ثناء وحید کیسی ہیں؟ بہت خوشی ہوئی آپ کو اس محفل میں دیکھ کر، فون پر تو اکثر ہی آپ سے ملاقات ہو جاتی ہے، سالگرہ نمبر کو پسند کرنے کا شکریہ، آپ کی پسندیدگی مصنفین کو پہنچائی جا رہی ہیں، ایک دن حنا کے نام میں ابھی تک تو نہیں سوچا کہ قارئین کو شامل کیا جائے، لیکن آپ کی تجویز دلچسپ ہے ضرور سوچیں گے، آئندہ بھی آپ کی رائے کے منتظر رہیں گے شکریہ۔

ثمینہ بٹ: لاہور سے لکھتی ہیں۔

پچھلے ماہ عمارہ حامد کے والد بزرگوار اور حنا کے رکن خالد محمود صاحب کی والدہ محترمہ رحلت فرما گئے، "انا للہ وانا الیہ راجعون" والدین جیسی نعمت کا کوئی بدل تو ہو نہیں سکتا، یہ ایسی نعمت ہے جس کا متبادل بھی کوئی نہیں اور اس کا مداوا بھی کوئی نہیں، اللہ سے دعا ہے کہ مرحومین کو جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے گھر والوں کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔

گیارہ جنوری کو چاند نگر کے جوگی، میرے موسٹ فیورٹ انشاء جی کی برسی تھی۔

انشاء جی اٹھو اب کوچ کرو
اس شہر میں جی کا لگانا کیا

واقعی یہ شہر اب اسی قابل کہاں رہے کہ انشاء جیسے درد مند دل رکھنے والے ان شہروں کو اس حال میں دیکھیں اور ان سے جی لگا سکیں۔

سردار سر! آپ نے بالکل ٹھیک کہا، گزشتہ سال جیسا بھی تھا اب تو ماضی کا حصہ بن گیا، اب نئے سال سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں، اللہ رب العزت ہماری ہر امید ہر دعا قبول فرمائیں اور ہمارے وطن پاک میں امن ہو جائے۔

"حمد" میں اس بار میر تقی میر کا نذرانہ عقیدت اور نعت رسول مقبول ﷺ میں منیر عالم کا نذرانہ عقیدت، سبحان اللہ، روح تک سرشار ہو گئی، پیارے نبی کی پیاری باتیں ہمیشہ کی طرح بہت پیاری سبق آموز اور دلگداز، جزاک اللہ۔

بیاد انشاء میں میری پسندیدہ ترین شاعرہ پروین شاکر کا مضمون شامل تھا، بہت خوبصورت تحریر، انشاء جی کے ساتھ ساتھ پروین شاکر کی یاد نے بھی دل میں کسک سی جگا دی، واقعی اچھے لوگوں کی اس دنیا میں شدید کمی ہوتی جا رہی ہے،

"کرن اجالا" کی "خواب میں کم کم آتے ہو" بہت خوبصورت، بے مثال خراج، انشاء جی کے لئے۔ جزاک اللہ اور پھر خود انشاء نامہ میں "جنوری کی سرد راتیں" خوبصورت اور دل پذیر انداز بیان۔

"ایک دن حنا کے نام" میں اس بار تحسین اختر سے ملاقات رہی جو بہت شاندار تھی۔

"کاسہ دل" سندس نے یہ قسط بہت دل سے لکھی، بہت اچھی رہی یہ قسط بھی، مگر اس بار پھر سپنس تھا، کہانی بہت خوبصورتی سے آگے بڑھ رہی ہے، سندس جی اس کے لئے آپ کو ڈھیروں مبارک باد، روبینہ سعید کا "شام سے پہلے" ایک بہت اچھی تحریر تھی۔

اب میں بات کروں گی فرحت عمران کے "سال نو" کی فرحت نے اپنی تحریر میں محبت کے بہت سے رنگ پیش کیے، تحریم کی ارہم کے لئے جنونی محبت، ارہم کی فاطمہ کے لئے شدید محبت، عدن کی تحریم کے لئے خاموش محبت، فاطمہ کی ارہم کے لئے وسوسوں اور اندیشوں سے بھری محبت، شاذب کی ناعمہ کے لئے ہوس بھری محبت اور ناعمہ کی دولت سے لالچ اور غرض سے بھری محبت، محبت کے اتنے ڈھیر سارے رنگ اور ہر رنگ اپنی جگہ انمول، انمسٹ، واقعی وہ دل بھی بہت انمول ہوتے ہیں جن میں محبت ہوتی ہے، بہت خوب فرحت، سال نو پر آپ کا "سال نو" اچھا لگا، نسرین خالد کی "بات تو سچ ہے" جی نسرین جی بات تو واقعی سچ ہی ہے، بہت اچھا لکھا آپ نے، مزہ آیا پڑھ کر۔

غالبی ناز کی "کس جرم کی سزا پائی" ایک بہت حساس تحریر، واقعی اس معاشرے میں مرد کو سات خون معاف ہو جاتے ہیں مگر عورت کی ایک ہلکی سی لغزش اسے بدنامیوں اور سلسلے وار ناولز تینوں ہی بہت اچھے جا رہے ہیں، "سدرۃ المنتہیٰ" کا نام ہی اچھی تحریر کی ضمانت ہے اور امید ہے کہ ان کا یہ نیا ناول "اک جہاں اور ہے" بھی ہمیں کوئی خوبصورت جہانوں کی سیر کروائے گا۔

اور جناب سب سے آخر میں، میں بات کروں گی "قیامت کے یہ نامے" ہی زبردست تھے، لیکن ثمینہ شیخ کی باتیں سیدھی دل میں اتر گئیں، واقعی ہم کیوں خضر کے منتظر رہتے ہیں، خضر تو ہمارے اپنے اندر ہی ہے، ہمیں خود ہی ہمت کرنا ہو گی، ثمینہ شیخ ہمارے دلوں کی آواز سب تک پہنچانے کے لئے شکریہ اور فوزیہ جی دسمبر کے شمارے میں آپ نے جس طرح حنا کی مصنفین کے لئے اپنی بے لوث محبت اور اپنے پن کا اظہار کیا، اس نے ہمارا سیروں خون بڑھا دیا۔

باقی حنا کے تمام سلسلے حسب روایت بے حد شاندار اور زبردست تھے اور ان زبردست سلسلوں کا ایک بے مثال سلسلہ "کتاب نگر" ہے جی اس بار ناصر کی کتاب لے کر آئیں "پانی میں گم" نصیر احمد ناصر کا شعری مجموعہ تعارف اتنا زبردست ہے کہ بے اختیار پڑھنے کو دل مچل گیا۔

ثمینہ بٹ بہت بہت شکریہ آپ کی آمد کا، آپ کی محبت کا، آپ کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح شاندار اور جامع تھا، آپ کی پسندیدگی مصنفین کو ان سطور کے ذریعے مل گی شکریہ، قبول کریں ان سب کی طرف سے اپنا خیال اور ہمیں دعاؤں میں یاد رکھیئے گا، اپنی رائے سے ہمیں مستفید کرتی رہیے گا شکریہ۔

☆☆☆